شمع فروزاں

نقش راہ

شمع فروزاں

دعوت و تعلیم

شمع فروزاں

گردوپیش

شمع فروزاں

(حصہ دوم)

اُردو کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد اور ملک کے دوسرے معروف اُردو اخبارات میں شائع ہونے والے مقبول عام وخاص کالم کے دو سال (6-2005) کے مضامین کا مجموعہ، جس میں ملکی و بین ملکی پس منظر میں نئے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے، دلآویز اُسلوب، عام فہم زبان اور دلچسپ طرزِ بیان۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بہ اہتمام :

ings\Administrator\Desktop\Mahac
not found.

ناشر: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارن پور (یوپی)

طبع اول

۱۴۲۹ھ — ۲۰۰۸ء

نام کتاب	شمع فروزاں (حصہ دوم)
تالیف	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
ترتیب	مولانا محمد ادریس ندوی
صفحات	۳۰۰
کمپیوٹر کتابت	محمد نصیر عالم سبیلی ("**العالم**" اُردو کمپیوٹر سنٹر)

بیت العلم 36-2 بارکس، کوتہ پیٹ حیدرآباد، فون: 0-9959897621

بہ اہتمام

ings\Administrator\Desktop\Mahac
not found.

ناشر
کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد
- دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، نزد پانی کی ٹانکی، حیدرآباد
- ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

نقش راہ

دعوت وتعلیم

گردوپیش

❑ ❑ ❑ ❑

ہماری دوعملی

رمضان المبارک گزر چکا ہے، روزہ کی حلاوتیں بھی رخصت ہوئیں، تلاوتِ قرآن کی زمزمہ سنجیوں سے بھی کان محروم ہوئے، جن اہل ایمان کی پیشانیاں سجدے میں تڑپتی تھیں وہ آہستہ آہستہ غفلت کا طوق اپنے سینوں پر کستے جارہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ایک بادِ نسیم تھی جو بربطِ روح کو چھیڑتے ہوئے گزر گئی، ایک بوئے شمیم تھی جس نے پورے ماحول کو عطر بار کر دیا تھا اور اب اس نے رختِ سفر باندھ لیا ہے، کتنے اچھے تھے وہ دن جو نمازیں اور نمازیوں کے اہتمام میں گزرتے تھے اور کتنی مبارک تھیں وہ راتیں جن میں گنہگار سے گنہگار پیشانیاں بھی خدا کی چوکھٹ پر جھک گئی تھیں، شیطان پابہ زنجیر ہو گئے تھے اور اس بڑے شیطان کی گرفتاری نے نفس کے شیطان کو بھی کمزور کر کے رکھ دیا تھا!!

لیکن اِدھر رمضان کے شب و روز گزرے اور اُدھر گنہگاری اور معصیت شعاری کے خوگر نفس نے پھر انگڑ ائیاں لینا شروع کر دیں، یا تو مسجدیں تنگ پڑ رہی تھیں، یا اب مسجدیں نمازیوں کو ترس رہی ہیں، یا تو انفاق کے لئے نہ اٹھنے والے ہاتھ بھی جنبش میں تھے اور اپنے غریب و فاقہ مست بھائیوں کے منھ میں لقمہ ڈالنے کو بے چین تھے، یا اب بخل کی ہتھکڑیوں نے ہاتھ اس طرح جکڑ لئے ہیں کہ چھوٹی کوڑی بھی جیب سے نکالنا شاق گزرتا ہے، آخر یہ تبدیلی کیوں ہے؟ کیا رمضان کے بعد خدائے رحمٰن و رحیم اپنے دروازہ کو بند کر لیتا ہے، کہ اب وہ کسی کی نہیں سنے گا؟ کیا ایمان والوں کا رشتہ اپنے پروردگار سے صرف تیس دنوں کا ہے اور اس کے بعد وہ اس رشتہ سے آزاد ہو جاتا ہے؟ کیا صرف ایک ہی ماہ میں خدا کے لطف و عنایت اور فضل و کرم کی حاجت ہے اور اب یہ غلام بے دام اپنے آقا کے لطف و عنایت کا محتاج نہیں رہا؟؟ یقیناً ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، انسان محتاجِ محض ہے، اور خدا داتائے مطلق، نہ انسان کبھی ضرورت سے بے نیاز، نہ خدا کا دروازہ کبھی حاجت مندوں پر بند۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین کے تصور کو بہت محدود کر دیا ہے، دین ایک گُلِ سدابہار ہے، جو موسم اور مقام کی قید سے آزاد ہے، جیسے سانس لینے کا کوئی وقت مقرر نہیں، اسی طرح دین کی ضرورت کسی خاص وقت کے ساتھ محدود نہیں، پھر دین کا تعلق انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں مختلف اجزاء رکھے ہیں، ہر جز کے لئے ایک متعین اور محدود جگہ ہے، کوئی جگہ ہاتھ کی ہے کوئی پاؤں کی، کہیں پنڈلیاں ہیں کہیں بازو ہیں، پیٹ اور پشت اپنے اپنے مقام پر ہے، لیکن جسم کا ایک جز وخون بھی ہے، یہ ہر وقت رَواں دواں رہتا ہے اور سر سے لے کر ہاتھوں اور پاؤں کی آخری انتہاؤں تک پہونچتا ہے، انگ انگ کی پیاس بجھاتا ہے اور پورے بدن کی بھوک مٹاتا ہے، اس کے لئے کوئی ایک جگہ متعین نہیں، اگر جسم کے کسی حصہ سے اس کا تعلق ختم ہو جائے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے اور یا تو سڑنے لگتا ہے یا جسم کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے، دین کا رشتہ انسانی زندگی سے ایسا ہی ہے، نہ سال کی قید ہے، نہ مہینہ کی، نہ ہفتہ کی اور نہ دن ورات کی، نہ خوشی ومسرت کی، نہ حزن وغم کی، دین کی ضرورت ہر موسم میں اور ہر مرحلہ میں ہے، انسان کو عقیدۂ عبادت میں خدا کی جتنی حاجت ہے اور وہ اس کی تعلیمات اور ہدایات کا محتاج ہے، وہ اپنے معاملات، کاروبار، ازدواجی زندگی، سماجی تعلقات اور قومی وبین قومی روابط میں بھی اسی درجہ دین کا ضرورت مند ہے، جیسے انسان کھاتے، پیتے، ہنستے بولتے، سوتے جاگتے سانس لینے پر مجبور ہے، اسی طرح ہر کام کے ساتھ دین کے رشتہ کا قائم رہنا مؤمن کے لئے ضروری ہے، ایمان کامل یہی ہے کہ دین انسان کے وجود میں سما جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور یہ بات ان لوگوں سے نہیں کہی گئی جو ایمان نہیں لائے تھے، بلکہ مؤمنوں کو خطاب کر کے کہا گیا ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً'' (البقرہ:۲۰۸) یہ آیت ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے، پھر مشرف بہ اسلام ہوئے، یہودی مذہب میں اونٹ کے گوشت کی ممانعت تھی، آدمی جس چیز کو نہیں کھاتا ہے طبعی طور پر اس سے

گھن سی محسوس ہونے لگتی ہے، چنانچہ انھوں نے حضور ﷺ سے اجازت چاہی کہ شریعتِ اسلامی میں جن باتوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، میں ان سے بھی بچوں اور اونٹ کا گوشت جسے یہود حرام کہتے تھے، اس سے بھی اجتناب کروں؟ اسی پس منظر میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی، کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق سے سرفراز فرمایا ہے، تو اب ضروری ہے کہ پوری طرح شریعتِ اسلامی کی اتباع کرو اور بے کم و کاست اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

یہ نہایت ہی بنیادی حکم ہے، جو اس بات کو بتاتا ہے کہ دین سے انسان کا تعلق جز وقتی اور محدود نہیں، بلکہ دنیا سے ہمہ وقتی اور ہمہ گیر تعلق ضروری ہے، عام طور پر لوگ عقیدہ و عبادت کو دین و مذہب کے شعبے سمجھتے ہیں اور زندگی کے باقی مسائل کو دین سے غیر متعلق تصور کرتے ہیں، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ ایمان اور عبادات کو اخلاق و معاملات سے مربوط قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے پاس امانت نہیں وہ ایمان سے بھی محروم ہے، ارشاد ہوا: جس کے شر سے پڑوسی حفظ و امان محسوس نہ کرتے ہوں، وہ صاحبِ ایمان نہیں، کبھی فرمایا گیا کہ: صحیح معنوں میں مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ: مؤمن جھوٹ نہیں بول سکتا، اس مضمون کی کتنی ہی روایتیں ہیں جن میں ایمان اور اخلاق کے باہمی ربط کو ظاہر کیا گیا ہے اور اس شخص کو روحِ ایمان سے خالی قرار دیا گیا ہے جو حسنِ اخلاق سے آراستہ نہ ہو۔

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو مالِ حرام کھاتا ہے اس کی نماز مقبول نہیں ہوتی، اللہ کی عبادت کے ساتھ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا اور شرک کی مذمت کے ساتھ والدین کی نافرمانی کی مذمت کی گئی، بہترین اسلام اس بات کو قرار دیا گیا کہ ایک دوسرے کو سلام کیا جائے اور باہم تواضع کی جائے، اس مضمون کی روایتیں بکثرت وارد ہوئی ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ عبادتوں کی قبولیت بھی خدمتِ خلق، سماجی تعلقات کی استواری، اصحابِ حقوق کے حقوق کی ادائیگی اور حرام سے حفاظت سے متعلق ہے، اس کے بغیر عبادتیں بے روح ہوتی ہیں اور ایسی عبادت خدا کی بندگی نہیں، بلکہ بندگی کی نقل و حکایت سے عبارت ہے۔

یہ دین و دنیا کی علاحدگی کی تصور وہ بات ہے جس نے مسلمانوں کو دینی اعتبار سے سخت نقصان پہنچایا ہے، یہ دراصل اس عیسائی فکر کی بازگشت ہے جس میں زندگی کے خانے تقسیم کردیے گئے تھے، زندگی کے ایک حصہ پر خدا کی حکمرانی تسلیم کی گئی اور ایک حصہ پر قیصر کو فرمانروا بنایا گیا اور اس تقسیم کی نوبت بھی اہل کلیسا کی شامتِ اعمال کی وجہ سے آئی، لیکن مغرب کی اس مذہب بیزاری، بلکہ زندگی سے مذہب کے دیس نکالا کا اثر پوری دنیا نے قبول کیا اور مسلمان' جن کے پاس خدا کا ہدایت نامہ پوری طرح محفوظ اور حقیقی شکل میں موجود تھا اور جو عقل وفطرت سے ہم آہنگی، توازن واعتدال اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے بے نظیر نوعیت کا حامل ہے' بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے۔

پھر کچھ تو وہ خدا ناترس اور حق ناشناس لوگ ہیں جنھوں نے صاف طور پر انسان کی عملی زندگی میں مذہب کی دخل اندازی کی مزاحمت کی اور اسے ترقی پسندی اور اصلاح پسندی وغیرہ کا نام دیا، لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی اور ان کا اثر بہت محدود ہے، اس لئے امت میں عمومی طور پر ایسی کفریہ باتوں کی پذیرائی نہیں ہوئی، بلکہ لوگوں نے اس کی مذمت ہی کی، لیکن ایک بہت بڑا حلقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو زبان سے تو اسلام کو ایک مکمل دین قرار دیتا ہے اور شریعت کے ایک ایک حرف کے حق ہونے پر یقین رکھتا ہے، لیکن اس کی عملی زندگی گہرے تضاد اور دورخاپن کی حامل ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اسوۂ محمدی کی اتباع سے اسی قدر بے پروا ہیں، توحید کے نہ صرف دعویدار بلکہ ٹھیکیدار ہیں؛ لیکن دل خوفِ خدا سے عاری اور ظلم وجور اور بددیانتی میں طاق، نمازوں کا اہتمام بھی ہے، شرعی وضع قطع بھی ہے، لیکن لوگ ان سے کوئی معاملہ کرنے میں وحشت محسوس کرتے ہیں، اور ان کی یہ دیندارانہ شکل وشبہات معاملات کی دنیا میں امن واطمینان کی شہادت ہونے کے بجائے شکوک وشباہت کا باعث ہے، حج کر چکے ہیں اور بار بار کررہے ہیں، مگر بہن کو حق میراث سے محروم کئے ہوئے ہیں اور یتیموں اور بیواؤں کی آہیں ان کے خلاف آسمان کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں۔

یہی حال موسم اور وقت کے اعتبار سے بھی ہے، رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو ان کا شیطان بندھ گیا اور وہ دن ورات خدا کے حضور سجدہ ریز ہیں، شبِ برأت آئی تو سورج ڈوبنے سے صبح نکلنے تک مسجد میں فروکش، لیکن خدا ترسی بھی گویا دریا کے تلاطم اور ہوا کے جھونکے کی طرح ہے، پہاڑ کی طرح موج اٹھی اور سطح سمندر میں ڈوب گئی، طوفان کی طرح جھونکے آئے، لیکن ایک مسافر تیز گام کی طرح لمحوں میں آگے بڑھ گئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے استقامت اور مداومت کو پسند فرمایا، گو عمل کم ہو، رسول اللہ ﷺ سے ایک صاحب نے مختصر نصیحت کی خواہش کی، آپ ﷺ نے صرف دو کلمات ارشاد فرمائے، لیکن یہ دو کلمات دریا بکوزہ کا مصداق ہیں، ارشاد ہوا ''آمن و استقم ''(ایمان لاؤ اور ثابت قدم رہو) یعنی ایمان کے تقاضے پر آپنے آپ کو مسلسل قائم رکھو، ایسا ایمان نہ ہو کہ کچھ دیر کے لئے تو عابد شب زندہ دار بنادے اور پھر میکدۂ عیش کا بادہ خوار، ایمان ایسا ہو کہ زندگی کے تمام شعبوں کو حاوی ہو اور ہر حالت میں ایمان کے تقاضے پر قائم رہنا سکھاتا ہو، ایسا نہ ہو کہ عبادت میں تو وارفتۂ پروردگار رہو اور اخلاق و معاملات میں نفس نا ہنجار کا پرستار۔

اس تضاد سے نہ صرف وہ شخص اپنی آخرت کو ضائع کرتا ہے، بلکہ اس سے اسلام کی غلط تصویر سامنے آتی ہے اور لوگوں کے سامنے ایک ایسے مذہب کا تصور پیش ہوتا ہے، جو انسان کو خدا کے گھر میں رہتے وقت خدا کا بندہ بنا کر رکھتا ہے، اور خانہ خدا سے باہر آنے کے بعد بندۂ نفس بنا دیتا ہے، ہمیں چاہئے کہ اس تضاد و دو عملی کو ختم کریں، زندگی کے تمام شعبوں میں اور ہر موسم اور ہر زمانہ میں اسلام کو اپنا رہنما بنائیں اور اس کے نورِ ہدایت کے سایہ میں اپنا سفر طے کریں۔

۲/شوال المکرّم ۱۴۲۴ھ ۲۸/نومبر ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

آدم خور انسان

کہا جاتا ہے کہ انسان کے خون اور گوشت میں بڑی لذت ہوتی ہے، جس درندہ کے منھ کو انسان کا خون لگ جاتا ہے وہ آدم خوری کا ایسا گرویدہ اور خوگر ہو جاتا ہے کہ کسی طرح اس سے باز آنے کو تیار نہیں ہوتا، اسی لئے آدم خور درندوں کو حصار بند علاقہ میں رکھا جاتا ہے، سنا ہے کہ افریقہ کے بعض تہذیب نا آشنا اور تمدن سے محروم علاقے میں آدم خور انسان بھی پائے جاتے ہیں، یہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنی خوراک بنا لیتے ہیں، جہالت و ناخواندگی، ثقافت و تمدن سے محرومی اور وحشت ان کے اس غیر انسانی مزاج کا اصل سبب ہے۔

اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ ہمارے اس شہر میں بھی بہت سے آدم خور انسان پائے جاتے ہیں، تو یہ کس قدر حیرت انگیز اطلاع ہوگی اور اگر آپ کو یہ اطلاع دی جائے کہ ہر محلّہ بلکہ ہر خاندان اور ہر گھر میں کچھ آدم خور لوگ موجود ہیں، تو یہ بات یقیناً تعجب بالائے تعجب کی ہوگی، لیکن کیا کہیے کہ یہ ایک حقیقت اور سچائی ہے، آج ہمارے سماج میں کم لوگ ہیں جو آدم خور نہیں ہیں، ایک آدم خور وہ ہے جسے اپنے مظلوم کو مقتل تک پہنچانا پڑتا ہے اور کچھ نہ کچھ مزاحمت برداشت کرنی ہوتی ہے، اور ایک قتل اور آدم خوری وہ ہے کہ ''خنجر پہ کوئی داغ نہ دامن پہ کوئی چھینٹ''، یہ معنوی طور پر انسان کا گوشت کھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

> اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو! بہت سی گمان کی باتوں سے بچو، کہ بعض گمان گناہ ہے، تجسس میں نہ پڑو اور نہ تم میں سے ایک شخص دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، جسے تم ناپسند کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔ (الحجرات:۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ایک مسلمان کی غیبت کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے، ظالم، جور و جفا کا خوگر اور قاتل شعار انسان بھی ہو تو وہ انسان کا گوشت کھانے کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتا، اور جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے تئیں ہمدردی کے جذبات بڑھ جاتے ہیں، اور مردہ جسم خواہ انسان کا ہو یا کسی جانور کا، انسانی صحت کے لئے بہت ہی مضرت رساں ہے، گویا غیبت کرنا انتہائی جور و جفا اور بے رحمی کا فعل ہے، حدیث میں بھی متعدد مواقع پر یہ مضمون آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ایک صاحب کھڑے ہو گئے، ان کے جانے کے بعد ایک صاحب نے ان کے بارے میں شکایت شروع کر دی، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ خلال کر لو، انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کس چیز سے خلال کروں، کیا میں نے گوشت کھایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے، (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۸۰۰۵) نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، ایک بدبودار نعش کی بو اٹھی، حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا تمہیں یہ معلوم ہے یہ کیسی بو ہے؟ یہ ان لوگوں کی بو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔ (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۸۰۰۴ بحوالہ مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ نے سود کی بطورِ خاص مذمت فرمائی ہے، لیکن مسلمان کی عزت و آبرو سے کھیلنے کو اس سے بھی سنگین جرم قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو پر ناحق دست دراز کرنا سب سے بڑا سود ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۷۶) غیبت کرنے والے، لوگوں کے کردار کو مجروح کرتے ہیں، اور سماج میں اپنے بھائیوں کی شبیہ بگاڑ کر پیش کرتے ہیں، اس لئے آخرت میں ان کو اسی کے مناسب سزا بھی ملے گی، واقعۂ معراج میں رسول اللہ ﷺ کا گذر ایک ایسے گروہ پر ہوا جو اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں، اور ان کی عزت و آبرو سے کھیلتے ہیں ''یأکلون لحوم الناس و یقعون في أعراضهم''۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۷۸)

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹی بات ہی غیبت ہوتی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، جھوٹی شکایت کرنا تو بہتان ہے، اگر کوئی کوتاہی فی الواقع کسی میں موجود ہو اور اس کا اس کے غائبانہ میں ذکر کیا جائے، یہی غیبت ہے، حضرت ابوہریرہ ﷺ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ غیبت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کی نسبت سے ایسی بات کا ذکر کرنا جو اسے ناپسند ہو ''ذکرک أخاک بما یکرہ'' پوچھا گیا: گو وہ بات میرے بھائی میں موجود ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر وہ بات اس میں موجود ہو تبھی تو غیبت ہے، اگر وہ بات اس میں موجود نہ ہو تب تو یہ بہتان ہے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۷۴)

غیبت زبان سے بھی ہوتی ہے، تحریر سے بھی، اشارہ و کنایہ سے بھی، خواہ نجی خطوط اور تحریروں کے ذریعہ یا اخبارات و رسائل اور کتابوں کے ذریعہ، سب غیبت میں داخل ہے، اور جس چیز کی اشاعت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اس کا گناہ بھی اسی درجہ بڑھا ہوا ہوگا، آج کل بعض اوقات رسائل و جرائد کے مضامین اور اخباری بیانات میں لوگوں کی ذاتیات کو نشانہ بنایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ تو گڑی ہوئی ہڈیاں بھی اکھیڑی جاتی ہیں، اور مرحومین کو بھی نہیں بخشا جاتا، یہ سب غیبت میں داخل ہے، اسی طرح اگر اشارہ و کنایہ میں کسی کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ آپ ﷺ کے سامنے ہاتھ کے اشارہ سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پست قامت ہونے کو بتایا، آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو اس کا بھی مزا بدل جاتا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۷۵)

افسوس کہ اس بیماری میں بے دینوں کے ساتھ ساتھ دیندار اور بے علم کے ساتھ ساتھ اصحابِ علم بھی پوری طرح مبتلا ہیں، مسجدیں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے لئے ہیں، انھیں قرآن کی تلاوت اور اللہ کے ذکر سے گونجنا چاہئے، دینی کاموں کے مراکز اور دینی درسگاہیں اس لئے ہیں کہ یہاں کے در و دیوار اور ذرّہ ذرّہ میں قال اللہ اور قال الرسول رچ جائے اور یہاں رہنے والوں کو دیکھ کر لوگ رسول اللہ ﷺ کے سنتوں کا عملی پیکر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں،

خانقاہیں اور تزکیہ گاہیں اس لئے تھیں کہ سینے اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوں اور انسان اخلاقی رزائل سے پوری طرح پاک وصاف ہو جائے ،لیکن عملاً صورتِ حال کیا ہے؟ مسجدوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی غیبت کی جاتی ہے، دینی مراکز اور مدارس میں مصنوعی تواضع اور تقویٰ کے اظہار کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف تبصرے کئے جاتے ہیں، خانقاہوں میں مخالفین کی برائیوں کے چرچوں سے لذت حاصل کی جاتی ہے، جن کی مجلسیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دین کی دعوت و تذکیر میں معمور ہونی چاہئے ان مجلسوں کا زیادہ حصہ سارے جہاں کے جائزہ اور مختلف لوگوں پر تبصرہ میں گزرتا ہے اور لوگ ان مجلسوں سے خشیتِ الٰہی، تقویٰ، خوفِ آخرت اور انسانی اخوت و محبت کا سبق لے کر اٹھنے کے بجائے نفرت و عدات اور بغض و عناد کی انگیٹھی لے کر ساتھ جاتے ہیں۔

افسوس کہ لوگ اپنے اس گناہ کے لئے بھی اپنے خالق و مالک ہی کو آڑ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ، اور اس کے لئے بڑے خوب صورت الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں ، جیسے ''اللہ معاف کرے فلاں صاحب ایسے ہیں''، ''دروغ برگردنِ راوی فلاں صاحب کے بارے میں میں یہ بات سننے میں آئی'' کسی کا ذکر آیا تو آہ بھر کر گویا ہوتے ہیں کہ: ''فلاں بات سے اللہ ہم کو بچائے'' یہ غیبت کا ایسا انداز ہے جس میں اپنی احتیاط کا بھرم رکھتے ہوئے دوسروں کو مجروح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غیبت حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، اور اس کے ناجائز ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے، لیکن بعض خصوصی حالات میں خود ظلم سے بچنے اور دوسروں کو ظلم بچانے کے لئے غیبت کی اجازت دی گئی ہے، مظلوم کے لئے درست ہے کہ وہ ظالم کی زیادتی اور اس کے ظلم و جور کو بیان کرے، لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ، (النساء:۱۴۸) اگر ایک شخص نے دوسرے پر ظلم کیا یا کر رہا ہو، تو مظلوم کو ظلم سے بچانے کے لئے غیبت کی اجازت ہے، اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی سے لڑکی یا لڑکا کے رشتہ کے بارے میں دریافت کیا، یا کسی سے معاملہ یا کاروبار کے سلسلہ میں رائے لی تو جس سے مشورہ لیا گیا، اس کے لئے جائز نہیں ہے

کہ وہ حقیقی صورتِ حال کو چھپادے، بلکہ سچائی کو بتا دینا ایسے موقع پر واجب ہے،خود رسول اللہ ﷺ نے بعض رشتوں کے سلسہ میں منفی مشورے دیے ہیں ، نیز آپ ﷺ کاارشاد ہے : ''المستشار مؤتمن ''،جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے،یعنی اس کو پوری امانت و دیانت کے ساتھ مشورہ دینا چاہئے اوراس میں کوئی رورعایت نہیں رکھنی چاہئے ، ورنہ یہ اپنے ایک مسلمان بھائی کے ساتھ دھوکہ دہی کے مترادف ہوگا۔

اسی طرح بری صحبت سے بچانے کے لئے بھی غیبت کی گنجائش ہے،کوئی شخص غلط فکر رکھنے والے مسلمان یا غیر مسلم کے ساتھ بہت زیادہ رہتا ہے ، اور اندیشہ ہے کہ وہ اس کی برائیوں کا اثر قبول کرے گا،تو درست ہے کہ اسے اس شخص کی غلط فکر اور غلط افعال سے واقف کرادیا جائے تا کہ وہ اپنے ایمان وعمل کی حفاظت کر سکے،اسی لئے محدثین نے ان راویوں پر تنقید کی اور تنقید میں کسی تعلق اور رشتہ کو رکاوٹ نہیں بننے دیا جو ان کے نزدیک حدیث کے نقل روایت میں معتبر نہیں تھی ، عجیب بات ہے کہ یوں تو عوام وخواص غیبت کی بیماری میں مبتلا ہیں ، لیکن جن مواقع پر سچائی کو بیان کر دینے کا حکم ہے انہی مواقع پر ذاتی مصلحتیں اور شخصی تعلقات زبان کا تالا بن جاتی ہیں۔

یہ ایسا اخلاقی ناسور ہے،جس نے بہت سے گھروں اور خاندانوں کو تباہ کر دیا ہے،میاں بیوی کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں ، والدین اور اولاد کے درمیان نفرت کی خلیج بن گئی ہے ، رشتہ داریاں اور قرابت مندیاں فاصلوں میں بدل گئی ہیں ، پڑوسی پڑوسی کا منھ دیکھنا نہیں چاہتا، دین کی نسبت دلوں کے جوڑنے میں بے تاثیر ہوگئی ہے ، دینی کام کرنے والی شخصیتوں اور اداروں میں باہم ایسی رقابتیں ہیں کہ گویا ان کے سمتِ سفر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ، اور جیسے آدم خور جانور کو انسانی گوشت کی لذت بے قرار رکھتی ہے اسی طرح یہ آدم خور انسان ہیں جنھیں انسانوں کا گوشت کھائے بغیر سیری نہیں ہوتی۔

۲۲/ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ/ ۸/ اکتوبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

کھجور کی طرح

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو مجلس میں موجود تھے، دریافت فرمایا: ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں ہیں، وہ درخت مسلمان کی مانند ہے، کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ وہ کونسا درخت ہوسکتا ہے؟ —— صحابہ رضی اللہ عنہم سوچنے لگے اور ایک لمحہ کے لئے گویا حاضرین جنگلوں اور صحراؤں میں گھومنے لگے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ شاید کھجور کا درخت مراد ہو، لیکن چوں کہ ہمارے بڑے خاموش تھے، اس لئے مجھے جواب دیتے ہوئے حیاء محسوس ہوئی اور میں خاموش رہ گیا، اس وقت مجلس میں دس صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے، اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی ان میں سب سے کم عمر تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ میں نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو خاموش رہتے ہوئے دیکھا تو مجھے جواب دیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی، بہرحال سارے لوگ خاموش رہے، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ ہی فرمادیں، کونسا درخت مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھجور کا درخت، امام بخاری نے اس حدیث کو مختلف مسائل کے ضمن میں دس مقامات پر ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے بعض اور کتب حدیث کے حوالہ سے بعض تفصیلات ذکر کی ہیں۔ (فتح الباری: ۱/۱۷۵-۱۷۶، حدیث نمبر: ۶۱)

اس حدیث میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی متعلقین کا امتحان بھی لینا چاہئے اور دین کے فہم کے سلسلہ استفسار کرنا چاہئے کہ یہ فریضہ استاذ پر اپنے شاگردوں سے متعلق، عالم پر ان سے ربط رکھنے والے عوام سے متعلق، شیخ پر اپنے ارادت مندوں سے متعلق، جماعتوں اور تنظیموں کے ذمہ داروں پر اس جماعت، تنظیم اور ادارہ کے کارکنوں سے متعلق اور والدین پر ان کے بچوں سے متعلق عائد ہوتا ہے، عام طور پر دنیا کے معاملہ میں لوگ اپنے متعلقین کا احتساب کرتے ہیں، لیکن دینی شعور کے بارے میں ہم اس

احتساب کو ضروری نہیں سمجھتے۔

دوسرا قابل توجہ پہلو صحابہ کا اور خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ادب و احترام ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کی، حالاں کہ وہ مختلف جوابات دے سکتے تھے، چاہے وہ جواب غلط ہوتا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے بڑوں کا اس قدر پاس ولحاظ تھا، کہ صحیح جواب ذہن میں آیا، لیکن وہ مارے حیاء کے خاموش رہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو حسب ضرورت بولنے اور کم بولنے کی کوشش کرنی چاہئے، جب خدا کا خوف بڑھتا ہے، تو زبان گنگ ہوجاتی ہے، اور جب انسان خدا سے بے خوف ہوجاتا ہے، تو اس کی قوت گویائی بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ نہ اسے بولنے سے پہلے سوچنا ہوتا ہے اور نہ بولنے کے بعد اپنے جائزہ کی حاجت ہوتی ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس مجلس میں بڑے موجود ہوں، چھوٹوں کو جہاں تک ممکن ہو، خاموش رہنے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن آج کل صورت حال یہ ہے کہ گھر اور خاندان کے سارے فیصلے خواتین اور نوجوانوں کے ذریعے ہوتے ہیں۔

بعض احادیث میں ہے کہ بعد کو جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بتایا کہ میرے ذہن میں کھجور کا درخت ہی آرہا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کاش تم نے بتادیا ہوتا، تو مجھے فلاں اور فلاں چیز کے حاصل ہونے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی، یا فرمایا: سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ خوشی ہوتی —— اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنی اولاد کے دینی شعور پر خوش ہونا چاہئے اور اگر وہ دینی اعتبار سے بے شعور ہوں، تو اسی قدر انھیں فکرمند اور متاثر ہونا چاہئے، لیکن ہمارا ماحول یہ ہے کہ بچوں کی دینی تعلیم و تربیت پر اول تو توجہ نہیں ہوتی، نہ کبھی اس کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اگر بچوں نے دینی تعلیمی اعتبار سے بہتر نتیجہ حاصل کیا ہو، تو اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی، اگر بچہ ڈاکٹر یا انجینئر ہوجائے تو اسے داد دی جاتی ہے، فخریہ اس کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن اگر کسی بچہ نے حفظ قرآن کریم کی تکمیل کی، اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی، یا عصری درسگاہوں میں پڑھتے ہوئے اسلامیات سے متعلق کسی مقالہ میں کامیابی حاصل کی، تو اس کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی، یہ رجحان بدلنا چاہئے، تاکہ نوجوانوں میں

دینی تعلیم حاصل کرنے اوراپنے اندر دینی شعور بیدار کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔

اس حدیث کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کو کھجور کے درخت سے کیوں مشابہ قرار دیا گیا؟ —— اس سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں کہی ہیں، لیکن ان میں سے دو باتیں خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ کھجور کا درخت ہمیشہ ہرا بھرا اور خزاں نا آشنا رہتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سوال میں فرمایا کہ وہ درخت ایسا ہے کہ جس کے پتے نہیں گرتے ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک درخت کے پتے ہرے ہوتے ہیں، وہ اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، ذکر کے لئے زبانِ قال ضروری نہیں، زبانِ حال بھی کافی ہے، گویا اس تشبیہ میں مسلمانوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ انھیں ہمیشہ ذاکر ہونا چاہئے، چاہے یہ ذکر زبان سے ہو یا قلب سے، خدا کو یاد رکھنے کا تعلق صرف نماز و روزہ سے نہیں ہے اور اس کی جگہ مسجد اور مقدس مقامات ہی نہیں ہیں، بلکہ مومن جہاں کہیں بھی ہو، خدا سے اس کا تعلق تازہ ہو، وہ مسجد میں ہو، یا بازار میں ہو، حکومت کی کرسی پر ہو، عدالت کی مسند پر ہو، دکان میں ہو یا کارخانہ میں ہو، بال بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں میں ہو، یا اپنے دشمنوں اور معاندین میں ہو، جہاں کہیں بھی ہو، اپنے خالق و مالک سے غافل نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کھجور کا درخت بڑا ہی بابرکت اور نافع درخت ہے، کھجور کا پورا وجود انسان کے لئے نفع بخش ہے، اس کے پھل کھائے جاتے ہیں، اس کی بیجیں مختلف کاموں میں استعمال کی جاتی ہیں، اور عرب اسے جانور کے چارہ میں بھی استعمال کرتے تھے، اس کے پتے سایہ تو دیتے ہی ہیں، ساتھ ساتھ چٹائی کے کام بھی آتے ہیں اور لوگ اسے چھپر میں بھی استعمال کیا کرتے تھے، اس کا تنہ اور جڑ ان کاموں میں لایا جاتا ہے جس میں دوسری لکڑیاں کام آتی ہیں، قدیم زمانہ میں اس کے تنے عمارت میں بہترین ستون کا کام کرتے تھے، اس کی جڑ میں بعض ایسے اجزاء ہوتے ہیں کہ جو کھائے جاتے ہیں، ایک طرف کھجور کا نفع اتنا سارا ہے، دوسری طرف یہ ایسا درخت ہے جو کم سے کم پانی کے ذریعہ نشو ونما پاتا ہے اور اسی لئے صحراؤں اور ریگستانوں میں بھی یہ درخت لہلہا اٹھتا ہے۔

گویا مومن کو اس درخت سے تشبیہ دے کر اس کی نافعیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جیسے کھجور کا درخت سراپا نافع اور مفید ہے اور اس کا ایک ایک حصہ انسانیت کے لئے نفع رساں ہے، اسی طرح مومن کو اپنے سماج اور اپنے معاشرہ کے لئے نافع ہونا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نافع ہو، **خیر الناس من ینفع الناس** (کشف الخفاء: ۱۶/۱۲۸، حدیث نمبر: ۱۲۵۴، نیز دیکھئے: کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۴۱۵۲) —— آیئے! اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہم نے ایسی اُمت کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی ہے جو انسانیت کے لئے نفع کا سامان ہو؟

۱۰/دسمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

اُمتِ مسلمہ اس وقت جتنے نازک دَور سے گذر رہی ہے، ماضی کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اسلامی تاریخ میں سب سے تکلیف دہ اور سنگین واقعہ کی حیثیت سے تاتاریوں کے مظالم اور ان کے ہاتھوں دار الخلافہ بغداد کی تباہی و بربادی اور ویرانی کا ذکر کیا جاتا ہے، کہنے والے نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر اس واقعہ پر آسمان خون کے آنسو روتا تو بے جانہ ہوتا، تاتاریوں کے ظلم وجور کی یہ داستان ایک خوشگوار انجام پر اختتام پذیر ہوئی، کہ جو لوگ مسلمانوں کی جان اور زندگی کے درپے تھے اور عالم اسلامی کی اینٹ سے اینٹ بجار ہے تھے، وہی اسلام کے محافظ و پاسبان بن کر کھڑے ہوگئے، اور دَرو دیوار اور زروزمین کے فاتحین کے قلوب واذہان اور دل ودماغ کو خود اسلام نے فتح کرلیا، پھر یہ کہ اس ہلاکت خیز تاتاری طوفان کے زمانہ میں بھی مصر وشام کے علاقے ان کی تاراجی سے محفوظ تھے اور بعض مقامات پر مسلمان فوجوں نے تاتاریوں کو شکست بھی دی تھی۔

لیکن موجودہ حالات اس سے بھی بدتر ہیں، اس وقت عالم اسلام کے قلب میں صلیبی فوجیں موجود ہیں، عراق اور افغانستان میں امریکہ اور برطانیہ نے ظلم کی آندھی چلا رکھی ہے، اور کوئی ملک اس موقف میں نہیں کہ ان سے اس بارے میں سوال بھی کرسکے، اسرائیل مسلمان ملکوں سے گھرا ہوا ہے، لیکن فلسطین پر کھلے بندوں مظالم ہو رہے ہیں اور فلسطینیوں کی جان و مال، عزت وآبرو کی قیمت اتنی بھی نہیں ہے جو قیمت ریت اور مٹی کی ادا کی جاتی ہے، بوسنیا اور سابق یوگوسلاویہ میں سربوں نے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا ہے اور اب بھی مسلمان وہاں حقیقی آزادی سے محروم ہیں، چیچنیا اور اس کی بعض مسلم ریاستوں میں ایسے مظالم ڈھائے گئے ہیں جس نے چنگیز اور ہلاکو کی روح کو بھی شرمسار کردیا ہوگا، چین کی مسلم اکثریتی ریاست

میں مسلمان ہر طرح کے ظلم سہنے اور اُف تک نہ کہنے پر مجبور ہیں، برما کا صوبہ ''اراکان'' مسلم اکثریت کا صوبہ ہے، لیکن مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو دبانے کے لئے ان پر ایسے جور وستم رَوا رکھے گئے کہ کم اس کی مثال مل سکے گی، فلپائن اور تھائی لینڈ سے دن رات مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں آتی ہیں، انڈونیشیا سے مشرقی تیمور کے علاقہ کو الگ کر کے جبراً ایک عیسائی ملک کی تشکیل کی گئی، اور تیل سے مالا مال جنوبی سوڈان کو ایک نئی عیسائی مملکت بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، ایسی گھٹا ٹوپ اور اتھاہ تاریکی کہ صبح کی سپیدی دور دور تک نظر نہیں آتی۔

لیکن آخر اس سیاہ بختی اور حرماں نصیبی کے اسباب کیا ہیں؟ حالاں کہ عالمِ اسلام قدرتی اور اقتصادی وسائل سے مالا مال ہے، کلیدی سمندری راستے مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، زبردست افرادی وسائل انھیں حاصل ہیں، مسلم ممالک کی سرحدیں ایک دوسرے سے عام طور سے ملی ہوئی ہیں، ان کے پاس بہترین دماغ ہیں، جو یورپ اور امریکہ کی خدمت کر رہے ہیں، عالمِ اسلام کی فوجیں بہت ہی بلند ہمت اور عالی حوصلہ مانی گئی ہیں، قدرت کے اتنے سارے عطیات کے باوجود امتِ مسلمہ کی پسماندگی اور عالم اسلام کی رسوائی اور بے آبروئی کا سبب آخر کیا ہے؟ اور کیوں یہ امت پوری دنیا میں بے وزنی کا شکار ہے؟

غور کیا جائے تو اس کا بنیادی سبب باہمی اختلاف وانتشار ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم سے کہا تھا :

> اللہ کی ڈوری کو مضبوطی سے تھام لو، منتشر نہ ہو اور اپنے آپ پر اللہ کی نعمت کو یاد کرو، کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑا اور تم اس کی رحمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ (آل عمران:۱۰۳)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ تمہارے آپسی جھگڑے تمہاری ناکامی اور بے وزنی کا سبب بن جائیں گے :

> اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں اختلاف نہ کرو، کہ

تمہارے قدم پھسل جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، بے شک
اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (انفال:۴۶)

یہی اختلاف اور انتشار امت کی رسوائی، اس کی بے وقاری، اس کی جان و مال اور عزت وآبرو کی ارزانی اور اس کی ہزیمت وشکست خوردگی کا باعث ہے، عالم اسلام کی موجودہ صورتِ حال کا آغاز عرب قومیت کی تحریک سے ہوا، یورپ نے عربوں میں علاقائی اور قومی عصبیت کا صور پھونکا، یہ صور ایسا سحر انگیز تھا جس نے بڑے بڑے قائدین یہاں تک کہ بعض مذہبی قائدین کو بھی بدمست کر کے رکھ دیا، ترکوں کے مفروضہ مظالم کی دہائی دی گئی اور آخر خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہو گیا، یہ خلافت جیسی کچھ تھی، مسلمانوں کی وحدت اور اجتماعیت کا نشان تھی اور اس کی وجہ سے صلیبی طاقتیں عالمِ اسلام کی طرف بری نظر اٹھاتے ہوئے خوف محسوس کرتی تھیں، لیکن خلافت کے سقوط کے بعد پورا عالمِ اسلام چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گیا اور مغربی قبضہ گیر طاقتوں نے ان کے درمیان سرحدی اختلافات بھی باقی رکھے، تا کہ یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے جیب وگریبان سے کھیلتے رہیں اور ان کے دل جڑنے نہ پائیں، ایسی چھوٹی چھوٹی ٹکریاں جن کو باہمی آویزشوں نے ایک دوسرے پر اعتماد و اعتبار سے محروم رکھا ہو، طاقتور دشمنوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، چنانچہ ۱۹۴۸ء میں عربوں کے علی الرغم اسرائیل کی بنیاد رکھی گئی، یہ صرف ایک ناجائز مملکت کا قیام ہی نہیں تھا، بلکہ پورے عالمِ عرب کو بے دست و پا کر دینے کی دوررس سازش تھی، جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے!

امریکہ نے جن مسلم ملکوں کو نشانہ بنایا ہے، ان کے چاروں طرف مسلم ممالک ہیں، مسلمان ملکوں سے امریکہ کو پٹرول ملتا ہے، مسلمان ملکوں سے امریکہ کے جہاز اڑان بھرتے ہیں، مسلمان ملکوں سے فوجی لئے جاتے ہیں، مسلمان حکمرانوں سے امریکہ کے حق میں بیان دلوایا جاتا ہے اور جنگ کی قیمت بھی مسلمان ملکوں ہی سے وصول کی جاتی ہے، اگر تمام مسلم ممالک اپنا ایک فوجی اور معاشی اتحاد تیار کرلیں اور طے کرلیں کہ ان کی سرحدوں سے کسی مسلمان ملک پر حملہ نہیں کیا جائے گا، تو حالات یقیناً بدل جائیں گے اور کسی ملک کو عالمِ اسلام پر

نگاہِ غلط اٹھانے کے لئے سو بار سوچنا ہوگا، لیکن افسوس! کہ جن صلیبی طاقتوں کے درمیان دنیا کی دو عظیم جنگیں ہو چکی ہیں اور جن کے مفادات قدم قدم پر باہم متصادم ہیں، اسلام کی عداوت و دشمنی نے ان کو متحد کر رکھا ہے، لیکن غلامانِ اسلام جن کو ان کے آقا و مولی ﷺ نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا تھا، وہ ایک دوسرے سے ٹوٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے خلاف تیغ و خنجر اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ تو عالمِ اسلام کی صورتِ حال ہے، خود اپنے ملک ہندوستان میں ہمارا کیا حال ہے؟ تقسیمِ ملک کے بعد مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا، حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے نام پر نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، رواڑ کیلا اور جمشید پور میں فساد کی آگ نے پورے پورے محلّہ کو جلا کر خاکستر بنا کر رکھ دیا، مراد آباد میں خون کی ہولی کھیلی گئی، بھاگلپور میں فساد کے نام پر باضابطہ پولیس ایکشن ہوا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، سورت میں نہ صرف مسلمانوں کی جانیں لی گئیں، املاک تباہ کی گئیں، بلکہ بڑے پیمانہ پر عورتوں کی آبرو ریزی بھی ہوئی، احمد آباد اور گجرات کے فساد نے تو پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے، اگر کسی انسانی آبادی پر چیتے اور بھیڑئے مسلط کر دیے گئے ہوتے تب بھی شاید اتنی خوں آشامی نہیں ہوتی، بابری مسجد علی الاعلان دو پہر کی دھوپ میں شہید کی گئی اور اب تک یہ مسجد انصاف کے ایوان میں ناانصافی کا گلہ کر رہی ہے، ملازمتوں کے دروازے عملاً مسلمانوں پر بند کر دیے گئے اور ان سے ان کی زبان تک چھین لی گئی، مسلمانوں کی آبادی کا تناسب خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقریباً چودہ فیصد ہے، لیکن ملازمتوں اور عوامی اداروں میں ہمارا تناسب پانچ فیصد بھی نہیں، یہ ہے وہ صورتِ حال جس سے ہم اس ملک میں دو چار ہیں، اور اگر خدانخواستہ این، ڈی، اے حکومت دوبارہ برسر اقتدار آجاتی تو نہ جانے ملک پر زعفرانی رنگ کتنا گہرا ہو جاتا اور مسلمانوں کے کیا حالات ہوتے؟

مسلمانوں نے اس ملک کی تحریک آزادی میں نہ صرف حصہ لیا، بلکہ اس کی قیادت کی اور اس جرم بے گناہی میں سب سے زیادہ دُکھ اٹھائے، اس آزادی کا ثمرہ برادرانِ وطن کو تو

حکومت، تعلیم اور ملازمت کی صورت میں ملا؛ لیکن مسلمانوں کو اس کے بدلہ بھاگلپور اور گجرات کے فسادات ملے، ان سب کے باوجود مسلمانوں کے لئے ایک اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ دستور کے بنیادی حقوق میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، اور مذہبی آزادی میں مذہب پر عقیدہ، مذہب پر عمل اور مذہب کی تبلیغ تینوں پہلو شامل ہیں، مذہبی آزادی ہی کے دائرہ میں نجی زندگی کے وہ قوانین بھی آجاتے ہیں جنھیں ''پرسنل لا'' کہا جاتا ہے۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت آزادی سے پہلے بھی ملک کے معماروں نے دی تھی، خود بابائے قوم گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء کے اجلاس کانگریس میں اس کا اعلان کیا تھا اور اس ملک کے معماروں کے ذہن میں شروع سے ایک ایسی کثیر قومی اور کثیر مذہبی جمہوریت کا تصور تھا، جس میں تمام اکائیوں کو عائلی زندگی میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی، لیکن بدقسمتی سے دستور کے رہنما اصول میں ایک ایسی دفعہ بھی رکھ دی گئی جس کے بموجب بتدریج ملک میں یکساں سیول کوڈ لانے کی کوشش کی جائے گی، دستور ساز اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے اس وقت بھی آواز اٹھائی، لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ کوئی پاگل ہی حکومت ہوگی جو مسلمانوں پر زبردستی یکساں سیول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش کرے گی، اس وقت ملک کے حالات بھی ایسے تھے کہ ان مسائل پر مسلمان کوئی تحریک چلانے کے موقف میں نہیں تھے، لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے جس عمل کو ''جنون'' سے تعبیر کیا، کچھ ہی عرصہ میں ایسے ''مجنونوں'' کی پیدائش شروع ہوگئی اور جب ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بنا، تو اسی وقت بل پیش کرتے ہوئے وزیر قانون نے کہا کہ یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا قدم ہے، یہ بیان مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں خطرہ کا الارم تھا؛ کہ آج نہ کل مسلمانوں کے عائلی قوانین پر بھی دست درازی ہوگی، پھر ایوانِ حکومت سے مختلف لوگوں نے دَبے لفظوں میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کہنی شروع کردی، اور بعض مغرب زدہ حکومت کے لقمہ خوار، نام نہاد مسلمان دانشوروں نے بھی ہاں میں ہاں ملانا شروع کیا، یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں متبنّٰی سے متعلق ایک ایسا بل پیش کیا گیا جس میں لے پالک کو حقیقی اولاد کی حیثیت دی گئی تھی۔

یہ وہ حالات تھے کہ جب دردمند علماء اور فکر مند مسلمان قائدین نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت اس فتنہ کی مزاحمت نہیں کی گئی تو شاید انھیں شریعت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا ، اور مسلمانوں کے مذہبی تشخصات بھی تختۂ دار پر چڑھ جائیں گے، اس پس منظر میں امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر دارالعلوم دیوبند میں ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا، اور اسی اجلاس میں چند ماہ بعد ۲۷ - ۲۸ ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن کی تجویز منظور ہوئی ، چھوٹا سا قافلہ جو دیوبند سے تحفظِ شریعت کی منزل کو پانے کے لئے رَواں ہوا تھا، ممبئی پہنچتے پہنچتے بحر بیکراں بن گیا ، یہ وہ تاریخی اجلاس تھا، جس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے فرمایا تھا کہ آج اگر ہندوستان میں کہیں کسی اہم مسلم شخصیت کو تلاش کیا جائے گا تو ایک ہی جواب ملے گا کہ وہ بمبئی میں ہیں، اس کنونشن میں پہلی بار سنی ، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، حنفی، اہل حدیث جمعیۃ علماء، جماعتِ اسلامی، مسلم لیگ، مجلس اتحادالمسلمین، سیاسی قائدین ، خانقاہوں اور درگاہوں سے متعلق مشائخ وسجادگان اور معزز دانشوران ، ملک کے ہر کونے اور ہر علاقہ سے ایک دوسرے سے کاندھا ملا کر اور سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے، ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ نے ان سب کو جمع کر رکھا تھا، اور وہ تھا شریعتِ اسلامی کا تحفظ اور مسلمانوں کے مذہبی تشخصات کی حفاظت ۔

یہ ایسا حسین منظر تھا کہ اس ملک میں اسلام کی حفاظت و بقاء اور اشاعت وارتقاء کی آرزو رکھنے والوں کے لئے آج بھی اس سے زیادہ مسرور وشادکام کرنے والا کوئی منظر نہیں ہوسکتا، اسی کنونشن میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی تجویز منظور ہوئی ، اور اپریل ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد میں بورڈ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں باضابطہ بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی ، اور باتفاقِ رائے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اس کا پہلا صدر اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو پہلا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

اس کنونشن کے انعقاد اور بورڈ کی تشکیل میں ہمارے بزرگوں نے جس ایثار اور کسر نفسی سے کام لیا ہے، اس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں، اس کنونشن میں تمام لوگوں کی شرکت کو

یقینی بنانے کے لئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی صاحبؒ، حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی مرحوم کے خلیفہ و مجاز حضرت مولانا مفتی محمد برہان الحق صاحب کی خدمت میں بنفس نفیس تشریف لے گئے اور پیچھے کی صف میں وہاں بیٹھے جہاں لوگ جوتے اتارتے ہیں اور تحفظِ شریعت کی دہائی دے کر ان سے اس کنونشن کی تائید کی درخواست کی ، ان بزرگوں کی یہ بے نفسی رنگ لائی اور مفتی صاحب نے اس کی تائید کا اعلان فرمایا، چنانچہ کنونشن میں چوٹی کے علماء بریلی بھی شریک ہوئے، جن میں معروف مقرر مولانا ارشد القادری مرحوم کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جنھوں نے کنونشن میں پر جوش تقریر فرمائی، پھر جب بورڈ کی تشکیل کا وقت آیا تو اتفاق و اشتراک پیدا کرنے کے لئے بعض حضرات کا خیال تھا کہ ایک مجلس صدارت ہو اور اس کے کئی ارکان ہوں، لیکن اس وقت ہمارے بالغ نظر بزرگوں نے اس رائے کو پسند نہیں کیا، کیوں کہ اس طرح لوگوں تک یہ پیغام پہنچتا کہ مسلمان جب کسی ایک شخصیت پر متفق ہونے سے قاصر ہیں، تو ایسا اتحاد کتنے دنوں تک باقی رہ سکتا ہے!

اب عہدۂ صدارت کے لئے خود حضرت مولانا مفتی برہان الحق صاحبؒ کی طرف سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی پیش ہوا اور باتفاقِ رائے آپؒ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا اور نائبین صدر میں پہلا نام خود حضرت مفتی صاحبؒ کا طے ہوا، جب سے آج تک بورڈ مختلف مکاتبِ فکر، جماعتوں اور تنظیموں کا نمائندہ رہا ہے، اجمیر شریف کے دیوان محترم جناب یوسف مہاراج صاحب بورڈ کے تاسیسی رکن ہیں، مولانا مفتی مظفر حسین کچھوچھوی اپنی وفات تک نائب صدر کے عہدہ پر فائز رہے، اس وقت بھی حضرت مولانا محمد محمد حسینی سجادہ نشیں گلبرگہ نائب صدر ہیں اور بورڈ کے فعال قائدین میں ہیں، بمبئی سے مولانا مُنّی میاں، بدایوں سے مولانا محمد یٰسین عثمانی، رام پور سے حضرت مولانا محبوب علی وجیہی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے مولانا محمد ادریس اور فیض آباد سے مولانا مظفر حسین صاحب بورڈ کے اہم ارکان میں ہیں، مولانا توصیف رضا صاحب کو بھی بورڈ کی رکنیت کی پیش کش کی گئی تھی، ہمارے شہر حیدر آباد سے

مولانا سید اکبر نظام الدین صاحب امیر جامعہ نظامیہ، مولانا مفتی خلیل احمد صاحب شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ اور مولانا سید قبول پاشا شطاری صاحب سجادہ نشیں خانقاہ شطاریہ جیسے ممتاز مشائخ بورڈ کے ارکان میں ہیں۔

یہی حال شیعہ مکتبِ فکر کا ہے، بمبئی کنونشن کا خطبۂ افتتاحیہ فرقۂ بواھیر کے مشہور قائد سید نجم الدین نے دیا تھا، اور یہ بہت ہی ولولہ انگیز خطبہ تھا، آج بھی اس فرقہ سے نور الدین بھائی شبیر اور جناب یوسف حاتم مچھالہ بورڈ کے اہم ارکان میں ہیں، فرقۂ امامیہ سے ممتاز عالمِ دین مولانا کلب عابد صاحب اپنی وفات تک بورڈ کے نائب صدر رہے، اور اس وقت مولانا کلب صادق نائب صدر اور مولانا کلب جواد اور کئی دوسرے شیعہ علماء جناب نقوی (لکھنؤ) اور جناب علی موسیٰ رضا (پٹنہ) بورڈ کے رکن ہیں، یہی حال تنظیموں اور جماعتوں کا ہے، جمعیۃ علماء، جماعتِ اسلامی، امارت شرعیہ، مجلس تعمیر ملت، مجلس مشاورت، مسلم لیگ، انڈین نیشنل لیگ اور تقریباً تمام ہی قابل ذکر کل ہند اور ریاستی تنظیمیں اور ادارے بورڈ میں شامل ہیں، اور یہی اتحاد و اشتراک بورڈ کی اصل طاقت اور شریعتِ اسلامی کے تحفظ کا طاقتور ہتھیار رہے۔

مختلف حلقوں کی نمایندگی اور پوری امتِ اسلامیہ کو ساتھ لے کر چلنے کے سلسلہ میں بورڈ کا موقف بہت ہی واضح رہا ہے، اور بہت ہی توازن کے ساتھ ہمیشہ اس کی تشکیل ہوتی رہی ہے، اور اگر ایسا محسوس کیا جائے کہ کسی حلقہ کی نمایندگی بعض لوگوں کی وفات کی وجہ سے اتفاقی طور سے کم ہوگئی ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے کہ بورڈ کے سکریٹریٹ کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا جائے، اور جو لوگ بورڈ کے طریقۂ کار سے واقف ہیں، انھیں اس کا بخوبی اندازہ ہے کہ ایسے مشوروں پر پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی جاتی ہے، لیکن اختلاف و انتشار پیدا کرنا اور نئے نئے بورڈ کی تشکیل اور اتنے بڑے متفقہ پلیٹ فارم کو بے وزن بنانے کی کوشش کرنا نہایت ہی بدبختانہ بات ہوگی اور یہ امتِ اسلامیہ کے مفاد پر کاری ضرب لگانے کے مترادف ہوگا۔

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ بورڈ کو حکومت اور فرقہ پرست عناصر اپنے منصوبوں میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، کیوں کہ اس نے ہمیشہ بے لوث اور بے غرض قدم اٹھایا ہے، اور

مخالفین کی ہزار کوششوں کے باوجود بورڈ نے کبھی بھی دین وملت کا سودا نہیں کیا، اس لئے اس کی خدمات کا باب وسیع ہے، متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء کے پس منظر میں بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور جولائی ۱۹۷۸ء میں اس وقت کے وزیر قانون جناب اشوک شانتی بھوشن نے واضح طور پر پارلیمنٹ میں اس بل کو واپس لینے کا اعلان کیا، پھر ۱۶ ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو دوبارہ متبنیٰ بل پیش ہوا، لیکن مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں جب ایمرجنسی لگائی گئی اور جبراً خاندانی منصوبہ بندی خاص کر نس بندی کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو بورڈ نے انتہائی جبر اور دباؤ کی فضا میں پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ اس کی مخالفت کی، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد کورٹ نے مساجد ومقابر کے سلسلہ میں ایک ایسا فیصلہ دیا جس کے تحت مسجدیں اور قبرستان کو بھی ایکوائر کیا جاسکتا تھا، جے پور کی ایک مسجد اور لکھنؤ کی دو مسجدیں اور ایک قبرستان اس فیصلہ کی زد میں تھے، بورڈ نے اس کے خلاف جد وجہد کی، ریاست اور مرکز کے ذمہ دارانِ حکومت سے ملاقاتیں کی گئیں اور اس طرح یہ مسجدیں اور قبرستان مسلمانوں کو واپس کئے گئے۔

نفقہ کے سلسلہ میں ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء بورڈ کا قیام کے بعد ہی سے ذمہ داروں کی توجہ کا مرکز تھا، اس کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت طلاق کے بعد بھی تا نکاحِ ثانی شوہر پر اپنی مطلّقہ بیوی کا نفقہ واجب قرار دیا گیا تھا، بورڈ کی کوششوں سے دفعہ ۱۲۷ میں ایک شق کا اضافہ کیا گیا کہ اگر طلاق دینے والے شوہر نے شرعی واجبات ادا کردیے ہیں یا مطلقہ نے معاف کردیا ہے، تو دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ حاصل شدہ ڈگری منسوخ ہوجائے گی، گو یہ ترمیم بھی پوری طرح بورڈ کے مقصد کو پورا نہیں کرتی تھی؛ لیکن ایک حد تک اس میں تلافی کا سامان موجود تھا، مگر گجرات ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا کہ شوہر کی طرف سے واجبات کی دائیگی نفقہ کی منسوخی کے لئے کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عورت اسے قبول کرنے کو تیار ہو، ابھی یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ سپریم کورٹ نے محمد احمد خاں بنام شاہ بانو کیس میں مطلّقہ کے لئے تاحیات یا تا نکاحِ ثانی شوہر پر نفقہ لازم قرار دیا، اس کے خلاف ہندوستان بھر میں تحفظ شریعت کی تحریک چلائی گئی اور خواتین نے بھی پورے جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس تحریک میں شرکت کی، چنانچہ ۶ مئی ۱۹۸۶ء کو حکومت نے

''قانونِ تحفظ حقوقِ مسلم مطلقہ ۱۹۸۶ء'' پاس کیا، یہ بورڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی، لیکن افسوس کہ عدالتوں کے اس رخ نے کہ وہ تشریح قانون سے آگے بڑھ کر وضع قانون کی خدمت بھی انجام دیں گی، اس قانون کو ایک حد تک بے اثر کر دیا ہے؛ البتہ پٹنہ ہائی کورٹ اور حیدرآباد ہائی کورٹ نے جو فیصلے کئے ہیں، وہ قانونِ شریعت سے ہم آہنگ ہیں۔

اپریل ۱۹۸۰ء میں انکم ٹیکس کے نئے مجوزہ قوانین کے دائرہ میں اوقافی جائیداد بھی آرہی تھی، بورڈ کی کوششوں سے وقف کی جائیدادیں اس سے مستثنیٰ ہوئیں، بابری مسجد کے سلسلہ میں جب حکومت چاہتی تھی کہ کسی نام نہاد مسلمان گروہ سے خرید وفروخت کا معاملہ طے کر لیا جائے تو بورڈ ہی نے اس ملت فروشی کو روکا، اور ۳؍ دسمبر ۱۹۹۰ء کو مسجد کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور متفقہ فیصلہ کر دیا کہ مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہے، پھر حکومت، سنگھ پریوار اور کانچی پورم کے شنکراچاریہ کی طرف سے مسجد کی حیثیت تبدیل کرنے کے سلسلہ میں مختلف سازشیں اور نا مسعود کوششیں کی گئیں، لیکن بورڈ نے ہمیشہ انھیں مسترد کر دیا، عدالتی سطح پر مسلم پرسنل لا کے خلاف یا مسلم پرسنل لا کو متاثر کرنے والے مختلف مقدمات میں بورڈ فریق بنا ہے اور ایسے فیصلے ہوئے ہیں، جو قانونِ شریعت کے موافق ہیں، اور آج بھی بابری مسجد کی حقیت اور اس کی شہادت سے متعلق مقدمات نیز پرسنل لا سے متعلق کئی مقدمات کی پیروی کی جارہی ہے۔

اس کے علاوہ بورڈ کے مثبت کارناموں میں ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی ترتیب ہے، جو احکامِ شریعت کی اجتماعی تدوین کے پہلو سے ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے بعد دوسری سب سے نمایاں اور ممتاز خدمت ہے، —— بورڈ نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ''اصلاحِ معاشرہ'' جلسوں اور کانفرنسوں کا ایک اہم عنوان بن گیا ہے، اور بورڈ کے علاوہ بورڈ میں شامل مختلف جماعتیں اور تحریکیں بھی اس سمت میں سرگرم عمل ہیں؛ بورڈ کوشاں ہے کہ پورے ملک میں دارالقضاء کا مستحکم اور مضبوط نظام قائم کیا جائے، تاکہ مسلمان اپنے باہمی نزاعات ان شرعی عدالتوں سے فیصل کرائیں اور اس طرح قانونِ شریعت کے تحفظ میں وہ خود مکتفی ہو جائیں، چنانچہ اب تک تقریباً ۲۰ دارالقضاء براہِ

راست بورڈ کے زیرنگرانی چل رہے ہیں اور حال میں ایک ایسا ''نکاح نامہ'' ترتیب دیا گیا ہے جو دارالقضاء کے نظام کو تقویت پہنچائے گا ، اور خواتین کے لئے شرعی حقوق و واجبات کے حاصل کرنے کو آسان بنائے گا ، سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کا ایک متفقہ پلیٹ فارم ہے، اس کی متفقہ حیثیت کو باقی رکھنے ہی کے لئے اس کے دائرۂ کار کو محدود رکھا گیا ہے، بورڈ نے پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے اور اختلافی پہلوؤں سے اپنے دامن کو بچایا ہے۔

مسلمانوں کی یہ وحدت جس نے انھیں قطرہ سے سمندر اور چنگاری سے آتش فشاں بنادیا ہے، ان لوگوں کی نگاہ میں چبھ رہا ہے جو مسلمانوں کے مذہبی تشخصات اور ان کی دینی و تہذیبی شناخت کے مخالف ہیں، اگر ان کے ناپاک عزائم کی راہ میں بورڈ ''بنیان مرصوص'' بن کر کھڑا نہ ہوا ہوتا تو کوئی انھیں روک نہیں سکتا تھا، انھوں نے کئی بار شیعہ حضرات کے بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں کو اکسانے کی کوشش کی ہے، لیکن خود اس فرقہ کے سمجھدار لوگوں نے اس سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، بریلوی بھائیوں سے ''مسلم پرسنل لا کانفرنس'' اور ''مسلم کانفرنس برائے پرسنل لاء'' قائم کرائی، لیکن خود اس حلقہ کے ذمہ دار اور سمجھ دار افراد نے امت کے وسیع تر مفاد کے پس منظر میں ایسی کوششوں کا تعاون نہیں کیا، اور یقین ہے کہ اس وقت بعض حضرات جو دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کے درمیان تفریق کی سازش کا آلہ کار بن رہے ہیں، ان کی کوششیں بھی ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہوسکیں گی ، اور وہ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے، کیوں کہ بورڈ نے جن مسائل کو اپنا ہدف بنایا ہے، وہ پوری امت کے درمیان مشترک نوعیت کے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسلام نے ہمیں قدم قدم پر وحدت اور اجتماعیت کی تعلیم دی ہے، اسی لئے ہماری تمام عبادتوں میں اجتماعیت کا رنگ رکھا گیا ہے، فرض نمازوں میں جماعت واجب قرار دی گئی ، اور جماعت کی نماز کا ثواب تنہا نماز کے مقابلہ ستائیس گناہ زیادہ رکھا گیا ہے، روزہ ایک ہی ماہ میں پوری امت پر فرض کیا گیا ، حج میں پوری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا فرمایا گیا ، زکوۃ کا مقصد ہی مسلمانوں میں تعاون و تناصر کا مزاج پیدا کرنا ہے، آپ ﷺ نے بار بار اجتماعیت اور اتحاد و

اتفاق کی تعلیم دی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر جماعت کے ساتھ رہنا اور تفریق و بکھراؤ سے بچنا واجب ہے ’’علیکم بالجماعۃ و إیاکم و الفرقۃ ‘‘ (ترمذی، حدیث نمبر:۲۱۶۵) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے: ’’ید اللّٰہ مع الجماعۃ ‘‘ (ترمذی، حدیث نمبر:۲۱۶۶) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤمنوں کی مثال باہمی محبت اور تعلق میں ایک جسم اور اس کے اعضاء کی ہے، (دیکھئے: مسلم، حدیث نمبر:۲۵۸۶) آپ ﷺ نے جماعت سے الگ ہونے کی مثال دے کر فرمایا کہ جو بکری ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے اسے بھیڑیا کھا جاتا ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۴۷) پوری امت ایک ریوڑ ہے اور بھیڑیا انسانی شکل و صورت میں بھی ہو سکتا ہے، ایسا نہ ہو کہ سنگھ پریوار اور اعداء اسلام کا بھیڑیا امت کے کسی گروہ کو اچک لے، جو لوگ امت میں انتشار پیدا کرنا چاہیں، حضور رحمت مآب ﷺ نے ان کے بارے میں اتنا سخت رویہ اختیار کیا کہ ارشاد فرمایا: جب تم کسی شخص پر متفق ہو اور کوئی شخص تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرے اور تمہاری طاقت کو بکھیرنے کے ارادہ سے آئے تو اسے قتل کر دو۔ (مسلم عن عرفجہ، حدیث نمبر:۱۸۵۲)

اس لئے وحدت و اجتماعیت تمام برکتوں اور سعادتوں کی کلید ہے، اور انتشار اور بکھراؤ تمام محرومیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا اصل سبب، آج ہم باہمی اختلاف اور اپنی صفوں میں بکھراؤ کا نتیجہ عالمِ اسلام میں بھی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور خود اپنے ملک میں بھی، مصیبتیں اور ابتلائیں شیر اور بکری اور سانپ اور نیولے کو بھی اکھٹا کر دیتی ہیں، لیکن کیا ہم ان مایوس کن اور عبرت انگیز حالات میں بھی نوشتۂ دیوار پڑھنے کو تیار ہیں؟

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟؟

۱۷/ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ ۲۸/ جنوری ۲۰۰۵ء
۲۴/ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ ۴/ فروری ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

اعتدال ومیانہ رَوی

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط وتفریط انسان کے لئے نا گوارِ خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیز بھی اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے یا حدِ ضرورت سے کم ہو جائے تو انسان کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور انعامِ خداوندی کے بجائے عذابِ آسمانی بن جاتی ہے، ہوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؟ لیکن جب انسانی آبادیوں کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیتی ہے، پانی زندگی و حیات کا سرچشمہ ہے، لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرے سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد وآباد بستیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں؟ قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظامِ کشش ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوتِ کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے کم ہو جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد وقامت بلی اور چوہے کی طرح ہو جائے، اور بڑھ جائے تو انسان اونچے درختوں بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہو جائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہو جائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے اور یہ ترازو ربِّ کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں اور افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عدل کا حکم دیتے ہیں، ''إن اللّٰہ یأمر بالعدل ''(النحل:۹۰) عدل کی روح اعتدال ہے، اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال

زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں ، بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے،قرآن و حدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار ورفتار،خوشی وغم،سلوک وبرتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط وتفریط ناپسندیدہ ہے اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے اور اِترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے،قرآن کہتا ہے کہ تم زمین میں اِترا کر نہ چلو کہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو''**و لا تمش في الأرض مرحاً إنک لن تخرق الأرض و لن تبلغ الجبال طولاً**''(الاسراء:۳۷)بول چال میں اعتدال چاہیے،نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے،نہ اتنی بلند ہو کہ حدِ اعتدال سے گزر جائے،قرآن کہتا ہے کہ آواز حسبِ ضرورت پست ہونی چاہیے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے،لیکن سب سے ناپسندیدہ:**واغضض من صوتک ، إن أنکر الأصوات لصوت الحمیر**۔(لقمان:۱۹)

لباس و پوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا ہے جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو،آپ ﷺ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی،لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو،آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے تو اس پر اس نعمت کا اثر آنا چاہیے،غرض کہ نہ افراط اور نہ تفریط،ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بہ تاکید حکم فرمایا(ترمذی،حدیث نمبر:۲۷۶۳)دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ سے آپ ﷺ کچھ ڈاڑھی تراشا بھی کرتے تھے۔(ترمذی،حدیث نمبر:۲۷۶۲)

دعا کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو، بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دعا کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا؛''**ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة إنه لا یحب المعتدین**''(الاعراف:۵۵)بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا حق دیا گا،ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے،(ابوداؤد،حدیث نمبر:۲۰۹۸)لیکن چوں کہ ولی کی شرکت

کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں، ''لا نکاح إلی بولي''۔(ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قاعدہ قانون اور اصول کے دائرہ میں ہو، اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو، ''و من قتل مظلوماً فقد جعلینا لولیه سلطاناً فلا یسرف في القتل ''(الاسراء:۳۳) انسان جوشِ انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے، اور حدِ اعتدال سے گزر جاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں، ''فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم''۔(البقرہ:۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداءِ اسلام نے تمہیں مسجدِ حرام سے روک رکھا ہے، لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہارے انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہو جانے کا باعث نہ بنے، (المائدہ:۲) تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ جائز نہیں ہے کہ کسی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا، اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی صورت پیدا ہو جائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو راہِ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں بصارت بھی چھین لیتی ہے، اور اسے اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت وعداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہو تو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو

قومیں گمراہ ہوئیں ، ان کی گمراہی کا باعث یہی ہوا ، غلو آمیز محبت ، یا انکار و نفرت ، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے ، دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا ہے ، دوست اور مرکزِ عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو اور مبالغہ اور تملق و خوشامد کو ناپسند کیا گیا ، قرآن مجید کہتا ہے کہ کسی سے عداوت ہو ، تو اس کو بھی حدِ اعتدال سے باہر نہ جانے دے ، ممکن ہو کہ کل ہو کر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرما دے ، ''**عسى اللّٰه أن يجعل بينكم و بين الذين عاديتم منهم مؤدة**'' (الممتحنۃ:۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اسے مزید واضح فرمایا ، آپ ﷺ کا ارشاد ہے : اپنے دوست سے حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو ، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو ، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے ، (ترمذی ، حدیث نمبر : ۱۹۹۸) غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو ۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب و ثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت و ناموری کے بام کمال تک پہنچیں ، آج وہی امت افراط و تفریط ، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے ، زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا ؟ تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی دونوں کی مثال نہیں ملتی ، احترام و عقیدت میں ذرّہ کو آفتاب بنانا اور اختلاف و عداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو وجہِ انتشار بنانا ہمارا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے ، ہمارا ایک گروہ حکومتِ وقت کے اشارہ پر آگ کو پانی کہنے میں بھی نہیں شرماتا اور ہمارا ایک طبقہ چنگاری جیسے واقعہ پر خود شعلہ بن جاتا ہے ، لوگوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں ہماری بے اعتدالی دن رات کا مشاہدہ ہے ، حقیقت یہ ہے کہ افراط و تفریط آخرت میں اللہ تعالیٰ کو پکڑ اور دنیا میں قوموں کی رسوائی کا سامان ہے ، اور اعتدال و میانہ روی آخرت میں سرخ روئی اور دنیا میں کامیابی کی کلید !!

۱۴ ؍ صفر المظفر ۱۴۲۶ھ ۲۵ ؍ مارچ ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

طوفان کا سبق

دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ کچھ ظاہری اسباب سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن ان اسباب کے پیچھے قدرت کا دستِ غیب کارفرما ہوتا ہے اور خدائی فیصلہ کے تحت ہی کائنات میں کوئی بھی واقعہ پیش آتا ہے، یہ بات خدا کو علیم وخبیر اور رب العالمین ماننے کے لوازم میں سے ہے، اس لئے جب کوئی قدرتی آفت پیش آتی ہے تو عام سائنس داں اسے اتفاق اور جغرافیائی تبدیلیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، اور بس! لیکن اصحابِ ایمان کی نگاہ اس سے آگے بھی بڑھتی ہے اور وہ ان حوادث کے پیچھے غیبی اسباب کو تلاش کرتی ہے، اسی لئے انبیاء پر جب کوئی ابتلاء آتی تو ان کی مبارک زبانوں سے التجاء والحاح بھرے الفاظ نکلتے، لاَ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَکَ إِنِّيْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ ، (الانبیاء:۸۷) ''آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ کی ذات پاک ہے، میں ہی خطا کاروں میں ہوں''۔

یہ اللہ کے پیغمبر حضرت یونس علیہ الصلاۃ والسلام کے کلمات ہیں، پہلے انسان اور پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھئے، کس عاجزی اور فروتنی کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دستِ سوال پھیلائے ہوئے ہیں کہ :

> رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَ إِنْ لَمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ . (الاعراف:۲۳)
>
> اے ہمارے پالن ہار! ہم نے تو اپنے آپ پر بڑی زیادتی کرلی ہے، اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا اور ہمارے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں فرمایا تو ہم بڑے نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔

مزاجِ نبوت اور تقاضۂ ایمان یہی ہے کہ آدمی قدرت کی طرف سے پیش آنے والے واقعات میں اپنی خطا کو تلاش کرے، اور اپنے آپ میں اصلاح کی کوشش کرے، نہ یہ کہ قدرتی

حوادث کو محض ایک طبعی واقعہ سمجھ کر گذر جائے ، حدیثوں میں ایک طرف یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ جیسے جیسے قیامت قریب ہوتی جائے گی ، دینی اور اخلاقی حالت میں انحطاط ہوتا چلا جائے گا، اور یہ بات بھی وارد ہوئی ہے کہ قربِ قیامت میں زلزلوں اور طوفانوں کی کثرت ہوگی، گویا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، امریکہ میں حالیہ دوہرے سمندری طوفان اور ہوا اور پانی کی متحدہ یلغار کو ہمیں اس پس منظر میں بھی دیکھنا چاہئے۔

یوں تو آج دنیا میں بہت سی برائیاں ہو رہی ہیں، لیکن بعض برائیاں وہ ہیں جو بہت ہی قابل توجہ اور انسانی سماج کے لئے نقصان دہ ہیں، ایک تو خدا کی علانیہ نافرمانی، اور اس نافرمانی کے درست ہونے پر اصرار، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں فطرت کے قانون سے بھی بغاوت، دوسرے ظلم، عام طور پر یہی دونوں چیزیں قوموں پر عذاب کا باعث بنی ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی اصل بیماری قانونِ فطرت سے بغاوت تھی، قدرت نے جو نظام مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے سے اپنی جنسی ضرورت کو پوری کریں ، انسان کی جسمانی ساخت میں بھی اس کی پوری پوری رعایت موجود ہے، اور اس سے نسل انسانی کی افزائش کا مقصد پورا ہوتا ہے، قومِ لوط نے اس سے بغاوت کی اور مردوں نے مردوں سے اپنی خواہشاتِ نفس کی تکمیل کا غیر فطری طریقہ اختیار کیا، اس لئے ان پر عذاب بھی اسی مناسبت سے نازل ہوا کہ جیسے انھوں نے قانونِ فطرت کو الٹ کر رکھ دیا تھا، اسی طرح ان پر سطح زمین الٹ دی گئی۔

نمرود اور فرعون ظالم حکمراں تھے، انھوں نے نہ صرف عوام کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، بلکہ اسے مذہبی رنگ دیتے ہوئے اپنی خدائی اور پوری انسانیت کی بندگی کا بھی اعلان کر دیا تھا، مجال نہ تھی کہ کوئی شخص اس کے حکم سے سرِ موانحراف کرے، اور محض اس خیال سے کہ بنی اسرائیل میں کوئی فرعون کا مدمقابل پیدا ہوگا، اس نے اسرائیل کے بے شمار بچوں کو تہ تیغ کر دیا، نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو محض عقیدۂ توحید کے جرم بے گناہی میں آتش بلکہ آتش فشاں میں جھونک دیا اور آپ علیہ السلام کو زندہ جلا دینے کی کوشش کی ، حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کا ظلم معاشی پہلو لئے ہوئے تھا اور انھوں نے لین دین کے الگ الگ پیمانے مقرر کر رکھے تھے، قومِ عاد و ثمود اور قومِ

نوح بھی ظلم پر کمر بستہ تھی اور اپنے قصور و محلات پر نازاں اور مفتخر۔

خدا کو ان سرکش قوموں کی سرتابیاں پسند نہیں آئیں ان پر عذاب نازل ہوئے اور اس عذاب کے نتیجہ میں ایک خاص علاقہ ایسا تباہ و برباد ہوا کہ بعض علاقوں کے تو آثار بھی باقی نہیں رہے، اس وقت بھی دنیا میں صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کھلے عام قانونِ فطرت سے بغاوت پر کمر بستہ ہیں، بہت سے مغربی ممالک میں مرد سے مرد اور عورت سے عورت کے نکاح کو قانوناً تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اس وقت لاکھوں مرد وعورت اسی طرح زندگی گذار رہے ہیں، یہاں تک کہ کلیسا نے بھی اس کی اجازت دے دی ہے، مغربی ملکوں میں نکاح کی شرح کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، شرحِ اموات سے شرح پیدائش گھٹتی جارہی ہے، قدرتی طور پر بچے پیدا کرنے کے جائے انسانی کلون تیار کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور مغربی معاشرہ میں فیشن کے نام پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے بھیس میں اور لڑکیاں لڑکوں کی وضع میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، عورتوں کو وہ ذمہ داریاں سونپ دی گئی ہیں جو ان کی جسمانی صلاحیت سے میل نہیں کھاتی ہیں، یہ اور اس طرح کی کتنی ہی باتیں ہیں، جو خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کے خلاف ہیں، میڈیکل سائنس بھی انسان سماج کے لئے ان کے مضر اور نقصاندہ ہونے پر متفق ہیں۔

دوسری طرف ظلم اپنے عروج پر ہے اور طاقتور قومیں کمزور قوموں پر جانی اور مالی ہر طرح کے مظالم رَوا رکھے ہوئے ہیں، اس میں سرفہرست امریکہ ہے، جس کی فوجیں مغربی یورپ سے لے کر مشرقی ایشیاء تک جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں، اور مختلف قومیں اس کے ظلم و جور سے عاجز ہیں، خاص کر عالم اسلام پر اس کے مظالم اپنی انتہاء پر ہیں، وہ نہ کوئی معاہدہ کا پابند ہے اور نہ بین الاقوامی قوانین کا، ایک امریکی فوجی کی جان عراق وافغانستان کے ہزاروں بے گناہوں سے بڑھ کر ہے، اور جو ملک بھی امریکہ کی کبریائی کا انکار کرے اس کے خلاف معاشی ناکہ بندی بھی جاتی ہے اور فوجی کارروائی بھی۔

معاشی استحصال کا حال یہ ہے کہ امریکہ جن ممالک پر چاہتا ہے، اقتصادی پابندی لگادیتا

ہے،اس کا تجارتی بائیکاٹ کرتا ہے اور مختلف ممالک کے قدرتی وسائل پر جابرانہ قبضہ کیا ہوا ہے، مغربی ممالک اپنی زراعتی ٹکنالوجی سے مشرقی ممالک کو استفادہ کا موقع نہیں دیتے اور خود ان کے یہاں جو پیداوار ہوتی ہے، اسے محض اس لئے سمندر کی نذر کردیتے ہیں اور ہزاروں کنٹل گیہوں اور مکھن دریابرد کردیا جاتا ہے کہ عالمی مارکٹ میں اس کی قیمت گرنے نہیں پائے، تاکہ غریب ممالک خود مکتفی نہ ہوں اور وہ متمول ممالک سے بھاری سود پر قرضے حاصل کرنے کے لئے مجبور ہوجائیں۔

امریکہ میں اس وقت کٹرینا اور پھر اس کے بعد دوسرا طوفان آیا، اس نے امریکہ کی کبریائی اور نخوت کو ٹھیس پہنچائی ہے، ایسے عظیم غارت گر کو بھی اس بات کے لئے مجبور ہونا پڑا کہ وہ پوری دنیا کے سامنے دستِ سوال دراز کرے اور سری لنکا اور بنگلہ دیش جیسے غریب ممالک نے بھی اس کی مدد کی ہے، اس واقعہ سے سائنسی ترقی اور قدرت کو فتح کر لینے کے دعووں کی حقیقت بھی کھل گئی اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قدرتی واقعات کو روکنے کی بات تو الگ رہی، اس کے بارے میں مطلع اور باخبر ہونے کے معاملہ میں بھی انسان آج اسی طرح بے بس ہے، جس طرح کل بے بس تھا، اس طوفان کی ہلاکت خیزیاں اتنی زیادہ تھیں کہ عراق وافغانستان بلکہ مختلف جنگوں کی مجموعی ہلاکتوں سے بھی ان کی تعداد آگے بڑھ گئی، راقم الحروف اس وقت برطانیہ میں تھا، وہاں کے اخبارات سے اندازہ ہورہا تھا کہ ہفتہ عشرہ گذر جانے کے باوجود گھروں اور گلی کوچوں میں سے لاشیں نکالی نہیں جاسکی تھیں۔

امریکہ اس وقت اپنے آپ کو مساوات اور انسانی حقوق کے تحفظ کا علمبردار قرار دیتا ہے، لیکن اس موقع پر اسے اخلاقی سطح پر بھی بڑا نقصان پہنچا اور یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ امریکیوں کے یہاں بھی کالے اور گورے کا امتیاز پوری قوت کے ساتھ موجود ہے، یہاں تک کہ قدرتی مصائب کے مواقع پر بھی اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاتا، اس طرح یہ طوفان افرادی اور معاشی تباہی ہی کا باعث نہیں بنے ہیں، بلکہ اخلاقی پہلو سے بھی امریکہ کی ساکھ متاثر ہوئی ہے، اس میں پوری انسانیت کے لئے سبق ہے کہ ظلم کے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں، قدرت کے

ہاتھ کے مقابلہ بہت چھوٹے ہیں اور بربریت کی رات کتنی بھی دراز ہو، اسے بالآخر سپیدۂ صبح کے سامنے سرخمیدہ ہونا پڑتا ہے، اس لئے انسان کو ہمیشہ ظلم اور تکبر سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہئے، ناانصافی، حق تلفی اور قانونِ فطرت سے بغاوت بحیثیتِ فرد ہو یا بحیثیتِ قوم اور انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، بالآخر خدا کی پکڑ کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ تو انسان کے لئے عبرت وموعظت کا پہلو ہے، لیکن انسانی ہمدردی اور اخوت کے لئے فرمانبردار اور نافرمان کی قید نہیں، اہل مکہ پر قحط ہوا اور شدید قحط، نیز حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قحط کا مقصد انھیں انکارِ حق پر تنبیہ کرنا تھی، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے قحط زدہ لوگوں کے لئے رقمِ اعانت بھیجی، اس لئے اس طوفان کے موقع سے مسلم ممالک نے اور مختلف ممالک کی مسلم تنظیموں نے جو انسانیت نواز سلوک کیا ہے اور مصائب میں مبتلا لوگوں کی مدد کی ہے، وہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر کار بند رہنا چاہئے اور دنیا کے سامنے اسلام کی انسانیت نوازی کے پہلو کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔

۲۵/شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ ۳۰/ستمبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

ہورہی ہے عمر مثلِ برف کم!

۲۰۰۵ء کا سال گذر چکا اور ۲۰۰۶ء کا آغاز ہو چکا ہے، گویا حیاتِ مستعار کا ایک اور سال گذر گیا، لوگ اسے خوشی و مسرت کا وقت سمجھتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ تو سالِ نو کے استقبال میں رقص و سرود کی بزمیں سجائی جاتی ہیں اور شہنائیوں اور نور و نکہت کی برسات کے ساتھ نئے سال کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ وقت افراد و اشخاص کے لئے بھی، اداروں اور تنظیموں کے لئے بھی اور جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی اپنے احتساب کا وقت ہے کہ انھوں نے اس عرصہ میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ اور وقت کی صورت میں جو عظیم نعمت اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اس کا کس طور پر استعمال کیا ہے؟ جو قوم خود اپنا محاسبہ نہیں کرسکتی اور جو جماعت اپنا گریبان آپ تھامنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دوسرے ان کے گریبان تھامتے ہیں اور خیر و شر کا حساب کر کے اس کا بدلہ چکاتے ہیں، لمحوں کی ناقدری سے بعض اوقات صدیوں کا نقصان ہوتا ہے اور قومیں زوال و انحطاط کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بہت سی نعمتیں اس کائنات میں دی ہیں، ان میں سے اک بہت بڑی نعمت وقت ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، اس کے اوقات بڑھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت عمر گھٹتی جاتی ہے اور ہر لمحہ وقت کی متاعِ گراں مایہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے :

ہورہی ہے عمر مثلِ برف کم
چپکے چپکے ، لمحہ لمحہ ، دَم بہ دَم

وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کتنے مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے، کبھی رات اور صبح کی قسم کھائی گئی (لیل:۱-۲، مدثر:۳۳-۳۴، تکویر: ۱۷-۲۸)، کبھی رات کے ساتھ شفق کی قسم کھائی گئی (انشقاق:۱۶-۱۷)، کبھی فجر اور اس کے ساتھ دس راتوں کی (الفجر:۱-۲)، کبھی دن کی روشنی اور رات کے چھا جانے کی (الضحیٰ:۱-۲) اور کبھی خود زمانہ کی

(العصر:۱) دنوں کی آمد و رفت اور سورج و چاند کے طلوع و غروب سے اوقات کا علم ہوتا ہے، قرآن مجید نے جا بجا اللہ کی نعمت کی حیثیت سے ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی؟ جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کرسکیں؟ ''اولم نعمر کم مایتذکر فیه من تذکر ''(الفاطر:۳۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی سے اس بارے میں سوال کیا جائے کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں گذاری اور اپنی جوانی کو کس مقصد میں صرف کیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں: صحت اور فراغتِ وقت۔

سلفِ صالحین جنھوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لحہ کو وصول کرتے تھے اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے، امام ابو یوسفؒ (۱۱۳-۱۸۲ھ) اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ان کے بارے میں اہل تذکرہ نے قاضی جراح سے نقل کیا ہے کہ وہ مرضِ وفات میں امام صاحبؒ کی عیادت کے لئے پہنچے، آپؒ پر بے ہوشی طاری تھی، ابراہیم بیٹھے رہے، کچھ دیر میں ہوش آیا، امام صاحب نے پوچھا کہ حج میں جمرات کی رمی پیدل کرنا افضل ہے یا سواری پر؟ ابراہیم نے استاذ سے عرض کیا کہ اس حال میں بھی آپ فکر و تحقیق کو نہیں چھوڑتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، ابراہیم نے کہا سوار ہو کر رمی کرنا افضل ہے، امام ابو یوسفؒ نے کہا: یہ غلط ہے، ابراہیم نے کہا: پھر پیدل رمی کرنا افضل ہوگا، فرمایا: یہ بھی غلط، ابراہیم نے عرض کیا کہ جو رائے صحیح ہو اسے آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: جس رمی کے بعد کوئی اور رمی ہو، اس کو پیدل کرنا افضل ہے اور جس کے بعد اور کوئی رمی نہ ہو اسے سوار ہو کر، ابراہیم وہاں سے اٹھے اور امام صاحبؒ کے گھر کے دروازے ہی پر پہنچے تھے کہ اہل خانہ کے رونے کی آواز آئی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہو گیا ہے، یہی امام ابو یوسفؒ ہیں جن کے

بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے سترہ سال تک اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہوگیا تو تجہیز و تکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کے حوالہ کر کے درس میں شریک رہے اور درس سے محرومی کو گوارہ نہیں کیا۔ (مناقب مکی: ۱/۴۷۲)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیش گذرے ہیں، جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے اساتذہ میں ہیں، ان سے حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا، بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتیں، (سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۴۵۸) احمد بن یحییٰ شیبانی (۲۰۰-۲۹۱ھ) عربی لغت، ادب، گرامر اور قراءت وغیرہ کے بڑے نامی گرامی عالم تھے اور 'ثعلب' کے نام سے مشہور تھے، ان کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے کہ کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں، (الحث علی طلب العلم الخ للعسکری: ۷۷) امام ثعلبؒ کا معمول تھا کہ راستہ چلتے بھی ہاتھ میں کتاب رہتی اور مطالعہ کرتے جاتے، چنانچہ اسی طرح چل رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹکر دی، گڑھے میں گر پڑے اور ایسی چوٹ آئی کہ دوسرے ہی دن وفات ہوگئی (وفیات الاعیان لابن خلکان: ۱/۱۰۴)، اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہل علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ سن کر اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام ابن جریر طبریؒ بہت ہی بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انھوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳ ہزار اوراق میں ۲۸۳ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ء میں فارغ ہوئے، یہ دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، طبری کی یہ تفسیر ۱۱ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو یومیہ ۱۴ ورق یعنی ۲۸ صفحات کا اوسط ہوتا ہے۔

حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انھوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب

کیا گیا تو وہ سات سودرہم کی تھی، ابوریحان بیرونیؒ کی وفات کے وقت اس زمانہ کے مشہور فقیہ ابوالحسن ولوالجی گئے، بیرونیؒ نزع کی حالت میں تھے اور سینے میں گھٹن محسوس کررہے تھے، اس وقت انھوں نے علامہ ولوالجی سے ''جداتِ فاسدہ'' (نانی) کے حق میراث کا مسئلہ پوچھا، ولوالجی کو رحم آیا اور کہنے لگے کہ اس وقت بھی آپ کو فکر پڑی ہے؟ بیرونیؒ نے کہا کہ دنیا سے اس مسئلہ سے واقف ہوکر جانا بہتر ہے یا ناواقف رہ کر؟ والوالجی نے مسئلہ کی وضاحت کردی اور واپس ہوئے، کچھ دور آئے تھے کہ رونے دھونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ علامہ بیرونیؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔

وقت کی حفاظت کرنے والے بزرگوں میں علامہ ابن عقیلؒ بھی ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی سب سے اہم کتاب ''الفنون'' ہے، جس کے بارے میں بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی ۸سو جلدیں تھیں، اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر جارج مقدسی مستشرق نے دو جلدوں میں ۷۱-۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے، امام ابن جوزیؒ تاریخ اسلام کے بڑے مصنفین میں ہیں، وہ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے جو چاہتے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والوں سے بہت نالاں رہتے اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اسی طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسبِ ضرورت کاغذ کاٹتے جاتے، قلم تراش لیتے اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے، اس کا نتیجہ تھا کہ بقولِ حافظ ابن رجبؒ شاید ہی کوئی فن ہو جس میں ابن جوزیؒ کی کوئی کتاب نہ ہو، ابن جوزیؒ کی تصنیفات پانچ سو سے اوپر ہیں اور ان میں سے بعض بیس جلدوں اور بعض دس جلدوں پر مشتمل ہیں، ابن جوزیؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے جن قلموں سے حدیثیں تحریر کی تھیں، ان کے ڈھیر سارے تراشے جمع ہوگئے تھے، انھوں نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے غسل کا پانی اسی سے گرم کیا جائے، چنانچہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی قلم کے تراشے بچے رہے۔

مشہور مفسر اور صاحبِ نظر امام رازیؒ کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہوجاتا ہے، مشہور محدث علامہ منذریؒ کے صاحبزادے رشید الدین

(م:۶۴۳) کا انتقال ہوگیا، جوان کو بہت محبوب تھے تو اپنے جواں مرد بیٹے کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی، مدرسہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالے کر کے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔

امام نوویؒ جیسے محدث اور صاحبِ علم سے کون ناواقف ہوگا، راستہ چلتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، اس کا نتیجہ ہے کہ صرف ۴۵ سال کی عمر پائی، لیکن ہزار ہا ہزار صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہل علم کے لئے حرزِ جاں ہیں، ابن النفیس میڈیکل سائنس کی یادگار شخصیتوں میں ہیں، جسم میں دورانِ خون کا نظام سب سے پہلے آپ ہی نے دریافت کیا، طب میں آپ کی کتاب ''الشامل'' تقریباً ۳۰ جلدوں میں ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا حال یہ تھا کہ سفر وحضر اور صحت و بیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے ان کی تصنیفات کی تعداد پر جو رسالہ لکھا ہے وہ خود ۲۲ صفحات کا ہے، اخیر دور کے اہل علم میں علامہ شوکانیؒ کا حال یہ تھا کہ روزانہ دس اسباق پڑھاتے، فتاویٰ بھی لکھتے، فریضۂ قضاء بھی انجام دیتے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سو چودہ اہم تصنیفات آپ کی یادگار ہیں، علامہ شہاب الدین آلوسیؒ (۱۲۱۷-۱۲۷۰) کا حال یہ تھا کہ روزانہ چوبیس اسباق پڑھاتے، افتاء کا کام بھی کرتے اور اس کے ساتھ انھوں نے روح المعانی کے نام سے ایسی عظیم الشان اور مبسوط تفسیر لکھی ہے جس کی پورے عالم نے داد دی ہے۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے صرف ۳۹ سال کی عمر پائی، لیکن ان کی تصانیف ۱۱۰ سے بھی زیادہ ہیں اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے، مولانا عبدالحی حسنیؒ نے ''**الثقافة الاسلامية في الهند**'' مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ نے ''علماء سلف'' اور مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اپنی نہایت اہم اور فاضلانہ تصنیف ''**قيمة الزمن عند العلماء**'' میں سلفِ صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات لکھے ہیں۔

۶؍جنوری ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

باہمی اختلاف اور سماج کی ذمہ داری

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا، بولتا اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لئے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش اور بے زبان رہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں، اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد اور خودغرضی کی وجہ سے ہو، تو یہ مہذب اور شائستہ اختلافِ رائے کی حدوں سے گذر کر باہمی جنگ و جدال، تہمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی ہے، کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں، اور تیسرا وہ سماج اور معاشرہ جس میں اس طرح کی نزاع پیش آتی ہو، قرآن حکیم کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے طور پر اس فاصلہ کو سمیٹنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں تو دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دین دار، سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں اور ان کو اپنا ''حکم'' مان لیں، ان دونوں حکم کا فریضہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر حکم طرف

دار بنے بغیر نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں گے،''ان یریدا اصلاحا یؤفق اللہ بینھما ''(النساء:۳۵)، صلح اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ بھی ہے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے، وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حقائق کو قبول کرنے کی جرأت ہو اور اس کی نگاہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

تیسرا طبقہ جو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ ـــــ صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرا دیا کرو ''انما المؤمنون إخوۃ فأصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ''(الحجرات:۱۰)، یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادراک ہے اور نہ احساس۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ، صدقہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل چیز بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاحِ ذات البین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے (الادب المفرد، حدیث نمبر:۳۹۱)، ''مونڈ دینے والی چیز'' سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کر دینے اور تباہ و برباد کر دینے والی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان

کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس ولحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ ﷺ کو حد درجہ اہتمام تھا، عین میدانِ جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی اور مرضِ وفات میں بھی آپ ﷺ نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت باقی نہیں رہی تب بھی رفقاء کی مدد سے شریک جماعت ہونے کی کوشش فرمائی، لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لئے آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے آگے بڑھادیا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے (بخاری شریف: ۲۶۹)، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی۔

مدینہ منورہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست وگریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لئے ابرِ رحمت بن کر آیا، صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھائے نہ بجھتی تھی وہ لمحوں میں سرد ہوکر رہ گئی اور دونوں قبیلے اُخوتِ اسلامی کے رشتہ سے شیر وشکر ہوکر رہنے لگے، یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اوس وخزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا اور ان کی باہمی محبت کو دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا، چنانچہ اس نے اوس وخزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دیئے اور اس زمانے میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف جو اشعار کہے تھے، ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی، بہت تیز تیز تشریف لائے، لوگوں کو شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا، اسی موقع سے سورۂ آلِ عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں :

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم

پر اسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہئے، سب مل کر اللہ کی رسی کو
تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو اور اپنے اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس
میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے کرم
سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، تو
اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام
بتاتے رہتے ہیں، تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو۔ (آل عمران:۱۰۲-۱۰۳)

زبانِ مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی:۲۰/۴)

غرض، کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف و نزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنا لے گی اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کر کے رہے گا، اس لئے مسلمانوں میں جو "اربابِ حل وعقد" ہوں —— یعنی ذمہ دار، سمجھ دار، با اثر، اہل علم و دانش، علماء و مشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین —— نیز ملی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں اُبھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب و عوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عند اللہ وہ اس سلسلہ میں جوابدہ ہوں گے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ کم از کم ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے تعلیمی و اصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں یا مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اور اصلاحی تحریکیں ہیں، وہ سب اکثر اختلاف و انتشار سے دو چار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دو لخت بلکہ سہ لخت ہو چکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے اور پھر ان ٹکڑوں کی کئی ٹکڑیاں، یہ اختلاف و انتشار اور صلاحیتوں کا بٹوارہ بحیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کمزور اور بے اثر کر دیتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں

کی پسماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی بھی جمہوری ملک میں سیاسی احوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خاص کر اقلیتوں کے لئے ان کے ووٹ کی بڑی اہمیت ہے، اگر مسلمان سیاست کے ترازو میں بے وزن ہو جائیں تو اس ملک میں کوئی بھول کر بھی ان کو پوچھنے والا اور ان کی اَشک شوئی کرنے والا نہ ہوگا اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دوست دشمن سبھوں کو اقرار ہے، لیکن افسوس کہ مسلم جماعتوں کی باہمی آویزشوں اور اختلاف نے ان کو بے وزن کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے ان حالات میں سر برآوردہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف مسلم گروہوں اور افراد کی باہمی رقابتوں کا قابل قبول حل تلاش کریں، ان کو ایک میز پر جمع کریں اور ان کو اختلاف کے باوجود اتحاد پر آمادہ کریں، یہ وقت کا سب سے بڑا جہاد اور موجودہ حالات کی سب سے بڑی ضرورت ہے!

۳۰/ جون ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لبنان پر اسرائیل کے حملوں کا سلسلہ جاری ہے، معصوم بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے قتل عام کا بازار گرم ہے، خونِ مسلم کی ارزانی کا حال یہ ہے کہ شاید پینے کا پانی بھی اس سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوتا ہو، مغرب کی بے ضمیری، ناانصافی اور مجرمانہ خاموشی کی ایک نئی تاریخ رقم ہورہی ہے، اور اقوام متحدہ کے بارے میں یہ یقین بڑھتا جارہا ہے کہ یہ محض طاقتور ظالموں کی پشت پناہی کے لئے ہے، کمزوروں اور مظلوموں کے لئے اس کے کان بہرے ہیں اور زبان گُنگ ہے، عالم اسلام کی خاموشی بلکہ بے حمیتی ایسا افسوسناک منظر پیش کرتی ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے، حکومت وسلطنت اور مال ومتاع کی بڑھی ہوئی حرص وطمع نے ان کی غیرت کو سرد کردیا ہے، ان کے حالات فتنۂ تاتار کے زمانہ سے بھی بدتر ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ہر ملک اپنی باری کا منتظر ہے!

مصیبتیں انسان کو سبق سکھاتی اور بے راہ روی سے بچاتی ہیں، اس لئے عالم اسلام کو خصوصاً اور پوری اُمت اسلامیہ کو عموماً ان تازیانوں سے سبق حاصل کرنے اور چشم بصیرت وا کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ناکامی ونامرادی اور خسران ومحرومی کی یہ داستان طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی۔

ان حالات کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کو اپنی دفاعی قوت بڑھانے کی طرف توجہ دینی چاہئے، جس کو قرآن مجید میں ''اعداد'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون
به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم ، لا تعلمونهم ، الله
يعلمهم ، وما تنفقوا من شئ فى سبيل الله يوف إليكم وأنتم
لا تظلمون .(الأنفال:٦٠)

اور جہاں تک ممکن ہوان کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ طاقت اور
تیار گھوڑے مہیا رکھو، تا کہ اس کے ذریعہ اللہ کے اوراپنے دشمنوں کو
اور دوسرے ان لوگوں کو جن کوتم نہیں جانتے ،مگر اللہ جانتا ہے ،
مرعوب کرسکو، اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کروگے، اس کا پورا پورا
بدلہ دیا جائے گا اورتم پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ قوت جمع کرنے کی تلقین کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ طاقت کا مقصد یہ نہیں کہ انسان خواہ مخواہ دنگے ،فساد کی تلاش میں رہے، بلکہ اس کا مقصد اپنی ''قوت مرہبہ'' کو برقرار رکھنا ہے، جو دشمنوں کو جری ہونے سے روکے رکھے، اور بوقت ضرورت مدافعت کے کام آئے ،اسلام نے ہمیں بدامنی اور صلح جوئی کرنے والوں سے لڑائی کی تعلیم نہیں دی ، بلکہ اس سے منع کیا ہے، لیکن اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے کہ مسلمان اپنے لئے مظلومیت اور مقہوریت کا مستقل طور پر انتخاب کرلیں اور ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بھی لائق نہیں رہیں، کہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونا اس کا مذہبی فریضہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اورعرب کے ماحول میں میدانِ جنگ کا سب سے مؤثر ہتھیار ''تیر'' تھا، جس کے ذریعہ دور سے دشمن پر وار کیا جاسکتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ ؓ کو خاص طور پر اس کی مشق کرنے کی ترغیب دی، حضرت عقبہ بن عامر ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بار منبر پر ''وأعدوا لهم مااستطعتم من قوة '' کا ذکر کرتے ہوئے تین بار فرمایا کہ قوت تیراندازی ہے، '' ألا إن القوة الرمي '' ،(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۱۴، باب في الرمي) —— اسی طرح اس زمانہ میں کارزارِ جنگ کے لئے سب سے تیز اور مفید سواری گھوڑے کی تھی ، آپ نے گھوڑے کی پرورش اور گھوڑ دوڑ کی فضیلت بیان فرمائی اور اس کی حوصلہ افزائی کی ، (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر :۳۲۱/۲) —— آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غالبًا عرب میں سب سے پہلے ''منجنیق'' کا استعمال کیا، جس کے ذریعہ دور سے پتھر اور آگ پھینکی

جاسکتی تھی ، اور قلعہ کے باہر سے قلعہ کے اندر حملہ کیا جاسکتا تھا ، جنگ میں خندق کھودنے اور مدافعت میں اس سے فائدہ اُٹھانے کا طریقہ عرب میں مروج نہیں تھا ، اہل ایران جنگ میں اس تدبیر سے کام لیتے تھے ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر غزوۂ احزاب کے موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگی تدبیر کا استعمال کیا ، جس نے اہل مکہ کو حیرت میں ڈال کر رکھ دیا ، غزوۂ بنوثقیف کے موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی سواریوں کا استعمال کیا جس پر چمڑے کے ''ہودج'' بنے ہوئے تھے ، تاکہ قلعہ کی فصیل سے جو تیر برسائے جائیں وہ اس چرمی چھت میں گھپ کر رہ جائیں اور مسلمان فوجی قلعہ کی دیواروں تک پہنچ سکیں ، گویا یہ بکتر بند گاڑیاں تھیں ، جنھیں اس وقت استعمال کیا جارہا تھا ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ملکوں کو اپنی مدافعت وحفاظت کے لئے اپنے زمانہ کی اختراعات کے لحاظ سے جدید ہتھیار تیار کرنا چاہئے اور عصری ٹکنالوجی سے استفادہ کرنا چاہئے ، نیز ان میں طاقت کو ہضم کرنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہئے ، ایسا نہ ہو کہ یہ طاقت انھیں بدمست بنادے اور ظلم سے روکنے کے بجائے خود ظلم کرنے پر انھیں اُکسانے لگے ، افسوس کہ مسلم ممالک کا حال یہ ہے کہ عیش وعشرت کے تو ایک سے ایک نقشے ان کے یہاں موجود ہیں اور قدرتی وسائل سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے زندگی کے آرام و راحت کے ایک سے ایک سامان کر لئے ہیں ، لیکن ان میں سے اکثر ممالک کی دفاعی قوت اتنی معمولی اور حقیر ہے کہ انھیں ہمیشہ بڑی طاقتوں کے سامنے جھک ہی کر نہیں بچھ کر رہنا پڑتا ہے ، اور اگر کچھ طاقت فراہم ہوئی تو اکثر وہ برادر کشی ہی میں خرچ ہوجاتی ہے ، جسکی بدترین مثال عراق کی صدام حکومت تھی ، کہ جو کچھ طاقت حاصل کی اسے ایران ، کویت ، اور اپنے ہی ملک کی عوام کے خلاف طاقت آزمائی میں صرف کر کے رکھ دیا اور عالم عرب پر امریکہ جیسے فرعون کا عذاب مسلط کردیا ، کاش ! ہمارے عرب ممالک میں خوبصورت اور بے غبار سڑکیں ، بلند وبالا اور درخشاں عمارتیں ، جاذب نظر باغات اور تفریح گاہیں نہ ہوتیں ، لیکن وہ ایسی طاقت کے مالک ہوتے کہ دشمن ان کی طرف نگاہ اُٹھانے سے ڈرتے ، مگر افسوس کہ اپنی عاقبت نا

اندیشی، اقتدار کی ہوس اور مادی حرص وطمع کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں کے لئے ایک لقمۂ تر سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔

دوسری ضروری بات جس کی طرف عالم اسلام کو توجہ دینی چاہئے وہ یہودی اور عیسائی طاقتوں پر اعتماد کرنے سے گریز کرنا اور انھیں اپنا راز دار بنانے سے بچنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گروہ کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے میں نہیں چوکتے ہیں، تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے، وہی ان کو محبوب ہے، ان کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ ان کے سینوں نے چھپا رکھا ہے، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، ہم نے تمہارے لئے واضح طور پر احکام بیان کر دیئے ہیں، اگر تم سمجھ داری سے کام لو۔ (آل عمران:۱۱۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے اجتماعی اور قومی زندگی کا ایک بنیادی اُصول ذکر فرمادیا ہے کہ مسلمانوں کو روا نہیں کہ وہ دشمنوں کو اپنا راز دار بنائیں، حساس مسائل میں ان سے مشورے کریں اور اپنی دفاع کی ذمہ داری ان کے حوالہ کریں، **یفاوضونهم في الآراء ويسندون اليهم أمورهم**، (تفسیر قرطبی :۱۷۸/۴) —— حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے سرکاری دستاویزات کے لکھنے پر ایک غیر مسلم عیسائی کو مامور کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہی آیت تلاوت فرمائی، خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیرہ کے ایک عیسائی شخص کے بارے میں مشورہ دیا گیا کہ اسے سرکاری مراسلت کا ذمہ دار بنایا جائے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کو چھوڑ کر اس شخص کو ہم راز نہیں بنا سکتا، "**لا آخذ بطانة من دون المؤمنين**"، (حوالۂ سابق) ان احکام کا مقصد تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے، بلکہ اپنی حفاظت ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دل ودماغ پر مغربی طاقتوں کا ایسا سحر مسلط ہے کہ انھوں نے اپنے دماغ،

اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسی، یہاں تک کہ اپنی اقتصادی پالیسی کو بھی مغرب کے ہاتھوں فروخت کر رکھا ہے، سارے اہم فیصلے امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے اشارہ پر کئے جاتے ہیں، ملک کی کوئی چیز یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے راز نہیں ہے، جس ملک کی ہر چھوٹی بڑی بات سے اس کا دشمن واقف ہو، وہ کیسے اپنے آپ کو اپنے دشمنوں سے بچا سکتا ہے؟

روس کے بکھرنے اور پانچ مسلمان جمہوریاؤں کے وجود میں آنے کے بعد مسلمان ملکوں کے لئے ایک سنہرا موقع موجود تھا کہ وہ ان مسلمان سائنس دانوں کو اپنے یہاں اعزاز و اکرام کے ساتھ پناہ دیتے، ان سے اسلحہ سازی کی جدید ٹکنالوجی حاصل کرتے، اور اپنی دفاعی قوت کو آگے بڑھاتے، لیکن مغرب کے دباؤ، اس پر انحصار، بصیرت اور قوت فیصلہ سے محرومی اور وقتی مادی آسائش پر قناعت کی وجہ سے انھوں نے اس زریں موقع کو بھی کھو دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کی باہمی خلش اور ایک دوسرے کے ساتھ بغض وعناد کا ہے، عالم اسلام چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم ہے، ان میں جغرافیائی فاصلے تو بہت معمولی ہیں، لیکن دلوں کے فاصلے اتنے طویل ہیں کہ انھیں پاٹنا دشوار ہے، کم سے کم عالم عرب کے مسلمانوں ہی نے اپنی ایک سیاسی یا دفاعی وحدت قائم کر لی ہوتی، تو آج اسرائیل کے سیل رواں کے سامنے انھیں خس و خاشاک بن کر رہنا نہیں پڑتا، مگر افسوس کہ برے حالات بھی انھیں متحد نہیں کر پاتے اور وطن و نسل کے بتوں کی پرستاری سے انھیں نجات نہیں مل پاتی، ان نامساعد حالات میں جو لوگ ان ظالموں سے برسرپیکار ہیں اور اپنے خون و لہو کا نذرانہ دے کر ان کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ نہایت ہی قابل تحسین ہیں، سلام ہو ان پر اور ان کے جوان حوصلوں پر!!

۴ر اگست ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

جوش کے ساتھ ہوش

سیرت میں ایک اہم واقعہ غزوۂ بنومصطلق کے نام سے آیا ہے، بنومصطلق قبیلۂ بنو خزاعہ کی ایک شاخ تھی، یہ 'مریسیع' نامی مقام پر آباد تھے، جو مدینہ منورہ سے نو منزل کے فاصلہ پر واقع تھا، حارث بن ابی ضرار اس قبیلہ کی قیادت کرتا تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے کا واقعہ ہے کہ اس قبیلہ نے مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوگئی، آپ ﷺ نے مزید تحقیق کے لئے اپنے ایک نمائندہ کو بھیجا، انھوں نے یہاں آ کر تحقیق حال کیا اور اس خبر کی تصدیق ہوئی، اس پس منظر میں یہ بات ضروری محسوس ہوئی کہ مسلمانوں کو اس قریبی دشمن سے محفوظ رکھا جائے اور حملہ کرکے ان کو مطیع بنایا جائے، چنانچہ مدینہ منورہ سے ایک فوج روانہ ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس میں شریک تھے۔

قبیلہ کے اکثر لوگوں کو تو مجاہدین کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور انھوں نے راہِ فرار اختیار کی، مگر کچھ تیراندازوں نے جم کر تیر برسائے، بہت سے لوگ قید ہوئے، ان ہی قیدیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو قبیلہ کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، ان کے مقام و مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے خود ان کی خواہش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اپنے نکاح میں لے آئے اور اس طرح یہ سعادت بخش اسیری نے انھیں ''ام المومنین'' ہونے کا شرف بخشا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ ﷡ نے دفعتاً تمام اسیرانِ جنگ کو آزاد کردیا، کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرالی اعزہ کو کیوں کر اپنا غلام و باندی بنا کر رکھ سکتے ہیں؟ اور بالآخر یہی واقعہ ان کے قبول اسلام کا باعث ہوا۔

اس غزوہ کا ایک سبق آموز پہلو یہ ہے کہ جن منافقین نے غزوۂ احد جیسے نازک موقعہ پر مسلمانوں کو اپنی پیٹھ دکھائی تھی، مخالف فوج کی کمزوری اور تعداد کی کمی کو دیکھتے ہوئے اور مالِ غنیمت کی طمع میں وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوگئے، ایک جگہ جب لوگوں نے پڑاؤ کیا،

تو پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور ایک انصاری میں معمولی سی لڑائی ہوگئی، حضرت عمرؓ کے غلام نے اپنی مدد کے لئے مہاجرین کو آواز دی، انصاری نے انصار کو پکارا، دونوں طرف سے لوگ جمع ہوگئے، منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی ایسے موقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس واقعہ کو اور بھی شہ دیا، اور انصار سے کہا کہ یہ سب تمہارا اپنا کیا ہوا ہے، تم نے مہاجرین کو اپنے یہاں پناہ دی، ان کو سہولتیں پہنچائیں اور اب ان کی جرأتیں اس قدر بڑھ گئی ہیں! ـــــ مہاجرین کے ساتھ تمہاری مثال عربی زبان کے اس محاورہ کی ہے کہ اپنے کتنے کو کھلا پلا کر موٹا کرو ـــــ کہ وہ تم ہی کو کاٹ کھائے، ''سمن کلبک یأکلک'' نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک طرح کی دل شکستگی پیدا ہوگئی، انصار چوں کہ عبداللہ بن ابی کے نفاق، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور اُمتِ مسلمہ سے اس کی خفیہ عداوت اور اندرونی عناد سے واقف نہیں تھے، اس لئے سادہ لوح لوگ اس کی چال کو سمجھ نہیں سکے، عبداللہ بن ابی نے یہ بھی کہا کہ اب مدینہ سے باعزت لوگ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

ایک نوعمر انصاری صحابی ـــــ جو اس کی ان زہرناک باتوں کو سن رہے تھے، ـــــ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری صورتِ حال بیان فرمائی، آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کو سمجھایا اور فرمایا کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور ابھی سے تم عصبیتِ جاہلیہ کی بات کرنے لگے ہو، پھر آپ ﷺ نے فون کو فوراً کوچ کرنے کا حکم دیا، حضرت عمرؓ کو جب واقعہ کی اطلاع ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ کسی کو حکم دیا جائے کہ اس منافق کی گردن اتار لائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے رفقاء کو بھی قتل کرانے لگے ہیں؟ یعنی لوگ عبداللہ بن ابی کے نفاق سے واقف نہیں ہیں، اگر ان کے قتل کا حکم دیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اب خود اپنے اصحاب کے قتل کا حکم دے رہے ہیں، حضرت عمرؓ خاموش ہوگئے۔

فوج نے کوچ کیا، معمولِ مبارک یہ تھا کہ صبح کو سفر شروع ہوتا تو شام میں کہیں پڑاؤ کیا

جاتا اور رات بھر آرام کرنے کے بعد صبح میں دوبارہ سفر شروع کیا جاتا اور شام میں سفر شروع ہوتا تو رات بھر سفر کر کے صبح دم کسی منزل پر توقف کیا جاتا، لیکن خلافِ معمول آج دن بھر اور رات بھر سفر جاری رہا، پھر اگلی صبح بھی پڑاؤ نہیں کیا گیا، یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی، اب آپ ﷺ نے ایک مقام پر فوج کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا، ابن ہشام اور دوسرے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ سفر کی درازی اور اس کی مشقت لوگوں کو تھکا دے، مہاجرین و انصار کے درمیان جو تلخی پیدا ہوگئی تھی، وہ ذہن سے محو ہو جائے اور لوگ اس قدر تھک جائیں کہ آرام اور ضروریات کی فکر کریں۔

اس کے بعد دو عجیب واقعے پیش آئے، ایک یہ کہ مدینہ کے قریب پہنچ کر عبداللہ بن ابی کے صاحبزادہ جو مخلص مسلمان تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس وقت تک اپنے والد کو مدینہ میں داخل ہونے سے روک دیا، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دے دیں، یہ عبداللہ بن ابی کی اس بات کا جواب تھا کہ مدینہ کے باعزت لوگ ذلیل و کمتر لوگوں کو نکال باہر کریں گے، ظاہر ہے کہ ذلیل و کمتر سے اس منافق کی مراد مسلمان اور خاص کر مہاجرین سے تھی۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم صادر کرنے والے ہیں، انصار بھی عام طور پر اس کے نفاق سے واقف ہو چکے تھے، اسی دوران عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: سنا ہے کہ آپ میرے والد کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، اگر آپ یہ حکم دیں تو بے جا نہیں ہوگا، لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور میں ان کے قاتل کو دیکھ نہیں سکتا، پھر یہ بات اچھی نہیں ہوگی کہ ایک کافر کی وجہ سے ایک مسلمان کا قتل ہو، اس لئے اگر آپ واقعی ایسا حکم دینے والے ہیں، تو مجھے حکم فرمائیں، میں اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، جب تک کوئی شخص بظاہر مسلمان ہوگا، میں اس کے ساتھ مسلمان کا سا ہی معاملہ کروں گا، بلکہ میں تو عبداللہ بن ابی کے ساتھ حسن سلوک کروں گا۔

پھر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا کہ اگر اُس وقت عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دیا جاتا تو حضراتِ انصار کے دل میں خلش ہو سکتی تھی، وہ سمجھتے کہ ہمارے سردار کو قتل کرا دیا گیا ہے، لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود ان کے صاحبزادے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نے جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں میری رائے سے زیادہ برکت ہے، **لقد واللہ علمت لأمر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أعظم برکة من أمری**۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۱۵۸/۴)

سیرتِ نبوی ﷺ کے اس اہم واقعہ کی روشنی میں جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جوش کے ساتھ ہوش اور جرأت کے ساتھ حکمت کا امتزاج ضروری ہے، عواقب ونتائج کو سوچے اور انجام پر نظر رکھے بغیر وقتی جوش اور جذبات کی بنا پر کوئی قدم اٹھانا مفید سے زیادہ مضر ہوتا ہے اور افراد واشخاص اور اقوام وملل کو بدانجامی کی طرف لے جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے، مکہ میں آپ ﷺ تیرہ سال رہے اور مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، ایسے وقت میں آدمی سوچتا ہے کہ بار بار مرنے سے ایک بار مر جانا بہتر ہے، اس لئے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم جہاد کی اجازت کے ملتجی ہوتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی، صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیر مسلمان ہو کر آئے تو آپ نے معاہدہ کے مطابق انھیں واپس کر دیا، انھوں نے اہل مکہ کے نمائندہ کو کیفر کردار تک پہنچایا اور ایک کا تعاقب کرتے ہوئے مدینہ آپہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اپنا وعدہ پورا کر چکے ہیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پھر واپس کیا اور خفگی کا اظہار بھی فرمایا کہ تم جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہو۔

صلح حدیبیہ کے موقع سے چودہ سو جانباز آپ ﷺ کے ساتھ تھے، یہ وہ لوگ تھے جنھیں خدا کے راہ میں جان دینا جان بچانے سے زیادہ عزیز تھا، لیکن آپ ﷺ نے اہل مکہ کی شرطوں پر ان سے معاہدہ فرمایا، حالاں کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اسے اپنی ہزیمت سمجھ رہے تھے اور انھوں نے اس صلح کو محض آپ ﷺ کی اطاعت میں قبول کیا تھا، ورنہ دل اس پر آمادہ نہیں تھا، صلح

حدیبیہ ہی کے موقع پر چالیس مشرکین مکہ کے ایک جھنڈ نے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا، مسلمانوں نے انھیں گرفتار کرلیا، لیکن آپ ﷺ نے انھیں یوں ہی رہا کردیا کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مسلمانوں نے حرم کے احترام کو بھی پامال کرنا شروع کردیا ہے اور اس طرح یہ عربوں میں اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا باعث نہ بنے۔

اس لئے حیاتِ محمدی ﷺ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا کام محض جوش و جذباتیت پر مبنی نہ ہو، وہ کس قدر بھی مظلوم وستم رسیدہ ہوں اور ان کے حالات کتنے ہی ناگفتہ ہوں، فراستِ ایمانی اور حکمتِ نبوی ﷺ کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے، وہ دنیا میں ہدایت کا مینار اور روشنی کا چراغ ہیں، کفر کی ظلمتیں اور اندھیرے ان سے برسرپیکار ہیں اور وہ انھیں ہر سطح پر نہ صرف مظلوم بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ انھیں ذلیل ورسوا بھی کرنے کے درپے ہیں، ایسی صورت میں ہماری انفرادی اور اجتماعی ناعاقبت اندیشی غیر معمولی نقصانات کا باعث بن سکتی ہے، دشمن کی طاقت، اس کے عزائم، اس کے مزاج اور اپنی صلاحیت وقوت کا اندازہ کئے بغیر جب ہم کوئی قدم اٹھائیں گے تو ہوسکتا ہے کہ ہم دو چار افراد کو گرفتار کرلیں، ۲۵، ۵۰ کو قتل کردیں، لیکن یہی اقدام اُمت کی بہت سی عورتوں کے سہاگ لٹ جانے، بچوں کے یتیم ہونے، نوجوانوں کے زندگی سے محروم ہونے اور چند اشخاص کے لئے پورے ملک کے تباہ وبرباد کردیئے جانے کا باعث ہو، ایسے مواقع کے لئے سیرتِ نبوی ﷺ کے کس پہلو کو اسوہ بنانا مناسب ہوگا یہ اہل علم ودانش اور اصحابِ فکر ونظر کے سوچنے کی بات ہے!

۱۱/اگست ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

حق کی طرف ہجرت

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی نبوت ورسالت کے لئے رسول اللہ ﷺ کا انتخاب فرمایا اور آپ ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت عطا کی، اسی طرح آپ ﷺ کی صحبت اور رفاقت کے لئے اپنے عہد کی نہایت ہی برگزیدہ شخصیتوں کو چنا، انھوں نے حق کے لئے ایسی قربانیاں دیں اور اپنے نبی کے سامنے ایسی خودسپردگی اختیار کی کہ مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، یہ سب کے سب کوکب وانجم ہیں، جن کی زندگی انسانیت کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان ہی میں ایک حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضور ﷺ ان سے بہت محبت فرماتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم ان کو رشک وتوقیر کی نظر سے دیکھتے تھے، جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو وہ پہلے سے مدینہ میں موجود تھے، اس لئے انصار انھیں اپنے میں شمار کرتے تھے، لیکن ان کی پیدائش مدینہ کی نہیں تھی، وہ حق کی تلاش میں فارس سے نکلے اور مختلف منزلوں سے گذرتے ہوئے مدینہ میں خیمہ زن ہوگئے، اس حیثیت سے مہاجرین اور انصار میں بحث چھڑ گئی اور دونوں انھیں اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے اس اختلاف کو یوں ختم کیا اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مرتبہ ومقام کو اونچا اٹھایا کہ ارشاد فرمایا: سلمان ہم میں سے، یعنی اہل بیت میں سے ہے، ’’سلمان منا أهل البيت ‘‘۔
(کنز العمال، حدیث نمبر: ۳۳۳۴۰)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے تلاشِ حق کے جذبۂ بے پایاں کی بناء پر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ان کا بڑا اکرام فرماتے تھے، تلاشِ حق کا یہ سفر انھوں نے کیوں کر طے کیا؟ یہ خود ان کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک فارسی النسل نوجوان تھا، اور اصبہان کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا، میرے والد اس گاؤں کے سردار بھی تھے، سب سے بلند مرتبہ شخص بھی سمجھے جاتے تھے، اور سب سے زیادہ صاحبِ ثروت بھی تھے، جب سے میں پیدا ہوا،

میں اپنے والد کو سب سے زیادہ محبوب تھا، جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے، ان کی محبت بھی بڑھتی جاتی تھی، وہ مجھے گھر سے باہر جانے نہیں دیتے تھے، اور نوجوان لڑکیوں کی طرح میری نگہداشت کرتے تھے، میں نے اپنے آبائی مذہب آتش پرستی میں خوب کمال حاصل کیا، یہاں تک کہ مجھے آتش کدہ پر ذمہ دار مقرر کر دیا گیا اور اس کی نگرانی سونپی گئی، کہ دن ورات میں کسی بھی وقت یہ آگ بجھنے نہ پائے، میرے والد کی بڑی زراعت تھی، جس سے بڑی مقدار میں غلہ حاصل ہوتا اور وہی کاشت کی دیکھ بھال کرتے، پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ ایک مشغولیت کی وجہ سے کھیت کی طرف نہیں جا سکے، اور مجھے حکم دیا کہ میں جا کر دیکھ بھال کروں، کچھ ہی راستہ طے ہوا تھا کہ میرا گذر عیسائیوں کے ایک چرچ پر ہوا، وہ وہاں عبادت کر رہے تھے، میں نے ان کی آواز سنی اور اس آواز نے میری توجہ گرجا کی طرف موڑ دی۔

مجھے عیسائیت کے مذہب یا کسی اور مذہب کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، کیوں کہ میرے والد نے مجھے ہمیشہ لوگوں کے ساتھ میل جول سے بچایا تھا، میں نے جب یہ آواز سنی تو اندر داخل ہوا، میں نے جو غور سے دیکھا تو ان کا طریقۂ عبادت مجھے پسند آیا، اور ان کا دین مجھے بھانے لگا، میں نے کہا: خدا کی قسم! یہ اس دین سے بہتر ہے جس کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے، میں سورج ڈوبنے تک وہیں رکا رہا اور اپنے کھیت کی طرف گیا تک نہیں، پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس دین کا مرکز کہاں ہے؟ ان لوگوں نے بتایا: شام میں، جب رات ہوئی تو میں گھر واپس ہوا، والد نے مجھ سے دن بھر کی رپورٹ طلب کی، میں نے انھیں تفصیل بتائی، میرے والد میرے اس عمل سے گھبرا گئے، اور کہنے لگے: بیٹے! اس دین میں خیر نہیں، تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا دین اس سے بہتر ہے، میرے والد میری بات سے ڈر گئے، انھیں خوف محسوس ہوا کہ میں کہیں اپنے دین سے پھر نہ جاؤں، انھوں نے مجھے گھر میں قید کر دیا اور میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی۔

مجھے کچھ فرصت میسر آئی، تو میں نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ جب کوئی قافلہ ملکِ شام جا رہا ہو تو مجھ کو خبر کر دیں، ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ شام جانے والا ایک قافلہ وہاں اترا اور انھوں نے مجھے اطلاع دی، میں نے کوشش کر کے اپنی بیڑی کھول دی، اور چھپ کر ان کے ساتھ

نکل چلا، شام پہنچ کر میں نے معلوم کیا کہ عیسائی مذہب کا سب سے بڑا شخص کون ہے؟ ان لوگوں نے کہا: چرچ کا نگراں اُسقف ، میں ان کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں، اور خواہش رکھتا ہوں میں آپ کی خدمت کروں، آپ سے علم حاصل کروں اور آپ کے ساتھ عبادت کروں، اس نے اجازت دے دی اور میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔

کچھ ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بہت ہی خراب آدمی ہے، اپنی پیروی کرنے والوں کو صدقہ کرنے حکم دیتا اور اس پر اجر وثواب کی خوشخبری سناتا ہے، لیکن جب لوگ اسے کچھ دیتے ہیں کہ وہ انھیں اللہ کے راستہ میں خرچ کرے تو اس کو اپنے لئے محفوظ کر لیتا ہے اور فقراء و مساکین کو کچھ نہیں دیتا، یہاں تک کہ اس شخص نے سونے کے سات مٹکے جمع کر لئے تھے، اس کی کیفیت دیکھ کر مجھے اس سے سخت نفرت ہوگئی ، پھر کچھ ہی دنوں بعد اس کی وفات ہوگئی ، عیسائی حضرات ان کو دفن کرنے کے لئے جمع ہوگئے تو میں نے کہا: کہ تمہارے یہ بزرگ بدترین آدمی تھے، تم کو تو صدقہ کرنے کی تلقین کرتے تھے اور اس کا اجر کا بیان کرتے تھے اور جب لوگ صدقہ دیتے تھے تو اسے اپنے لئے محفوظ کر لیتے تھے اور غریبوں کو کچھ نہیں دیتے تھے، لوگوں نے پوچھا: تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ میں نے کہا کہ میں تمہیں اس کا خزانہ بتا سکتا ہوں، میں نے انھیں وہ جگہ دکھادی، لوگوں نے اس میں سے دفینہ نکالا ، تو سات مٹکے سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے تھے، لوگ کہنے لگے کہ ایسے شخص کو ہم دفن نہیں کریں گے، پھر انھوں نے اسے سولی پر چڑھایا اور سنگسار کردیا۔

کچھ دنوں بعد عیسائیوں نے اس کی جگہ ایک اور شخص کو مقرر کیا، میں نے ان کا ساتھ پکڑا، میں نے اس شخص سے زیادہ دنیا سے بے رغبت ، آخرت کی رغبت رکھنے والا اور شب و روز عبادت میں لگا رہنے والا شخص نہیں دیکھا، میں نے اس شخص سے ٹوٹ کر محبت کی، اور ایک زمانہ تک ان کے ساتھ رہا، جب ان کی وفات کا وقت آیا، تو میں نے عرض کیا: اے فلاں شخص ! آپ مجھے اپنے بعد کس کے ساتھ رہنے کی نصیحت کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: میرے بیٹے ! میرے علم کے مطابق میرے طریقہ پر موصل میں ایک شخص ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں کی ہے، تم ان کے پاس چلے جانا۔

ان کی وفات کے بعد میں ان صاحب کے پاس آیا، ان سے اپنی کہانی سنائی اور ان بزرگ نے جو نصیحت کی تھی، وہ بھی بتائی، ان صاحب نے بھی اپنے پاس رہنے کی اجازت دی، یہ بھی بہتر آدمی تھے، میں ان کی وفات تک ان کے ساتھ رہا، اور پھر ان سے بھی یہی دریافت کیا کہ آئندہ میں کس کے ساتھ رہوں گا؟ کہنے لگے کہ بس ایک شخص کو میں جانتا ہوں، تم ان کے پاس چلے جانا، میں ان کی وصیت کے مطابق ان صاحب کے پاس پہنچا، ان کو بھی میں نے بہتر طریقہ پر پایا، پھر ان کی وفات کے بعد ان کی ہدایت کے مطابق ''عمودیہ'' کے ایک راہب کے پاس آ گیا، اور ان کی اجازت سے ان کے ساتھ رہنے لگا، وہ بھی ان ہی بزرگوں کے نقش قدم پر تھے، میں نے ان کے پاس رہتے ہوئے کچھ گائے اور بکریاں بھی حاصل کر لیں، یہاں تک کہ ان کی وفات کا وقت آ گیا۔

میں نے ان سے بھی دریافت کیا کہ آئندہ میں کس سے صحبت اختیار کروں؟ انھوں نے فرمایا: اے بیٹے! اب روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس دین کو صحیح طور پر تھامے ہوا ہو جس پر تم لوگ تھے، لیکن وہ زمانہ آ چکا ہے، جس میں سرزمین عرب میں ایک نبی کا ظہور ہوگا، جو دین ابراہیمی کو لے کر بھیجے جائیں گے، وہ اپنے وطن سے ایک سرزمین کو ہجرت کریں گے، جہاں کھجور کے باغات ہوں گے اور جو دو سیاہ پتھریلے علاقہ کے درمیان واقع ہوگی، اس کی علامتیں بہت واضح ہیں، وہ ہدیہ کھائیں گے، صدقہ نہیں کھائیں گے، ان کے مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی، اگر ہو سکے تو تم اس شہر میں جا پہنچو۔

ان بزرگ کی وفات کے بعد میں ایک عرصہ تک ''عمودیہ'' میں مقیم رہا، یہاں تک کہ قبیلۂ کلب کے عرب تاجروں کا ایک قافلہ یہاں سے گذرا، میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر تم مجھے اپنے ساتھ سرزمین عرب لیتے چلو، تو میں اپنی یہ گائیں اور بکریاں تمہیں دے دوں، انھوں نے آمادگی ظاہر کی، یہاں تک کہ جب ہم وادئ قریٰ میں پہنچے تو ان لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا اور مجھے ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا، میں ان کی خدمت میں لگا رہا، پھر ان کا ایک چچازاد بھائی جس کا تعلق قبیلۂ بنوقریظہ سے تھا، ملاقات کے لئے آیا اور اس نے مجھے ان سے خرید لیا اور اپنے ساتھ ''یثرب'' (مدینہ منورہ) لے گیا، میں نے دیکھا کہ عمودیہ کے

بزرگ نے کھجور کے جن باغات کا ذکر کیا تھا، وہ یہاں موجود ہیں، اور میں نے محسوس کیا کہ یہ وہی شہر ہے جہاں ظاہر ہونے والے نبی کی ہجرت کرنے کی پیشین گوئی ہے، رسول اللہ ﷺ اس وقت مکہ میں اپنی قوم کو دعوت دے رہے تھے، لیکن بارِ غلامی کی وجہ سے میرے ساتھ جو مشغولیات تھیں، اس کی وجہ سے میں اس کا کوئی تذکرہ سن نہیں پایا تھا۔

کچھ ہی دن گذرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی، میں اس وقت کھجور کے درحت پر چڑھا ہوا تھا اور میرا آقا نیچے بیٹھا ہوا تھا، کہ اس کا چچازاد بھائی آیا اور کہنے لگا: بنو قبیلہ یعنی اوس وخزرج کے قبائل کو اللہ ہلاک کرے! یہ لوگ بھی قباء میں مکہ سے آئے ہوئے ایک شخص کے پاس جمع ہیں، جس کا گمان ہے کہ وہ نبی ہے، یہ سنتے ہی مجھ پر ایسی کیفیت ہوئی کہ گویا مجھے بخار آ گیا، اور میں کانپ اٹھا، مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں میں اپنے آقا پر گر نہ پڑوں، میں جلدی جلدی درخت سے اترنے لگا اور اس شخص سے کہنے لگا: تم نے کیا خبر دی ہے، ذرا مجھے دوبارہ سناؤ، میرا مالک ناراض ہو گیا اور مجھے ایک چپت رسید کی اور کہا: کہ تمہیں اس سے کیا غرض؟ تم اپنے کام میں لگے رہو۔

شام ہوئی تو میں نے کچھ کھجور اکٹھا کئے، جہاں رسول اللہ ﷺ کی آمد کی خبر تھی، وہاں چلا اور خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا: مجھے خبر ملی ہے کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں اور آپ کے رفقاء غریب الوطن اور ضرورت مند ہیں، میرے پاس کچھ کھجوریں صدقہ کی تھیں، میں نے سوچا کہ آپ دوسرے لوگوں سے زیادہ اس کے مستحق ہیں، پھر میں نے کھجور پیش کی، آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سے فرمایا: تم لوگ کھالو اور خود اپنا ہاتھ کھانے سے روک لیا، میں نے دل ہی دل میں کہا: یہ ایک علامت ہوئی، میں واپس آ گیا اور کچھ کھجوریں جمع کرنے لگا، جب آپ ﷺ قباء سے مدینہ آئے، تو خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں نے دیکھا کہ آپ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، لہٰذا اب یہ ہدیہ پیش خدمت ہے، آپ ﷺ نے اس میں سے خود بھی تناول فرمایا اور رفقاء کو بھی کھلایا، میں نے اپنے دل میں کہا: یہ دوسری علامت مل گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک دن آپ ﷺ نے کسی جاں نثار کو جنت البقیع میں دفن کر رہے تھے،

میں نے دیکھا آپ ﷺ بیٹھے ہوئے ہیں اور تن مبارک پر دو چادریں ہیں، میں نے سلام کیا اور آپ ﷺ کی پشت کی طرف نظر دوڑانے لگا؛ تاکہ وہ مہر نبوت دیکھ سکوں جو ''عمودیہ'' میں میرے مربی نے مجھ سے بیان کیا تھا، جب حضور ﷺ نے میرے تجسس کو دیکھا، تو میرے مقصد کو بھانپ لیا اور پشتِ مبارک سے چادر ہٹادی، میں نے مہر نبوت دیکھا اور سمجھ گیا آپ ﷺ ہی نبی آخرالزمان ہیں، میں اس کو بوسہ دینے اور رونے لگا۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا قصہ ہے؟ میں نے اپنی کہانی سنائی، آپ ﷺ خوش ہوئے، آپ ﷺ نے چاہا کہ آپ ﷺ کے رفقاء بھی تلاشِ حق کی اس داستان کو سن لیں، میں نے انھیں بھی سنایا اور سب کے سب بہت مسرور وشادماں ہوئے، یہ باطل سے حق اور کفر سے ایمان کی طرف تلاشِ حق کے پرصعوبت سفر کی ایک کہانی ہے، جو دل میں متاعِ ایمان کی قدر و قیمت بڑھاتی اور عزیمت و استقامت کے جذبہ کو مہمیز کرتی ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کفر سے اسلام تک پہنچنے میں کتنے کوچوں میں آبلہ پائی کی؟ کیسی کیسی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گذرے؟ یہاں تک کہ غلامی کے طوق کو بھی گوارا کیا، اور ایک نامعلوم منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ طلبِ صادق اور جذبۂ بیکراں کی بدولت اپنی منزلِ مقصود کو حاصل کر کے رہے، لیکن اس داستان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب وہ ایمان کے دائرہ میں آئے، تو ان کے ساتھ کس قدر توقیر اور پذیرائی کا معاملہ کیا گیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب جاں نثار تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی بے حد تکریم کرتے تھے، اسی تکریم و محبت کا نتیجہ تھا کہ مہاجرین انھیں مہاجر قرار دیتے تھے اور انصار انھیں انصاری کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''یہ ہمارے اہل بیت میں سے ہیں'' انھیں آزاد کرایا گیا اور جنگ فارس کے موقع سے ایک ایسی فوج پر انھیں امیر بنایا گیا جس میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی یہ کہانی موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت ہے، اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اور حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا سلوک تھا اور آج جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں، ہمارا ان کے ساتھ کیا رویہ ہوتا ہے؟ سب سے اہم مسئلہ

ان کی شادی بیاہ کا ہے، خاندانی مسلمان ان کے یہاں رشتہ کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس میں اپنے لئے ہتک محسوس کرتے ہیں، خود میرے علم میں کئی نومسلم احباب ہیں، جو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتہ کے لئے پریشان ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں جو خاندانی اعتبار سے برہمن ہیں، خوش شکل اور خوبصورت ہیں، مالی موقف بھی بہتر ہے، تعلیم یافتہ خاندان ہے اور لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، لیکن ان کی لڑکی کے لئے مناسب رشتہ نہیں مل رہا ہے اور ان کے غیر مسلم رشتہ دار لڑکی کو اپنانے کے لئے تیار ہیں، صرف ایمان پر استقامت اور دینِ حق کی سچی محبت انھیں اس پیشکش کو قبول کرنے سے باز رکھے ہوئی ہے، بعض ایسے رشتے رد کردیئے گئے، جن کے خاندان میں اوپر کوئی خاتون نومسلمہ تھی، ان حالات میں کس شخص کو ہمت ہوگی کہ وہ آپ کے مذہب میں داخل ہو اور آپ کی دعوت قبول کرے۔

یہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے نکاح کا پیغام دیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے سب سے بہتر فرد اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے معزز اور مکرم شخصیت کے حامل تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بہ خوشی اس رشتہ کو قبول کیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی صاحبزادی کے رشتہ کے لئے خواہش کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو کسی وجہ سے تأمل فرمایا، لیکن پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ وہ ان کی صاحبزادی سے نکاح کرلیں، لیکن حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے قبول نہیں کیا، (الجامع لأحکام القرآن: ۳۴۷/۱۶) یہی حال دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا، اسلامی اخوت کے جذبہ نے خاندانی تعصب اور تنگ نظری کو دبا دیا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کو تلقین فرمایا کہ کسی بھی مسلمان سے نکاح کرلیں، خواہ کوئی رومی ہو یا حبشی، (المغنی: ۴۸۰/۹) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا نکاح حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے کیا، (فتح القدیر: ۱۸۷/۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کوئی فرد یا خاندان اسلام قبول کرتا، تو سماج پوری طرح اسے اپنے اندر جذب کرلیتا، اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک چھوٹے خاندان

سے بڑے خاندان میں اور ایک کم محبت کرنے والے خاندان سے زیادہ محبت کرنے والے خاندان میں آ گیا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ نومسلم حضرات کی کفالت اور ان کا معاشی تعاون ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ اگر دلت طبقہ کا کوئی شخص اسلام قبول کرلے تو وہ ان رعایتوں سے محروم ہو جاتا ہے جو بحیثیتِ دلت انھیں حاصل تھیں، حالانکہ ہندوستان کے دستور میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کی گنجائش نہیں، لیکن اس معاملہ میں تفریق روا رکھی گئی ہے، دلت اگر ہندو ہو جائے، سکھ یا بودھ مذہب قبول کرلے تو اسے بعض مراعات حاصل ہوتی ہیں، لیکن اگر مسلمان یا عیسائی ہو جائے تو اسے ان مراعات سے محروم کر دیا جاتا ہے، یہ تو قانونی پہلو ہے، سماجی اعتبار سے بھی اسے بعض اوقات غیر معمولی مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ماں باپ اس سلسلہ میں بہت ہی تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اور انھیں گھر سے بے دخل کر دیتے ہیں، بعض دفعہ ان کو اپنے خاندان کے لوگوں سے جان اور جسمانی اذیت رسانی کا خطرہ پیش ہوتا ہے، اور انھیں وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے، بعض خانگی ملازمین کو غیر مسلم مالکان کی طرف سے ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے، یا ان کے پیسے روک لئے جاتے ہیں، ان حالات میں اگر مسلم سماج ان کا تعاون نہیں کرے، تو وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں، اور انھیں سخت معاشی امتحان سے گذرنا پڑتا ہے، اس کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس تگ و دو میں وہ دعوت کے کام کی طرف متوجہ نہیں رہ پاتے اور اپنے خاندان کے دوسرے بھائیوں کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی انھیں مہلت ہی نہیں ملتی، حالانکہ وہ اپنے سابق سماج میں زیادہ بہتر طور پر اشاعتِ حق کا کام کرسکتا ہے، اور انھیں گمراہی کی ظلمتوں سے نورِ ہدایت کی طرف لاسکتا ہے۔

قرآن مجید نے زکوۃ کا ایک مستقل مصرف ''مؤلفۃ القلوب'' کو رکھا ہے، (التوبہ: ۶۰) مؤلفۃ القلوب میں ایسے نومسلموں کو بھی شامل مانا گیا ہے جو پریشان حال ہوں، گو فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ مد باقی ہے یا ختم ہو چکی؟ لیکن بہر حال اس سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ نومسلم حضرات کے تعاون کی خاص اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کے

مد سے بھی ایسے لوگوں کا تعاون فرمایا ہے، اور اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ اسلام قبول کرنے والے لوگ اگر معاشی معیار کے اعتبار سے زکوۃ کے مستحق ہیں تو انھیں زکوٰۃ دی جانی چاہیے۔

مسلمان صاحبِ ثروت شخصیتوں، نیز اداروں اور تنظیموں کے لئے یہ نہایت ہی قابل توجہ مسئلہ ہے، اور ضروری ہے کہ وہ اپنے امدادی مدات کا کچھ حصہ اس کارِ خیر کے لئے مخصوص کریں، اگر ہم غیر مسلم بھائیوں کو ایمان کی دعوت دیں، کلمۂ خیر پڑھنے کے بعد خوشی کا اظہار کریں، مبارکباد دیں اور گلے لگائیں، لیکن ان کے مسائل کو حل نہ کریں، تو یہ ایک طرح کی منافقانہ دعوت ہوگی۔

اس سلسلہ میں ہمیں انصار کا کردار یاد رکھنا چاہیے، کس طرح انھوں نے مکہ سے ہجرت کرنے والوں کے لئے آنکھیں بچھائیں، دل ونگاہ کو فرشِ راہ کیا، اپنے گھر میں انھیں بسایا، اپنی زمین میں انھیں حصہ دار بنایا، ان کی لڑکیوں سے نکاح کیا اور اپنی لڑکیوں کو ان کے نکاح میں دیا، حقیقت یہ ہے کہ قبولِ اسلام بھی ہجرت کی ہی ایک قسم ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ حقیقی مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی باتوں سے اجتناب کرے، **"المهاجر من هجر ما نهى الله عنه"**، اور کفر سے زیادہ کوئی چیز لائقِ اجتناب نہیں، جو شخص کفر کو چھوڑتا ہے، وہ اس ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق حقیقی مہاجر ہے، بلکہ وطن اور اعزہ کو چھوڑنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنا عقیدہ و مذہب کو چھوڑنے اور ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرنے سے نسبتاً آسان ہے، اگر ان مہاجرین کے ساتھ خاندانی مسلمانوں کا رویہ انصار کا سا نہ ہو، تو دعوتِ اسلام کا کام فروغ نہیں پا سکتا، اور برادرانِ وطن سے اس بات کی امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ اجتماعی طور پر دین حق کی طرف آئیں، اسلام کی اشاعت ہجرت اور نصرت کے امتزاج سے متعلق ہے، اس جذبہ کے بغیر اس بات کی آرزو رکھنا کہ اس ملک میں ہدایت کی ہوا چلنے لگے اور اسلام کی اشاعت ہونے لگے، کھیت بوئے بغیر اناج کی اور درخت لگائے بغیر پھل کی امید رکھنا ہے!

۲۷/ اگست ۲۰۰۴ء و ۳/ ستمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

رمضان المبارک اور برادرانِ وطن

رمضان المبارک کا مہینہ ضبط نفس کی تربیت کا اور مواسات وغم گساری کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں ہمیں روزہ کا حکم دیا گیا ہے، نفل نمازوں کا اجر بتایا گیا ہے اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، پھر اس مواسات وغم خواری کے دائرہ کو محدود نہیں کیا گیا، گویا پوری انسانیت اس مہینہ کی نسبت سے حسن سلوک کی مستحق ہے، اس پس منظر میں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ماہِ مبارک میں برادرانِ وطن کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ورویہ ہونا چاہئے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو یا غیر مسلم انسانی اخوت کا رشتہ ہم سب کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے، کیوں کہ قرآن نے بہت ہی واضح تصور دیا ہے کہ پوری انسانیت کے ماں باپ حضرت آدم وحوا علیہم السلام ہی ہیں، گویا ہم سب ایک کنبہ کے افراد اور ایک خاندان کے ارکان ہیں، یہ رشتہ ہمیں برادرانِ وطن کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر رویہ کی راہ دکھاتا ہے، اس پس منظر میں ہمیں غور کرنا چاہئے کہ رمضان المبارک اور عید میں ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں کو کس طرح شریک کر سکتے ہیں؟

ہمارا عقیدہ ہے کہ ایمان ہی انسان کی نجات کا واحد راستہ ہے، جو لوگ ایمان سے محروم ہیں مرنے کے بعد انھیں اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا اور ایمان سے محرومی کی وجہ سے وہ ہمیشہ دوزخ کا ایندھن بنے رہیں گے، یہ دوزخ اتنی تکلیف دہ اور اذیت کے اسباب سے بھر پور ہوگی کہ دنیا میں اس کی ہولناکیوں اور وحشت انگیزیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور شرک ایسا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کریں گے، خدا کی شانِ کریمی کا دامن اتنا وسیع ہے اور اس کے عفو ودرگزر کا سایہ اس قدر دراز ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہ کو بھی معاف کر دیں گے، لیکن جیسے کوئی غیرت مند شوہر اپنی بیوی کی بدمزاجی، فضول خرچی، بدصورتی اور بدزبانی کو سہہ لیتا ہے، لیکن اس کی بدچلنی اور بدکرداری کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بات گوارہ نہیں

ہے کہ جن انسانوں کواس نے وجود بخشا ہے اور پل پل ان کی نعمتوں کے سہارے طرح طرح کی لذتوں اور راحتوں سے نفع اٹھا رہے ہیں وہ اپنے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرائے ، اس لئے شرک ایسا جرم عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے معاف نہیں فرمائیں گے۔

اس لئے انسانی ہمدردی کا سب سے بڑا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنے ان ہدایت نا آشنا بھائیوں تک حق کی روشنی پہنچانے کی کوشش کریں ، رمضان المبارک ہمارے لئے اس کا بہت بہتر موقع فراہم کرتا ہے ،اسی مہینہ میں آپ ﷺ پر قرآن مجید کے نازل ہونے کا آغاز ہوا ،اسی لئے نزولِ قرآن کی یادگار کے طور پر تراویح کی نماز رکھی گئی ،شبِ قدر کو بھی نزولِ قرآن ہی کی نسبت سے یہ بلند و بالا مقام حاصل ہے ،ہم اس ماہ میں انگریزی اور مقامی زبانوں میں قرآن مجید اور احادیث کا ترجمہ برادرانِ وطن تک پہنچانے کی کوشش کریں ،اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اکثر مقامی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا ہے ، پورے ہندوستان میں بیس کروڑ مسلمان کی تعداد مانی جائے اور ہر مسلمان رمضان میں اپنے ایک غیر مسلم بھائی کو کتاب الٰہی کا نسخہ دعوتی نقطۂ نظر سے پہنچا دے تو پانچ سال میں ملک کا کوئی غیر مسلم شہری ایسا باقی نہیں رہے گا ،جس کے پاس قرآن نہیں پہنچا ہو ،اور اس کے اثرات گہرے ، دوررس اور غیر معمولی ہوں گے ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو کشش اور دلوں کو مسخر کرنے طاقت ہے وہ ہزار مخالفوں اور معاندانہ رویوں کے باوجود آج بھی قائم ہے۔

اس سلسلہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ ڈیڑھ سال پہلے وی ، ایچ ، پی کی طرف سے قرآن مجید مع ہندی ترجمہ ان مقامات کی نشاندہی کے ساتھ فراہم کیا گیا جن میں وی ، ایچ ، پی قیادت کے بقول بدامنی پھیلانے کی اور غیر مسلموں کے ساتھ بدسلوکی کی تعلیم دی گئی ہے ،اس مسئلہ میں شریک ایک مذہبی پیشوا کے لئے یہی مترجم قرآن ہدایت کا ذریعہ بن گیا ،انھوں نے پورے قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور بالآخر اسلام لے آئے ، نیز انھوں نے ہی بتایا کہ قرآن مجید کی تقسیم کے بعد خود اکثر ہندو پیشواؤں کا احساس تھا کہ ان آیتوں کے حوالہ سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں وہ درست نہیں ہیں ،اور آیت کے سیاق وسباق سے ان کا غلط ہونا

ثابت ہوتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہم صرف قرآن مجید کا ترجمہ اپنے ان بھائیوں تک پہنچائیں تو انشاءاللہ یہ معمولی سی کوشش بھی بہت سے لوگوں کے لئے ہدایت سے سرفرازی کا باعث بنے گی۔

افطار میں جہاں ایک پہلو غذا کا اور کھانے کھلانے کا ہے، وہیں اس میں عبادت اور بندگی کا جو رنگ ہے وہ بھی بہت ہی پرکشش اور جاذبِ قلب ونظر ہے، محض اللہ کے لئے دن بھر بھوکے پیاسے رہنا اور اپنی روز کی عادتوں سے کنارہ کش ہو جانا، پھر جیسے ہی مغرب کے وقت مؤذن نے خدا کی کبریائی کا نعرہ لگایا، سارے لوگ ایک ساتھ افطار کے لئے دسترخوان پر بیٹھ گئے، نہ کوئی بڑا نہ چھوٹا، نہ اونچا نہ نیچا، نہ مالدار نہ غریب، کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں، ایک ہی دسترخوان پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، پھر اس وقت بھی خدا سے دُعاء والتجاء، دن بھر کے بھوکے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغول ہو جاتے ہیں، خدا کے سامنے بچھاؤ اور جھکاؤ کی یہ کیفیت اتنی دل آویز اور پرکشش ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو افطار کے لئے مدعو کریں، وہ کھانے میں بھی شریک ہوں اور خدا کی بندگی کے اس غیر معمولی نظارہ کو بھی اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ افطار کے نظم کو شور شرابہ اور محض کھانے کے انتظام کے لئے دوڑ دھوپ سے بچاتے ہوئے وہ ماحول پیدا کیا جائے جو افطار کے وقت مطلوب ہے، اور غذائی دعوت سے زیادہ روحانی دعوت پر توجہ مرکوز رکھی جائے، روحانی دعوت سے مراد یہ ہے کہ ان تک دین کی کچھ بات پہنچانے کا نظم کیا جائے، مثلاً افطار سے آدھا ایک گھنٹہ پہلے مدعوئین کو بلایا جائے اور رمضان المبارک کی نسبت سے غیر مسلم بھائیوں کے حسبِ حال مختصر سا بیان رکھا جائے، جس میں توحید، رسالت آخرت کا تصور، روزہ کا مقصد، رمضان المبارک کے افعال وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے، قرآن مجید کا تعارف کرایا جائے، اس کے تاریخی طور پر محفوظ ہونے کے پہلو کو واضح کیا جائے گویا صرف کھانے کا دسترخوان نہ ہو بلکہ ہدایتِ ربانی کا دسترخوان بھی بچھانے کی کوشش کی جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خود نماز کا منظر بھی بہت ہی پر کیف اور متاثر کن ہے، جو انسان پتھروں، درختوں، سیاروں اور سمندروں کے سامنے سر موجھکنے کو تیار نہیں وہ خدا کے سامنے ایک زرخرید غلام کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہاتھ باندھے کھڑا ہے، کبھی کمر تک جھکتا ہے، کبھی دوزانو نگاہوں کو پست کئے بیٹھا ہے اور کبھی اپنی پیشانی کو زمین پر بچھا دیتا ہے، پھر جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو خدا کے دربار میں اس طرح ہاتھ پھیلاتا ہے جیسے کوئی ضرورت منداور مصیبت زدہ بھکاری دستِ سوال دراز کرتا ہے، یہ عجز وفروتنی اور جھکاؤ اور بچھاؤ کی ایسی تصویر ہے کہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو مٹا دینا اور سرخمیدہ ہوجانا حضرت انسان کے لئے ممکن ہی نہیں، پھر حاکم اور محکوم، دولت منداور غریب، تعلیم یافتہ اور جاہل اور بڑے اور چھوٹے سبھوں کا ایک ہی صف میں دوش بدوش اور قدم بہ قدم کھڑا ہونا اجتماعیت اور انسانی وحدت کی ایسی مثال ہے کہ اس ملک کی اکثریت اپنے مذہب میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

رمضان المبارک میں نمازوں کا اہتمام بڑھ جاتا ہے، مسجدیں نماز پڑھنے والوں سے معمور ہو جاتی ہیں اور ذوقِ عبادت نسبتاً بڑھ جاتا ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے پروگرام کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ برادرانِ وطن نماز کے اس ماحول کو دیکھیں، تاکہ وہ اسلام کی عملی کیفیت کو ملاحظہ کرسکیں، بلکہ اگر کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو انھیں مسجد میں دعوت دینی چاہئے، تاکہ وہ مسجد کے پرسکون ماحول اور سادہ طریقۂ عبادت کو دیکھ سکیں، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران کے عیسائیوں کو مسجد ہی میں ٹھہرایا تھا، غزوۂ بدر کے مشرک قیدیوں کے رہنے سہنے کا انتظام بھی مسجد میں ہی کیا گیا تھا، بنوثقیف کے مشرکین کے وفد کو بھی آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ میں ہی ٹھہرایا تھا، اور جو غیر مسلم حضرات آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے آتے تھے، عموماً مسجد ہی میں ان سے ملاقات ہوتی تھی، اس لئے دعوتی نقطۂ نظر سے غیر مسلم بھائیوں کو مسجد میں بلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

رمضان المبارک اور عید الفطر کی مناسبت سے صدقۃ الفطر کا حکم دیا گیا ہے، جس کا مقصد غریبوں کی مدد کرنا ہے، اسلام میں زکاۃ کے مصارف تو محدود ہیں، زکاۃ کی رقم مسلمان ہی سے

لی جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر مسلم حکومت ہوتو وہاں بھی صرف مسلمانوں ہی سے زکاۃ کی رقم لی جائے گی، غیر مسلموں سے نہیں، کیوں کہ غیر مسلموں سے زکاۃ لینا ان کو ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنا ہے اور اسلام اس کو روا نہیں رکھتا کہ ایک مذہب کے ماننے والے لوگ دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہبی افعال انجام دینے پر مجبور کریں کہ یہ مذہبی آزادی کے مغایر ہے، اسی لئے زکاۃ کا مصرف بھی صرف مسلمان کو قرار دیا گیا ہے، غیر مسلموں پر زکاۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں، لیکن صدقۃ الفطر کا مقصد نزولِ قرآن اور ماہِ رمضان کی نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور اپنی خوشی میں اپنے غریب بھائیوں کو شریک کرنا ہے۔

چنانچہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک صدقۃ الفطر غیر مسلم بھائیوں کو بھی دیا جا سکتا ہے، اور ایک صدقۃ الفطر ہی پر موقوف نہیں بلکہ زکاۃ کے علاوہ تمام ہی صدقاتِ واجبہ غیر مسلموں پر بھی خرچ کئے جا سکتے ہیں، اور صدقات نافلہ کے بارے میں تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ غیر مسلم بھی اس کا مصرف ہیں اور ان کا تعاون کرنا بھی باعثِ اجر وثواب ہے، ہمیں چاہئے کہ خوشی کے اس موقع پر اپنے غیر مسلم پڑوسیوں اور ضرورت مند لوگوں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کریں اور صدقۃ الفطر کی مدد سے غیر مستطیع برادرانِ وطن کا بھی تعاون کریں، تا کہ اسلام کی فراخ دلی، مسلمانوں کی رواداری اور انسانی رشتہ کے تحت حسن سلوک اور بہترین برتاؤ کو وہ محسوس کریں، یہ ہمارے لئے باعث اجر وثواب ہوگا اور اسلام کا بہتر تعارف اور خاموش دعوت ان کے سامنے آسکے گی۔

۲۹/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

قرآن مجید کا ایک بھلایا ہوا حق

رمضان المبارک کے مہینہ کو قرآن مجید سے ایک خاص مناسبت ہے، مفسرین کے بیان کے مطابق اس مہینہ میں قرآن مجید لوحِ محفوظ سے آسمانِ اول پر بھیجا گیا، پھر اسی مبارک مہینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترنا شروع ہوا، اس ماہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آپ ﷺ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے، اس ماہ میں ایک مستقل نماز ''تراویح'' کی رکھی گئی، تاکہ اس میں پورا قرآن مجید بحالتِ نماز پڑھا اور سنا جائے، اس لئے یہ مہینہ ہمیں قرآن مجید کے حقوق اور اس مبارک کتاب کی نسبت سے ذمہ داریوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

قرآن مجید کے بہت سے حقوق ہیں، قرآن مجید کے الفاظ چوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اس لئے اس کتاب کی تلاوت اور اس کے الفاظ کا تکرار، پھر اس تلاوت میں بھی قرآن کو صحیح طریقہ پر اور عمدگی کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام، قرآن مجید کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرنا، جو لوگ عربی زبان سے واقف ہوں اور انھوں نے اسلامی علوم کی تحصیل کی ہو، وہ علماء ربانی کے مستند تراجم قرآنی سے استفادہ کر سکتے ہیں، قرآن مجید کا حق اس کا احترام اور اس پر یقین و ایمان بھی ہے، قرآن مجید کے حقوق میں سے ایک اہم ترین حق قرآن پر عمل کرنا ہے، جن چیزوں پر عمل کرنا ہے، جن چیزوں کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے ان سے فائدہ اُٹھانا اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز رہنا، قرآن پر عمل کرنا ہے اور اسی سے آدمی کی نجات متعلق ہے، یہ وہ حقوق ہیں جن پر کسی نہ کسی درجہ میں عمل کی کوشش کی جاتی ہے، قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے، تلاوت کا طریقہ سیکھا جاتا ہے، قرآنی تعلیمات سے واقف ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، حسبِ توفیق لوگ قرآن پر عمل کرتے ہیں، قرآن پر ہمارا ایمان و یقین ہے،

کہ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور ہر مسلمان کے لئے یہ کتاب چشم عقیدت کا سرمہ ہے اور وہ اس کتاب کی بے حرمتی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، غرض کہ ان حقوق کو کوتاہی کے ساتھ ہی سہی کچھ نہ کچھ ادا کیا جاتا ہے۔

لیکن قرآن کا ایک اور حق بھی ہے، بھلایا اور فراموش کیا ہوا حق، ایسا حق کہ جس کی طرف ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا اور جس کو ادا کرنے کے لئے ہمارے سینہ میں کوئی عزم بیدار نہیں ہوتا، یہ حق ہے اللہ کی اس کتاب کو اللہ کے بندوں تک پہنچانا، قرآن مجید کی ایک صفت ''ہدیٰ'' ہونا ہے، ہدیٰ کے معنی سراپا ہدایت کے ہیں، ہدایت ورہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں تک پہنچائی جائے جو ہدایت سے محروم ہیں، قرآن کسی خاص قوم کی جاگیر یا ملکیت نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس امانت کا حق ہے کہ اسے پوری انسانیت تک پہنچایا جائے۔

قرآن مجید میں ساڑھے چھ ہزار سے اوپر آیتیں ہیں، ان میں سے پانچ سو آیات احکام سے متعلق ہیں، جن میں عملی زندگی کے بارے میں شرعی قوانین بیان کئے گئے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، نکاح، طلاق، جرم وسزا وغیرہ، بقیہ آیات براہِ راست یا بالواسطہ دعوتِ دین سے متعلق ہیں، یا تو ان میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے یا انبیاء کے دعوتی واقعات اور قصص کو ذکر فرمایا گیا ہے، غرض یہ ایسا فریضہ ہے جو قرآن مجید کے تقریباً نوے فیصد مشتملات کا نچوڑ اور اس کا خلاصہ ہے، خود قرآن مجید میں تبلیغ قرآن کے فریضہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

> **یا ایها الرسول ! بلغ ما انزل إلیک من ربک وإن لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمک من الناس ، ان الله لا یهدی القوم الکافرین . (المائدہ:٦٧)**
>
> اے رسول ﷺ! جو کتاب آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اسے پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے

رسالت کا حق ادا نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت
فرمائیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو کفر
پر بضد ہیں۔

غور کیجئے! اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی بلیغ تاکید کے ساتھ تبلیغ قرآن کا حکم دیا جارہا ہے اور یہ بھی فرمایا جارہا ہے کہ اگر آپ نے یہ کام نہیں کیا، تو آپ نے رسالت و پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی راتوں کو انسانیت کی ہدایت کے لئے خدا کے سامنے رونے، گڑگڑانے اور التجا کرنے میں گزار دی اور دن بندگانِ خدا کو اللہ کی طرف بلانے اور بندوں کو خدا سے جوڑنے میں صرف کیا، اسی لئے آپ ﷺ نے طائف میں پتھر کھائے اور لہولہان ہوگئے، اُحد میں چہرۂ مبارک کا زخمی ہونا گوارہ فرمایا، شعبِ ابی طالب میں بھوک و پیاس کی لذت اُٹھائی، مکہ سے تلواروں کے سایہ میں مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، آپ ﷺ کے عم محترم کا کلیجہ چبایا گیا اور آپ ﷺ کی صاحبزادی کو طلاق دی گئی، ان ساری آزمائشوں اور ابتلاؤں اور مخالفتوں وعداوتوں سے آپ ﷺ کیوں کر گزرے؟ اسی لئے کہ حق رسالت کی یہ ذمہ داری ادا ہو۔

چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع سے جب ایک لاکھ سے زائد صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے اپنے اثر انگیز وداعی خطبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کہ کیا ہم نے تم تک اللہ کے دین کو پہنچادیا، ھل بلغت ؟ تم اس بارے میں کیا کہو گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم تک اللہ کی کتاب پہنچادی، نبوت کا حق ادا فرمادیا اور ہمارے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ فرمایا: ''نشھد انک قد بلغت وأدیت ونصحت'' آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: اے اللہ! آپ گواہ رہیں، اے اللہ! آپ گواہ رہیں، اے اللہ! آپ گواہ رہیں۔ (مسلم باب حجۃ النبی ﷺ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ تمام ہو چکا ہے، لیکن یہ دین قیامت تک کے لئے ہے اور آپ ﷺ کی نبوت ابدی اور دائمی ہے، اس لئے جو ذمہ داری پیغمبروں اور

رسولوں پر تھی، وہ اب اس اُمت کے سر آ گئی ہے، اور اسے قیامت تک اس فریضہ کو انجام دینا ہے، اگر آپ نے نماز پڑھ لی، روزے رکھ لئے، زکوٰۃ ادا کی، حج کا اہتمام کیا، مامورات پر عمل کیا، اور منہیات سے اپنے آپ کو بچایا، لیکن ان بندوں تک دین کو پہنچانے کی کوشش نہیں کی جو ہدایت سے محروم ہیں، تب بھی آپ کا عمل قرآن کی دس فیصد سے بھی کم ہی آیات پر ہوا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اُٹھا کر دیکھیں تو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا نوے فیصد حصہ دعوتِ دین ہی میں گزرا ہے، جہاد بھی اصل میں دعوتی جدوجہد ہی سے عبارت ہے، دعوتِ دین اور تبلیغ قرآن سے غفلت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سیرتِ نبوی ﷺ کے بہت بڑے حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کے لئے اپنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں رکھا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر غور فرمایئے کہ اس آیت میں دعوت کے ثمر اور نتیجہ کو بھی بیان فرمایا گیا ہے، آخرت کا اجر تو بے شمار ہے ہی، لیکن دنیا میں دعوت کا نتیجہ ''عصمت من الناس'' (لوگوں سے حفاظت) کی صورت ظاہر ہوگا، یوں تو ''ناس'' (لوگوں) میں پوری انسانیت شامل ہے، لیکن ایک بڑے صاحبِ نظر مفسر کا بیان ہے کہ قرآن مجید میں اکثر ''ناس'' سے مشرکین اور کفار مراد لئے جاتے ہیں، گویا اس آیت میں خاص طور پر غیر مسلموں سے تحفظ کی طرف اشارہ ہے اور اگر اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو سامنے رکھئے کہ جب اُمت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی بھلائی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کو چھوڑ دے گی تو اُمت پر ظالموں کا تسلط ہو جائے گا، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا نتیجہ لوگوں سے تحفظ ہے، اور دعوت کو چھوڑنے کا نتیجہ ظالموں کا تسلط۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے، کہ ہر جگہ یہاں تک کہ عالم اسلام کے قلب میں بھی ستم پیشہ یہود و نصاریٰ کا تسلط ہے اور مسلمان اپنے آپ کو خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، غیر محفوظ اور غیر مامون محسوس کر رہے ہیں، اس کا حل اللہ کے غیبی نظام کے مطابق ہے، جس پر ہمارا ایمان دیدۂ وشنیدہ چیزوں سے بھی بڑھ کر ہونا چاہئے، یہی دعوت الی اللہ کا کام ہے، افسوس کہ عیسائی دنیا کروڑوں کی تعداد میں بائبل شائع کرتی ہے

اور ہر علاقہ میں وہاں کی زبان میں پہنچائی جاتی ہے، ہم دین حق کے حامل ہیں اور خدا کی آخری کتاب ہمارے پاس محفوظ ہے، لیکن ہمیں اللہ کی بھیجی ہوئی اس امانت کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی توفیق نہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اپنے مروجہ جلسے، جلوس کو کم کرکے برادران وطن کے اجتماعات رکھتے اور دردمندی کے ساتھ ان کے سامنے قرآنی تعلیمات کو رکھتے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی دعوتِ افطار میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کریں اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچائیں؟ کیا ہماری یہ ذمہ داری نہیں کہ ہم قرآن مجید کے ترجمے مقامی زبانوں میں غیر مسلم برادرانِ وطن تک پہنچائیں، اور انھیں بتائیں کہ یہ صرف ہماری نہیں آپ کی بھی کتاب ہے اور صرف ہمارے نہیں، ہمارے آپ کے سبھوں کے خدا نے محبت کا یہ سندیش دنیا کو بھیجا ہے۔

اگر قیامت کے دن خدا کے سامنے ہمارے غیر مسلم پڑوسی کھڑے ہوجائیں کہ ہمارے اس پڑوسی کے پاس آپ کی کتاب تھی اور اس نے ہم تک نہیں پہنچایا، کچھ غیر مسلم کھڑے ہوجائیں کہ ہماری دوکان اور کارخانہ میں فلاں فلاں مسلم بھائی کام کیا کرتے تھے اور بظاہر ہمارا کاروبار اس کے لئے رزق کا ذریعہ تھا، لیکن کبھی اس نے ہم تک آپ کی بھیجی ہوئی سوغات نہیں پہنچائی، اگر غیر مسلم مزدور کھڑے ہوجائیں کہ ہم نے گاڑھے پسینے بہا کر ان مسلمانوں کے عشرت کدے تعمیر کئے، لیکن ان مسلمانوں نے کبھی دوزخ کے آتش کدہ کی طرف ہمارے بڑھتے ہوئے قدم کو تھامنے کی کوشش نہیں کی، اور اگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت سے سوال کر بیٹھیں کہ جس کتاب کو پہنچانے کے لئے ہم نے پتھر کھائے، چوٹیں سہیں، جان قربان کرنے کے خوف کو قبول کیا، تم نے اس کے لئے اپنی زبان اور اپنی زندگی کا تھوڑا سا وقت بھی خرچ نہیں کیا؟ تو سوچئے خدا اور اس کے رسول کے سامنے ہم لوگ کس قدر شرمسار ہوں گے اور کیوں کر ان سوالات کے جوابات دے سکیں گے؟؟

۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

پریم کا سندیش

مسلمان جس نبی کی سنت کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے ہیں، اور جن کی حیاتِ طیبہ ان کے لئے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتی ہے، وہ خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے امتیازی اوصاف میں ایک یہ ہے کہ وہ سراپا رحمت تھے، ان کا وجود فضل و کرم اور عفو و درگذر سے عبارت تھا، ان کی زندگی کا سبق یہ تھا کہ پتھر پھینکنے والوں پر پھول برسائے جائیں، اور کانٹے بچھانے والوں کے لئے گلہائے محبت کی سیج آراستہ کی جائے، انھوں نے سب و شتم کے پتھر برسانے والوں کو اپنی دعاؤں سے سرفراز فرمایا، اور جور و ستم ڈھانے والوں کو بھی سینہ سے لگایا، یہی اسوہ ہمارے لئے بھی مطلوب ہے اور یہی راستہ ہمیں اپنی منزل مراد تک پہونچا سکتا ہے۔

انسان کی زبان کی مثال گلاب کے پودے کی ہے، جس میں پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی، وہ انسان کو لہولہان بھی کرسکتا ہے اور محفل کو مشک بار بھی بنا سکتا ہے، انسان کا کمال یہ ہے کہ اس کے بول سے گلاب کی خوشبو پھوٹتی ہو، اور اس کی لطافت گلاب کی پنکھریوں کی لطافت کو بھی شرمسار کرتی ہو، محترم جناب کے، ایس، سدرشن صاحب ہمارے ملک میں ہندوتوا تحریک کے اعلیٰ ترین قائد ہیں، اور ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی تنظیم آر، ایس، ایس کے سربراہ ہیں، اس حیثیت کا تقاضا تھا کہ ان کی زبان میں قند و نبات کی مٹھاس اور گلاب کی خوشبو ہوتی، لیکن افسوس کہ انھوں نے اپنے لئے گلاب کی خوشبو کے بجائے کانٹوں کا انتخاب کیا ہے، اور اکثر و بیشتر ان کے بیانات اقلیتوں کے لئے نہایت تکلیف دہ اور اذیت رساں ہوتے ہیں، ایسے ہی بیانات میں ایک وہ ہے، جو انھوں نے ہفتہ دو ہفتہ پہلے کلمہ ”لا إله إلا الله ، محمد رسول الله“ کے سلسلہ میں دیا ہے انھیں اس کے دوسرے جزو سے اختلاف ہے، اور ان کے خیال میں یہ دوسرا جزو پہلے جزو کے متصادم بھی ہے، ہمارے پیغمبر چوں کہ پیکر رحمت و مجسم عفو و درگذر تھے، اس لئے ہمیں نفرت کے کانٹوں کا جواب محبت کے پھولوں سے دینا ہے، اسی لئے آج ہم سدرشن جی کے

لئے پیار کی سوغات لے کر حاضر ہیں، یہ ایک تحفۂ محبت، اوران کے ایک بھی خواہ انسانی بھائی کی طرف سے نسخۂ کیمیا ہے، جوان کے لئے اوران جیسے بہت سے بھائیوں کے لئے (جو ہمارے ہم وطن ہیں، اوراس جوار وہم وطنی کی نسبت سے ہم پران کے حقوق ہیں) کی خدمت میں پیش ہے!

کلمۂ طیبہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں، بلکہ یہ تمام انسانیت کے لئے نجات کا کلمہ ہے، اس کے پہلے جزء میں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انسانوں کا معبود ایک ہی ہے، وہی خدا ہے، وہی قادر مطلق ہے، اوراسی کے اشارہ پر کائنات کا یہ پورا نظام جاری وساری ہے، قرآن مجید کا اصل پیغام یہی دعوت توحید ہے، اورغور کریں تو ہمارے برادرانِ وطن کی مقدس مذہبی کتابیں بھی توحید کی واضح تعلیمات اور ناقابلِ تاویل تشریحات سے مامور ہیں، قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، (الفاتحہ:۱)...... وید کا بیان ہے: اس دنیا کے بنانے والے کے لئے تعریف ہے، (۵:۱۸:۱) قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی ذات رحمٰن ورحیم ہے، (الفاتحہ:۲) وید کا بیان ہے کہ وہ دینے والا اور مہربان ہے، (رگ وید:۳:۳۴:۱) قرآن نے کہا ہے کہ ہر چیز کو اللہ ہی نے پیدا کیا، (الفرقان:۲) وید کا بیان ہے: پرماتماسب پرجا کو بناتا ہے، (اتھر وید:۱۹:۱) قرآن کہتا ہے کہ اللہ ہی کے لئے آسمان اور زمین کی حکومت ہے، (البقرۃ:۱۰۷) وید کا بیان ہے: وہ عظیم زمین وآسمان کا مالک ہے، (رگ وید:۱۰۱)، قرآن کہتا ہے کہ مشرق ومغرب کا اللہ ایک ہی ہے، (البقرۃ:۱۱۵) وید کا بیان ہے کہ سب سمتیں اسی کی ہیں (رگ وید،۱۰:۱۲۱:۴) قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے مانندو مماثل کوئی چیز نہیں ''لیس کمثلہ شیٔ'' (الشوریٰ:۱۱) وید کا بیان ہے: اس پرمیشور کی کوئی مورتی نہیں بن سکتی (یجروید،۳۲:۳) قرآن کہتا ہے کہ خدا تمہارے ساتھ ہے، خواہ تم کہیں بھی ہو، اورتم جو کچھ بھی کرتے ہو، وہ اسے دیکھ رہا ہے، (الحدید:۴) وید کا بیان ہے: جو کھڑا ہوتا ہے، جو چلتا ہے، جو دھوکہ دیتا ہے، جو چھپتا پھرتا ہے، جو دوسروں کو تکلیف دیتا ہے، جو دو آدمی خفیہ بات کرتے ہیں تیرا ایشوران سب کو جانتا ہے، (اتھر وید:۴:۱۶:۲) قرآن کہتا ہے: اللہ ہی خالق اور حاکم ہے، اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بڑی خوبیوں والا ہے، تم لوگ اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور پست آواز میں دعاء کرو (الاعراف:۵۵،۵۴) وید کا بیان ہے: قابل پرستش زمین

اورآسمان کوسچے راستہ پر چلانے والے پرمیشور سے عاجزی سے ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگو(رگ وید:۶:۱۶:۴۶)......کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں، اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفات کے بیان میں قرآن مجید اور ویدوں میں اس قدر یکسانیت ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اگر ہندوتو تنظیمیں لوگوں کو لاٹھی اور بندوق سکھانے کے بجائے وید کا نغمۂ توحید سنائیں اور ویدک دھرم کا اصل نظریۂ توحید ان کے سامنے پیش کریں تو کتنی بھلی بات ہوتی، اس طرح انسان کا رشتہ خدا سے مضبوط ہوتا، اور خدا کی توحید کا تصور انسانی وحدت کا ماحول پیدا کرنے اور طبقاتی تفریق سے انھیں بچانے میں مدد و معاون ہوتا، کلمۂ طیبہ کے پہلے جزء کا خلاصہ یہی عقیدہ توحید ہے، اب ہندو بھائی سوچیں کہ مورتی پوجا کر کے وہ اپنی مذہبی کتابوں کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں، یا اس کی مخالفت اور عدول حکمی؟

کلمہ کا دوسرا جزء یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول اور اس دنیا کی طرف اس کے بھیجے ہوئے سفیرِ ہدایت ہیں، یہ کلمۂ طیبہ کے پہلے جزء کے مغائر اور اس سے متصادم نہیں ہے، بلکہ اس کی تائید وتقویت کا باعث ہے، خدا نے دنیا میں ہمیشہ انسانوں میں سے کچھ برگزیدہ صفت لوگوں کا انتخاب کر کے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا ہے؛ تاکہ ان کے ذریعہ انسانیت کو وہ راستہ بتایا جائے جو اسے راہ نجات کی طرف لے جاتا ہے، اور جس سے اس کا خالق و مالک خوش ہوتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام جیسے اللہ کے پہلے رسول تھے، اسی طرح پہلی نبی بھی تھے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق خدا نے ہر قوم اور ہر علاقہ میں پیغمبروں کو بھیجا ہے، ہندوستان میں جن بزرگوں کو دیوتا اور بھگوان بنایا گیا ہے عجب نہیں کہ وہ بھی اپنے اپنے عہد میں خدا کے رسول رہے ہوں، اور لوگوں نے ان کی حقیقی تعلیمات میں آمیزشیں اور ملاوٹیں پیدا کر کے سچائیوں کو خاک آلود کر دیا ہو، یہی حال عیسائی بھائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے عہد کے رسول برحق تھے، اور خدا کا پیغام دنیا تک پہونچانے کے لئے آئے تھے، لیکن انھیں بتدریج خدا کا بیٹا اور خدا بنا دیا گیا۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت، آپ کے بے پناہ فضائل و کمالات، اور بے شمار محاسن اور

خوبیوں کے تحت یہ بات ممکن تھی کہ لوگ بعد کو چل کر آپ کو بھی خدائی میں شریک و سہیم ٹھہرا لیتے، رسول اللہ ﷺ کو پچھلی قوموں کے تجربہ کی بنیاد پر اس کا خدشہ اتنا زیادہ تھا کہ آپ ﷺ مرض وفات میں بھی اپنے رفقاء سے فرماتے رہے کہ میرے ساتھ وہ معاملہ نہیں کرنا جو معاملہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے ساتھ کیا، پس کلمۂ توحید کے ساتھ رسالت محمدی کا ذکر کر کے قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں نہ کہ خود خدا، اس پس منظر میں غور کیا جائے تو کلمۂ طیبہ کا یہ دوسرا جزء پہلے جزء کی تائید وتوضیح ہے، نہ کہ اس کے مخالف ومغائر۔

جناب سدرشن جی اور ہمارے دوسرے ہندو بھائیوں کو اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے، کہ کہیں ان کی مذہبی کتابوں میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کی پیشین گوئی تو موجود نہیں ہے؟ تحقیق وتلاش سے کام لیا جائے تو اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے اصل نام دو ہیں: محمد اور احمد، قرآن مجید نے خود انجیل میں احمد کے نام سے آپ ﷺ کی پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے، ان ہی ناموں سے ویدوں میں بھی آپ ﷺ کی نبوت کا ذکر موجود ہے، زبانوں کے فرق سے الفاظ میں کسی قدر تبدیلی آجاتی ہے، جیسے عبرانی زبان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ابراہام تھا، عربی میں ابراہیم کہا گیا، عبرانی میں حضرت مسیح کو یسوع کہا گیا، عربی میں عیسیٰ سے تعبیر کیا گیا، پس جب کوئی نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے، تو اس میں معمولی سا تغیر بھی آجاتا ہے، اس وضاحت کے ساتھ آپ دیکھیں تو حضور ﷺ کا نام نامی ''احمد'' ہندو مذہبی کتابوں میں مختلف موقعوں پر آیا ہے، یجر وید میں ہے :

> وہ تمام علوم کا سرچشمہ احمد (مَهَانتُ مَادِتَيَ وَرْنُ)
> عظیم ترین شخصیت ہے، یہ روشن سورج کے مانند اندھیروں کو دور بھگانے والا ہے، اس سراج منیر کو جان لینے کے بعد ہی موت کو جیتا جا سکتا ہے، نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ (یجر وید: ۱۸:۳۱)

اسی طرح رگ وید میں ہیں :

اَحَمِدُ نے سب سے پہلے قربانی دی اور سورج جیسا ہو گیا۔
(رگ وید:۸:۶:۱۰)

اس پیشین گوئی میں 'احمد' کا لفظ بہت واضح ہے، البتہ ''م'' پر زیر کے ساتھ کہا گیا ہے، اسی طرح اتھر وید میں بھی احمد کے نام کے ساتھ آپ کی نبوت کا ذکر موجود ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتابوں میں بعض ناموں کا ترجمہ کر دیا گیا ہے، جیسے انجیل میں احمد کا ترجمہ فارقلیط سے کیا گیا ہے، اس پس منظر میں اگر وید کی وہ عظیم الشان پیشین گوئی دیکھیں جو نراشنس کے بارے میں ہے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصداق جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ''نر'' کے معنی آدمی کے ہیں، اور ''آشنس'' کے معنی ''قابل تعریف'' کے، اس طرح نراشنس کے معنی ہوئے ''قابل تعریف شخص'' یہ بعینہ ''محمد'' کا ہم معنی ہے، پھر نراشنس کی جو علامات استعارات وشبہات کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں، وہ واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر صادق آتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ سواری کے لئے اونٹ استعمال کریں گے، اس کی ۱۲ بیویاں ہوں گی، اور حضرت ریحانہ کو لے کر آپ کی ۱۲ ازواج مطہرات ہوتی ہیں، ''وہ ۱۰ مالاؤں والا ہوگا'' اس سے عشرہ مبشرہ کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے، ''اس کو تین سو گھوڑے ملیں گے'' اس سے اصحاب بدر کی تعداد کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے، ''ایشور انھیں دس ہزار گائیں عطا کرے گا'' اس سے فتح مکہ کے موقع سے صحابہ کی تعداد کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے، تورات میں بھی فتح مکہ میں شریک صحابہ کے لئے دس ہزار قدوسیوں کا لفظ آیا ہے۔ (اتھر وید:۲۰:۱۲۷:۳)

پُرانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں زیادہ واضح طور پر ملتی ہیں، یہاں دو عبارتیں نقل کی جاتی ہیں :

بیرون ملک کا ایک مبلغ اپنے شاگردوں سمیت آئے گا جن کا نام محمد ہوگا، وہ ریگستان کا رہنے والا ہوگا۔

(بھوشیہ پُران پرتیہ سرگ، کلیوگی اتہاس، ادھیا:۳، اشلوک:۵) .

جن کی پیدائش سے دُکھی لوگوں کو خوشیاں ملیں گی، ان کی پیدائش مدھو
ماس (چیت ویشاکھ کا مہینہ) میں سموار کو چاند کی بارہ تاریخ کو ہوگی۔

(کلکی پُران: ۲:۱۵) .

پس محمد ﷺ کی رسالت ونبوت اور آپ کا سایۂ رحمت اور نور ہدایت جیسے مسلمانوں کے لئے ہے، ویسے ہی غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی، یہ پوری انسانیت کی امانت اور ان کا حق ہے، اس لئے کلمۂ طیبہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں، جیسے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کے لئے یہ کلمہ ہے، اسی طرح جو لوگ ویدوں پر یقین رکھتے ہوں، ان کے لئے بھی یہ فلاح ونجات کا کلمہ ہے، یہ ایک ابدی سچائی اور شک وشبہ سے بالاتر حقیقت ہے، اور سچائی جہاں بھی ہو، اسے قبول کرنا چاہیے، اس لئے ہم برادرانِ وطن اور ہندوتو اتحریک کے علمبرداروں سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ چاہے مسلمانوں کی باتیں نہ مانیں، لیکن خود اپنی ویدوں اور مذہبی کتابوں کے سامنے تو سرتسلیم خم کردیں۔

رسالتِ محمدی کا احسان صرف مسلمانوں پر نہیں، بلکہ ہمارے اس ملک پر بھی ہے، اس ملک میں عورتوں کو شوہروں کے ساتھ نذر آتش کردیا جاتا تھا، انھیں میراث کا حق نہیں ملتا تھا، انسانوں اور انسانوں کے درمیان تفریق کی مصنوعی دیواریں کھڑی کردی گئی تھیں، تو ہم پرستی اور عقیدۂ توحید سے محرومی نے انھیں علم وتحقیق کا سفر طئے کرنے سے روک رکھا تھا، یہ نبوت محمدی ﷺ کی دین ہے کہ آج اس ملک میں انسانی وحدت اور مساوات کے نعرے لگائے جارہے ہیں، تو ہم پرستی کے بجائے عقل اور فطرت کی آواز پر لبیک کہنے کی دعوت دی جارہی ہے، اور عورتوں کو عزت واحترام کا مقام حاصل ہورہا ہے، اگر آپ آگے بڑھ کر اس کلمہ کی سچائی کو قبول کرلیں تو ملک وقوم کی ساری مشکلات حل ہوسکتی ہیں، اور دنیا کے ساتھ ساتھ وہ آخرت بھی سنور سکتی ہے، جو تمام مذاہب کا مشترکہ عقیدہ ہے، کوئی ہے جو اس سوغات کو قبول کرے؟ کاش

کچھ دل ہوں جو سچائی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں، کچھ آنکھیں ہوں جو عبرت وموعظت کے نقوش کو دیکھنے کا شعور رکھتی ہوں، اور کچھ زبانیں ہوں کہ وقتی مصلحت انھیں مقفل کرنے اور قبولیتِ حق سے روکنے میں رکاوٹ نہ بن سکیں!!

۱۳/جنوری ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

علماء اور عصری درس گاہیں

علم انسان کی عظمت اور سربلندی کی اساس ہے اور علم سے محرومی ایمان بعد کے سب سے بڑی محرومی اور نامرادی ہے، علم ہی کی وجہ سے انسان بلند درجہ و مقام کا حامل ہوتا ہے (المجادلہ:۱۱) قرآن کہتا ہے کہ اصحابِ علم اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے، (الزمر:۹) کیوں کہ نابینا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، تاریکی اور روشنی ہم پلہ نہیں ہوسکتیں، سایہ اور دھوپ کا ایک درجہ نہیں ہوسکتا۔ (فاطر:۱۹-۲۱)

انسان کو جو بھی علم حاصل ہے، وہ اللہ ہی کا عطا کیا ہوا ہے اور گو انسان نے بہ ظاہر علم کے ہمالئے فتح کر لئے ہیں، لیکن پھر بھی اس کا علم اس کے جہل کے مقابلہ اور اس کی جانی ہوئی باتیں انجانی حقیقتوں کے مقابلہ بہت کم ہیں، وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلاً، (الاسراء:۸۵) علم کا ایک ذریعہ وحی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر اپنی آیات و احکام اتارتے ہیں اور ان کے واسطے سے یہ اللہ کے بندوں تک پہنچتا ہے، حضرت محمد ﷺ پر نبوت کا سلسلہ تمام ہو چکا، علم کا یہ ذریعہ معصوم ہے، یعنی اس میں غلطی اور بھول چوک کا کوئی امکان نہیں، علم کا دوسرا ذریعہ انسانی عقل اور اس کا تجرباتی سفر ہے، یہ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی ہے، لیکن یہ معصوم نہیں، عقل ٹھوکر کھا سکتی ہے اور کھاتی ہے، تجربات غلط ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ انسان جس شئ کو بیش قیمت سونا سمجھے وہ ایک کم قیمت پیتل ہو اور انسان جس چیز کو ہیرا خیال کرے وہ کوئی بے قیمت چمکنے والی شئ ہو، لیکن عقل اور تجربہ کے ذریعہ انسان جن سچائیوں کو حاصل کرتا ہے اور جن حقائق و ایجادات سے اپنا دامن مراد بھرتا ہے، اس میں بھی انسان کے ذاتی کمالات کا دخل نہیں، بلکہ وہ بھی عطیۂ خداوندی ہیں۔

اسی لئے کوئی بھی علم جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو، اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے حکمت کو مؤمن کا گمشدہ مال قرار دیا ہے، آج جس تعلیم کو ہم عصری تعلیم یا جدید تعلیم کہتے ہیں، وہ اسی حکمت کا مصداق ہے، حالاں کہ قرآن و حدیث سے زیادہ

عصری کوئی علم نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ ہر عہد اور عصر سے ہم آہنگی رکھنے والا علم ہے، اسلامی تعلیمات سے بڑھ کر جدید کوئی اور تعلیم نہیں ہوسکتی، کیوں کہ انسان کے وضع کئے ہوئے اصول و قواعد تو دس بیس سال میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن یہ زندۂ و پائندہ اور سدا بہار ہیں، لیکن مذہبی تعلیم اور عام تعلیم کے درمیان فرق کرنے کے لئے اس تعبیر کے استعمال کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

یہ عصری علوم نہ مذہب سے متصادم ہیں اور نہ مذہب کی رہنمائی سے بے نیاز، بعض لوگوں کے ذہن میں یہ واہمہ ہے کہ اسلام اور جدید سائنس وٹکنالوجی دو متضاد چیزیں ہیں، اور اگر اسلام اس کا مخالف نہیں تو کم از کم علماءِ اسلام اس کے مخالف ہیں، لیکن یہ دونوں ہی باتیں خلافِ واقعہ ہیں، سائنس وٹکنالوجی کا کام وسائل و ذرائع پیدا کرنا ہے اور اسلام وسائل کو استعمال کرنے کا طریقہ بتاتا ہے اور مقاصد کی رہنمائی کرتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام جدید علوم کے لئے معاون اور رہنما ہے، جیسے ٹریفک پولیس ٹریفک کی رہنمائی کرتی ہے اور سمتِ سفر بتاتی ہے، اسی طرح مذہب سائنس کو راستہ بھٹکنے سے روکتا ہے، ایسی صورت میں ٹکراؤ اور تصادم کا کیا سوال ہے؟ اور جو چیز اسلام کے خلاف نہ ہو، علماء کی طرف سے اس کی مخالفت کے کوئی معنی نہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج جو طلبہ عصری درس گاہوں میں پڑھ کر نکلتے ہیں، ان میں ایک بڑی تعداد دین سے بے بہرہ لوگوں کی ہے اور ایک قابل لحاظ تعداد تو دین بیزار لوگوں کی ہوتی ہے، اس میں کچھ ذمہ داری علماء پر بھی عائد ہوتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی مسلمان سماج پر علماء کی جو گرفت ہے، اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی، مساجد کا نظام علماء کے ہاتھ میں ہے، مدارس کی بہار ان کے دَم سے قائم ہے، بہت سی دینی جماعتوں اور تنظیموں میں وہ قبلہ نما کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ماڈرن ایجوکیشن اور ٹیکنیکل تعلیم کی طرف انھوں نے توجہ نہیں کی، اگر وہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کرتے تو ان اداروں کی کچھ اور ہی شان ہوتی اور ان کی افادیت کئی چند ہوجاتی، اس سلسلہ میں کم از کم دو باتیں تو بالکل ظاہر و باہر ہیں :

ایک یہ کہ ان درس گاہوں میں جدید تعلیم اور سرکاری نصاب کی رعایت کے ساتھ ساتھ بنیادی دینی تعلیم نصاب کا جزو ہوتی اور پوری اہمیت کے ساتھ دینی تعلیم کا نظم ہوتا، اس وقت

مسلمانوں کے زیر انتظام جو اسکول قائم ہیں، ان میں سے اکثر میں تو دینی تعلیم کا کوئی نظم ہی نہیں اور اگر بعض اداروں میں ہے بھی تو وہ انگشتِ ششم کی طرح ہے، نہ اساتذہ اسے اہمیت دیتے ہیں اور نہ طلبہ وطالبات، انتظامیہ نے بھی اسے ایک ترغیبی ہتھیار کے طور پر رکھا ہے؛ کیوں کہ بحمد اللہ مذہب کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور اس قسم کی ترغیبات اولیاءِ طلبہ کو متوجہ کرتی ہیں۔

انسانی فکر پر تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحول کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات ماحول کا اثر تعلیم سے بھی بڑھ جاتا ہے، اگر علماء اور اہلِ دین ایسے ادارے قائم کرتے تو ان میں بہتر معیارِ تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی اسلامی تربیت کا نظم بھی ہوسکتا تھا، ان کا یونیفارم شریعت کے دائرہ میں رکھا جاتا، ان کے لئے نمازوں کا اہتمام کیا جاتا، بالغ اور قریب البلوغ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے جداگانہ تعلیم کا نظم کیا جاتا، بچوں کو ایسے ترانے پڑھائے جاتے جو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ہوں، وہ موقع کی مناسبت سے مختلف اسلامی عبادات اور تقریبات سے آگاہ ہوتے اور دینی ماحول میں ان کی نشو ونما ہوتی، اس طرح وہ مستقبل میں دین دار ڈاکٹر، دین دار انجینئر، دین دار وکیل اور مختلف شعبوں میں اسلامی فکر وعمل کے ترجمان اور نقیب ہوتے اور پورے معاشرہ پر ان کی گہری چھاپ ہوتی، آپ کسی ایسے معاشرہ کا تصور کیجئے جس میں مسجد کے امام سے لے کر الیکٹریشن اور پلمبر تک ہر پیشہ کا آدمی دین آگاہ، دین شناس اور دین دار ہو، کہ وہ سماج کس قدر صاف ستھرا اور پاکیزہ ہوگا!

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ تعلیم سستی ہوتی، علماء نے مدارس کی صورت میں جو نظامِ تعلیم قائم کیا، اس کی اساس اس پر ہے کہ قوم کے اصحابِ ثروت سے پیسے وصول کئے جائیں، چاہے اس کے لئے ان کی خوشامد کرنی پڑے اور تحقیر وتذلیل سے دوچار ہونا پڑے، اور ان پیسوں سے قوم کے غریب لوگوں کی جھونپڑیوں تک علم کی روشنی پہنچائی جائے، جو دینی علوم آج کل دینی مدارس میں دیئے جارہے ہیں، ایک زمانہ میں یہ تعلیم نوابوں کے محلات اور جاگیر داروں کی کوٹھیوں میں ہوا کرتی تھی اور عام مسلمانوں کی رسائی سے باہر تھی، لیکن اللہ جزاءِ خیر دے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء کو، کہ انھوں نے مدارس کے نظام کو قائم کیا اور عام سے عام آدمی پر

بھی علم کے دروازے کھول دیئے، اگر علماء نے ماڈرن ایجوکیشن کو اپنے ہاتھ میں لیا ہوتا، تو مجھے یقین ہے کہ یہ ایک خدمت ہوتی نہ کہ تجارت، اور سماج کے غریب و بے کس لوگ بھی اپنے بچوں کو تعلیم سے بہرہ ور کر سکتے، افسوس کہ اس وقت جن مسلمانوں نے عصری تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں، دو چار کو چھوڑ کر سبھوں کا مقصد لوگوں سے پیسے وصول کرنا اور انھیں اپنے آپ پر خرچ کرنا ہے، عیسائی مشنریز کے اسکول ایک اچھی مثال ہیں، جو مذہبی مفاد کے تحت چلائے جاتے ہیں، یہ اسکول جہاں ایک طرف دولت مند حضرات سے بھاری فیس اور ڈونیشن کی رقمیں وصول کرتے ہیں، وہیں ہریجن اور دلت بچوں کے لئے مفت تعلیم بلکہ اس کے ساتھ ترغیبات کا بھی نظم کرتے ہیں، اگر علماء اسی مذہبی اسپرٹ کے ساتھ ان اداروں کو چلاتے اور اس کا تعلیمی معیار بہتر رکھتے، تو امت کے غریب لوگوں کے لئے علم کی روشنی پہنچانے کا سامان کر سکتے تھے، کیوں کہ بے غرضی اور قناعت کے ساتھ کام کرنا ان کی سرشت میں ہے۔

ہر مسلمان پر یہ بات واجب ہے کہ وہ پوری امت کا خیر خواہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ ؓ سے اس پر بیعت لی، کہ وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں گے ''والنصح لکل مسلم'' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۸، مسلم، حدیث نمبر: ۵۶) تو ایک فیصد یا اس سے کم طلبہ جو مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہوں، ان کی خیر خواہی کے لئے تو ہم بڑی بڑی جامعات اور عظیم الشان دار العلوم قائم کر رکھے ہیں اور ننانوے فیصد بلکہ ان سے زیادہ قوم کے بچے جو عصری تعلیم کے شعبوں میں ہیں، کیا ان کی خیر خواہی ہم پر واجب نہیں؟ اور کیا اس سے بھی بڑھ کر خیر خواہی ہو سکتی ہے کہ ہم مسلمان باقی رہنے میں ان بچوں کا تعاون کریں؟ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اب علماء دینی درس گاہوں کے ساتھ ساتھ ماڈرن ایجوکیشن اور ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بھی قائم کریں، جن میں تعلیم اعلیٰ معیار کی ہو اور تربیت کے لئے خالص اسلامی ماحول فراہم ہو۔

۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ/ ۴/ جولائی ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

ثانوی زبان کا انتخاب

علامہ فارابی نے انسان کی تعریف ایک ایسے ذی روح سے کی ہے جو بولنے کی اور نطق کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ فلاسفہ اور علماءِ منطق کی بارگاہ میں اس تصور نے ایسا قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل کیا، کہ 'حیوان ناطق' ہی سے انسان کی تعریف کی گئی، واقعہ ہے کہ یوں تو انسان کو بہت سی چیزیں جانوروں اور دوسری مخلوقوں سے ممتاز کرتی ہیں، وفورِ عقل وشعور، فہم و ادراک کا کمال، اختراع وایجاد کی صلاحیت، عقل کے ذریعہ مخلوقاتِ عالم کو مسخر کر لینے کی قوت اور نہ جانے کیا کیا؟؟ لیکن انسان کا جو امتیاز سب سے زیادہ ظاہر و واضح ہے اور پہلی نظر میں سامنے آتا ہے، وہ اس کی قوتِ گویائی، بولنے، اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے اور دل کی بات زبان تک لانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان میں بول کی ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ جو زبان وبیان کے ماہر ہوں، شبنم کو شعلہ اور شعلہ کو شبنم کرنا ان کے لئے ایک معمولی سا کام ہے۔

پھر جیسے خدا نے کائنات کی اس بستی کو گلہائے رنگارنگ سے سجایا ہے اور بسایا ہے، یہی رنگارنگی زبان وبیان کے معاملہ میں بھی رکھی گئی ہے، گھوڑوں کے ہنہنانے، کتوں کے بھونکنے، شیروں کے چنگھاڑنے اور گدھوں کے بے ہنگم آواز لگانے میں کیسی یکسانیت ہے؟ مغرب ہو کہ مشرق، شمال ہو یا جنوب، ایشیا ہو یا یورپ، جانوروں نے ہم آوازی اور صوتی ہم آہنگی پر گویا اتفاق کرلیا ہے، لیکن یہ حضرت انسان ہیں کہ ہر ملک کی زبان الگ الگ ہے، ایک ملک کے مختلف صوبوں اور ایک صوبہ کے مختلف شہروں اور علاقوں کی بولیوں اور لب ولہجہ میں بھی فرق اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ انھیں سمجھنے اور پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، اس طرح خدا نے اس کائنات کو رنگ برنگ کے پھولوں، مختلف ذائقہ کے پھلوں اور نوع بنوع جانوروں اور مختلف شکل وصورت کے انسانوں کی طرح مختلف زبانوں اور بولیوں اور ان کو کاغذی پیرہن عطا کرنے

کے لئے الگ الگ تحریروں اور خطوں سے بھی سنوارا ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی زبانوں کی کثرت کے اعتبار سے ایک مثال ہے، بلکہ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہوں، چودہ زبانیں تو سرکاری طور پر مسلّمہ ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی کتنی ہی زبانیں ہیں، جو مروّج عام و خاص ہیں، ان میں بعض قواعد وضوابط کے دائرہ میں آچکی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن کی گرامر بھی ابھی تشنہ تدوین ہے، بین الاقوامی رابطہ اور سائنس وٹکنالوجی کی نسبت سے انگریزی کا شمار تعلیمی اعتبار سے ملک کی اہم ترین زبان میں ہوتا ہے، اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ بحالتِ موجودہ انگریزی زبان ایک بڑی ضرورت ہے، جس سے قوموں کے علمی، فنی اور معاشی مفادات متعلق ہیں۔

انگریزی کے علاوہ ملک کی تمام ریاستوں میں ریاستی زبان کو اوّلیت حاصل ہے اور ایسا ہونا ایک فطری امر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعلیم گاہوں میں مختلف مشرقی زبانوں کو ہندوستان سے روابط کی اساس پر ثانوی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، ان زبانوں میں اہم ترین زبان ''عربی زبان'' بھی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ نہ صرف سرکاری اداروں اور مسلمانوں کے زیر انتظام درس گاہوں بلکہ غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی تعلیم گاہوں میں بھی معاشی مواقع کی توقع اور مسلمان طلبہ وطالبات کو ترغیب کے نقطۂ نظر سے یہ سہولت مہیا کی گئی ہے، اور اس شعبہ میں اکثر علماء یا کم سے کم دین دار سند یافتہ حضرات کو خدمت کا موقع مل جاتا ہے، اس طرح یہ بالواسطہ طریقہ پر اسلام کی مبادیات کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لئے بہترین ذریعہ ووسیلہ ہے۔

عربی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ہے، بلکہ سب سے قدیم انسانی زبان کہا جائے تو بے جا نہ ہو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی زبان عربی ہی تھی، (روح المعانی: ۷/ ۲۵۸) جس زبان کو تاریخ میں سریانی زبان کہا جاتا ہے، وہ بھی دراصل عربی ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے، سوریا (شام) میں عربی نے جو مقامی

لہجہ اختیار کیا وہی سریانی سے موسوم ہوگیا، اس وقت دنیا میں جو زبانیں مروّج ہیں، عام طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور کے ادوار سے ان کا رشتہ جوڑا جاتا ہے، چنانچہ متعدد زبانیں اسی رشتہ کی بنا پر سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں، اکثر سامی زبانیں اپنی اصل صورت میں دنیا سے ناپید ہو چکی ہیں، عربی اور عبرانی یہ دو زبانیں باقی ہیں، عبرانی بھی گویا مردہ ہی ہو چکی تھی، لیکن یہودیوں نے کسی نہ کسی طرح اس زبان کو باقی رکھا اور اسرائیل کے قیام سے اس زبان کو ایک نئی زندگی مل چکی ہے، لیکن عربی زبان سدا زندہ و پائندہ رہا کی ہے اور آج بھی اس کی وسعت وارتقاء کا دائرہ فزوں تر ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کا قریشی لہجہ حضرت اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام کا اسلوبِ کلام ہے (دیکھئے: روح المعانی: ۷/۲۵۹) اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات مقدر تھی کہ کتاب ہدایت کا آخری ایڈیشن 'قرآن مجید' عربی مبین کے خوبصورت پیرہن میں ملبوس ہو کر دنیا کو اپنے جلوۂ جہاں آراء سے درخشاں کردے، اس لئے ضرور تھا کہ قدرت کی جانب سے اس زبان کی حفاظت ہو، چنانچہ صحرائے عرب کے امی بدویوں کے ذریعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثتِ مبارک تک پوری قوت و طاقت اور لسانی حسن و جمال کے ساتھ اس زبان کی حفاظت ہوتی رہی، پھر اسی مبارک زبان میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لے لیا۔

یہ نہ صرف قرآن کی حفاظت کا ذمہ ہے، بلکہ عربی زبان اور عربی کے اس اسلوب اور ادب کی حفاظت وصیانت کی بھی ذمہ داری ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، ایک طویل عرصہ ایسا گذرا ہے جس میں عربی زبان سے کوئی بڑا معاشی اور اقتصادی مفاد متعلق نہیں تھا، علم وتحقیق کی دنیا سے بھی اس کا رشتہ کمزور ہو چکا تھا اور یورپ کی زبانوں نے اس کی جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود نہ صرف یہ زبان محفوظ رہی، بلکہ وہ ادب اور اسلوب بھی جوں کا توں باقی رہا اور لکھنے پڑھنے والوں کے لئے نمونۂ عمل اور اسوۂ تقلید بنا رہا جو قرآن وحدیث کا ہے اور اس سلسلہ میں مستشرقین اور عیسائی عرب ادباء کی ناروا کوششیں اور سازشیں بھی ناکام ونامراد ہی رہیں۔

عربی زبان نہ صرف اس دنیا کی زبان ہے، بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی قبر کی اور اہل جنت کی زبان بھی ہوگی، (دیکھئے: کشف الخفا: ۱/۵۴) اسی لئے آپ ﷺ نے عربی زبان سے محبت کا سبق دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عجمی علاقے فتح ہو رہے تھے، آپ رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے، (کنز العمال، حدیث نمبر: ۹۰۳۷) سلف کی نگاہ میں اس زبان کی ایسی اہمیت تھی کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص اچھی طرح عربی بول سکتا ہو، اس کے لئے غیر عربی میں گفتگو کرنا کراہت سے خالی نہیں۔ (روح المعانی: ۷/۲۶۰)

دینی نقطۂ نظر سے قطع نظر اس وقت عالمی روابط اور معاشی و اقتصادی رشتہ کے اعتبار سے بھی اس زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، دنیا میں بیس سے زیادہ ممالک 'جن کا تعلق ایشیا اور افریقہ سے ہے' کی سرکاری زبان عربی ہے، دنیا کی آٹھ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ایک عربی زبان کا شمار ہے، یہ اقوامِ متحدہ کی پانچ سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے، امریکہ و یورپ سے لے کر مشرقِ بعید تک ہر جگہ دانش گاہوں میں عربی کے شعبے قائم ہیں، اور اسلام سے مربوط ہونے کی وجہ سے چین ہو یا جاپان، اور انڈونیشیا ہو یا ایران و ترکی، روسی جمہوریائیں ہوں یا یورپ و افریقہ کے ممالک اور امریکہ و کناڈا، ہر جگہ مسلمان اور عرب تارکین وطن کی وجہ سے کچھ نہ کچھ عربی بولنے والے ضرور مل جاتے ہیں، اور مسلمانوں کے لئے تو یہ زبان عالمی رابطہ کی زبان ہے، اور یہی زبان انھیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ سکتی ہے، خلیجی ممالک میں تیل کے گہرے ذخائر کی دریافت اور اس کی نسبت سے انسانی وسائل کی کمی نے بر صغیر کے لوگوں کو روزگار کی ایک نئی دنیا سے ہم کنار کیا ہے اور آج اس کے گہرے اور وسیع اثرات ہر جگہ محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

اس پس منظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان طلبہ و طالبات ثانوی زبان کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ عربی زبان کا انتخاب کریں، اور اس میں محنت بھی کریں، اولیاءِ طلبہ اس پر زور دیں، اس طرح جن اسکولوں میں عربی تعلیم کا انتظام نہیں ہے وہاں عربی استاذ کا نظم بھی ہوسکے گا، یہ تعلیم انھیں قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت سے مربوط کرے گی

اور گویا بالواسطہ طور پر اس کی دینی واخلاقی تعلیم وتربیت بھی ہو سکے گی اور مستقبل میں جو لوگ خلیجی ممالک میں روزگار کے خواہشمند ہوں گے، یہ ان کے لئے معاون بھی ثابت ہوگی۔

بہت سی یونیورسٹیوں میں شعبۂ عربی میں طلبہ کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ بہت سے اداروں میں شعبۂ عربی میں غیر مسلم طلباء کی تعداد بھی زیادہ ہے اور ان کی دلچسپی بھی، اور ظاہر ہے کہ اس کا سبب محض مادّی منفعت ہے، اگر مسلمان طلبہ اس شعبہ میں دلچسپی نہیں لیں، تو آہستہ آہستہ یہ شعبے ختم ہو سکتے ہیں اور پھر نیچے کی سطح پر ثانوی زبان کی حیثیت سے عربی زبان کی جو سہولت رکھی گئی ہے، اس کا باقی رہنا بھی مشکوک ہو جائے گا، اس لئے مسلمان طلبہ وطالبات کو اس پر خاص توجہ دینی چاہئے اور امت کے ذمہ دار لوگوں کو عام مسلمانوں میں یہ رجحان پیدا کرنا چاہئے۔

عربی زبان نہ صرف اس لئے مقدس ہے کہ وہ علومِ اسلامی کی امین ہے اور نہ صرف اس لئے مفید وکارآمد ہے کہ اس سے آج معاشی واقتصادی مفادات متعلق ہو گئے ہیں، بلکہ یہ بجائے خود ایک خوبصورت، طاقتور، اثر انگیز اور جامع ترین زبان ہے، ایک ہی شئے اور ایک ہی کیفیت میں معمولی معمولی تفاوت کے اظہار کے لئے الگ الگ تعبیرات کا جو عظیم الشان ذخیرہ عربی زبان میں ملتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال مل سکے، اگر صرف ابن جنی (متوفی: ۳۹۲ھ) کی ''الخصائص'' اور ابن سیدہ اندلسی کی ''المخصص'' ہی کو دیکھ لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زبان کے اندر اظہار وبیان میں کس قدر تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے، کاش ہم اس جانب متوجہ ہوں!

۹/ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ ۸/ اگست ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

......ساری دنیا کی دولت سے بڑھ کر

فروخ کی عمر تیس کے آس پاس ہو چکی تھی اور ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہ نکاح کی ڈوری میں بندھے تھے، ان کی نئی نویلی دلہن کے پیٹ میں ان کی امانت پرورش پا رہی تھی، اسی درمیان جہاد کا اعلان ہوا اور فرّوخ نے اس مہم میں شرکت کا مصمم ارادہ کرلیا، بیوی اپنے شوہر کے اس ارادہ کو سن کو تھوڑی دیر کے لئے سہم گئی اور کہنے لگی کہ تم مجھے کس کے بھروسہ پر چھوڑ رہے ہو؟ مدینہ میں تم غریب الوطن شخص ہو، نہ یہاں تمہارا خاندان ہے اور نہ دوسرے رشتہ دار ہیں، فرّوخ نے کہا: میں تمہیں اللہ کے بھروسہ چھوڑ کر جا رہا ہوں اور پھر میں تمہیں تیس ہزار دینار کی خطیر رقم بھی تو دے کر جا رہا ہوں، تم اس کو حفاظت سے رکھنا، تجارت میں لگانا، اپنے آپ پر اور اپنے بچے پر خرچ کرنا، یہاں تک کہ میں یا تو صحیح سلامت اور مالِ غنیمت سے مالا مال ہو کر واپس لوٹوں یا اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کردوں، جو میری اصل خواہش اور آرزو ہے، پھر فرّوخ نے اپنی بیوی اور اس کے پیٹ میں پلنے والے اپنے لختِ جگر کو خیر باد کہا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔

فروخ کی بیوی بڑی ذہین اور ہوشمند خاتون تھیں، چند ماہ بعد ولادت ہوئی اور چاند جیسا بچہ اس کے گھر میں طلوع ہوا، ماں نے اس کا نام ربیعہ رکھا، ننھے منے بیٹے کی محبت اس کے لئے شوہر کے طویل فراق کے غم کو کم کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھا، اس نے بڑے پیار اور چاہ کے ساتھ اس نومولود کی پرورش کرنی شروع کی، پھر جب وہ پڑھنے لکھنے کے لائق ہوا تو پہلے انھیں نوشت وخواند کی تعلیم دلائی، پھر قرآن مجید حفظ کرایا، وہ اپنے بچہ کی تعلیم پر خوب توجہ دیتی اور اس کے اتالیق واساتذہ پر انعام واکرام کی بارش کرتی رہتی۔

عرصہ گزر گیا، لیکن فروخ نہیں آئے اور ان کی فرقت کا عرصہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا، کسی نے کہا وہ دشمنوں کے ہاتھ میں قید ہو چکے ہیں، کوئی کہتا کہ وہ مسلسل جہاد میں مشغول ہیں،

کسی نے خبر دی کہ وہ شہادت سے سرفراز ہو چکے ہیں، فرّوخ کے گھر یہ اڑتی ہوئی خبریں پہنچتیں اور جگر کو پاش پاش کر جاتیں۔

ربیعہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے اور نہ صرف اسلامی علوم سے آراستہ ہو چکے تھے، بلکہ اپنے ہم عصروں پر امتیاز وتفوق بھی رکھتے تھے، لوگوں نے ربیعہ کی غمزدہ ماں کو بہت سے مشورے دیئے کہ وہ اپنے بچے کو کوئی ہنر سکھانے کی کوشش کرے، تاکہ وہ اپنی ضروریات بھی پوری کر سکے، اور اپنی ماں کی بھی، لیکن اس حوصلہ مند خاتون کی بلند نگاہی اس پر قانع نہ تھی، وہ چاہتی تھی کہ ربیعہ علم وعمل کا ایک چراغ گھر بار بن کے روشن ہو، ربیعہ اپنی ماں کی ہدایت پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے رہے اور درسِ حدیث کے حلقوں سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے، انھوں نے صحابی رسول ﷺ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا اور اکابر تابعین سعید بن مسیّبؒ، مکحولؒ اور سلمہ بن دینارؒ جیسے اہل علم کے سامنے زانوئے تلمیذ تہہ کیا، یہاں تک کہ حدیث وفقہ کے نیر تاباں بن کر مدینہ کے علمی افق پر چھا گئے اور بڑے بڑے اہل علم کے لئے ان کا تلمذ شرف وسعادت قرار پایا۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا، گرما کی چاندنی سے ڈھلی ہوئی ایک رات تھی، کہ مدینہ میں ایک شہ سوار داخل ہوا، اس کی عمر ساٹھ کے قریب ہو چکی تھی، وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہا تھا اور خیالات کا ایک ہجوم اس کے حافظہ کے افق پر یکے بعد دیگرے طلوع ہو رہا تھا، کیا اس کا مکان اسی حالت پر باقی ہوگا؟ اس کے جانے کے بعد اس کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا یا لڑکی؟ نومولود زندہ ہے یا مر گیا؟ اور زندہ ہے تو کس حال میں ہے؟ اس کی نوجوان بیوی کس حالت میں ہے؟ کیوں کہ وہ تقریباً تیس سال کے بعد واپس آرہا تھا تیس ہزار دینار کی خطیر رقم بھی اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی، یہ وقت عشاء کے بعد کا تھا، لوگوں کی آمد ورفت جاری تھی، لیکن اب اسے پہچاننے والے یا تو لوگ نہیں تھے، یا تھے تو بھول چکے تھے، خیالات کے اسی طوفان میں وہ اپنے مکان کے سامنے پہنچ گیا، اس کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ خوشی کے اتھاہ جذبہ کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔

گھر میں ایک نوجوان موجود تھا، اس نے جو دیکھا کہ ایک شخص اپنے گلے میں تلوار لٹکائے داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو تیزی سے آگے بڑھا اور کہنے لگا: اللہ کے دشمن! تم رات کی تاریکی میں میرے گھر میں داخل ہو رہے ہو، آواز تیز ہوگئی اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے، پڑوس کے لوگ بھی دوڑے اور اس نو وارد کو پکڑنے کی کوشش کی اور آخر اس کو قابو میں کیا، لوگوں نے کہا: اللہ کے دشمن! ہم لوگ تمہیں والیٔ شہر کے پاس لے جا کر ہی رہیں گے، نو وارد نے لجاجت کے ساتھ کہا: نہ میں خدا کا دشمن ہوں اور نہ میں نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے، یہ میرا ہی مکان ہے، جسے میں نے اپنے پیسوں سے خریدا ہے، کیا پڑوسیوں میں کوئی شخص ایسا نہ رہا جو فرّوخ کو پہچانے؟ میں تیس سال پہلے جہاد کے لئے گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں۔

اس چیخ پکار میں خاتونِ خانہ کی بھی آنکھ کھل گئی اور اس نے بالا خانہ سے جھانک کر آنے والے کا ڈیل ڈول دیکھا اور نوجوان کو آواز دی: ربیعہ! انھیں چھوڑ دو، یہ تمہارے والد فرّوخ ہیں، پھر آنے والے شخص سے کہا: فرّوخ! یہ تمہارے بیٹے اور گوشۂ جگر ہیں، پھر کیا تھا، باپ اور بیٹے دونوں مغلوب الجذبات ہو گئے، فرّوخ نے ربیعہ کو گلے لگایا اور ربیعہ نے اپنے باپ کی (جسے وہ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا) پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کے ہاتھ چومے اور جن لوگوں نے اس ناخوشگوار واقعہ کا خوشگوار اور جذباتی اختتام دیکھا، وہ واپس ہو گئے۔

فروخ کے بارے میں اس کی بیوی کو کوئی امید باقی نہیں رہی تھی کہ وہ پھر واپس آسکے گا، اس لئے اس تین نفری خاندان کے لئے گویا آج کا دن عید کا دن تھا، لیکن بیوی پر خوف کا ایک سایہ بھی لہرا رہا تھا، کہ اگر اس کے شوہر نے اس سے تیس ہزار دینار کے بارے میں سوال کیا تو وہ انھیں کیا جواب دے گی؟ اور اگر اس نے کہا کہ اتنی بڑی رقم صرف اس ایک بچہ کی تعلیم پر خرچ ہوگئی ہے تو کیا یہ بات اس کے شوہر کے لئے قابل قبول ہوگی؟ وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ آخر اس کا شوہر بول ہی پڑا: ''میں چار ہزار دینا ساتھ لایا ہوں، میں نے تمہارے پاس جو رقم چھوڑی تھی اسے نکالو تو ان دونوں کو ملا کر کوئی باغ یا کوئی مکان وغیرہ خرید کیا جائے'' بیوی نے ٹال دیا، لیکن فروخ نے دوبارہ پھر یہی سوال کیا، بیوی نے کہا: میں نے اسے ایک مناسب جگہ رکھ دیا

ہے، چند دنوں بعد نکالوں گی، فجر کا وقت ہو گیا، فروخ نے تیاری کی، مسجد کے لئے نکلے، اس نے ربیعہ کے بارے میں پوچھا، بتایا گیا: وہ اس سے پہلے مسجد جا چکے ہیں، فروخ مسجدِ نبوی ﷺ پہنچے، نماز ختم ہو چکی تھی، انھوں نے جلدی جلدی نماز ادا کی، پھر روضۂ اطہر پر حاضر ہوئے، پروانہ وار صلاۃ وسلام پیش کیا، پھر کچھ نفلیں پڑھیں، جی بھر کر دعائیں مانگیں، اب جو نکلنا چاہا تو دیکھا کہ ایک شیخ بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کے گرد طالبانِ علم کا ایسا ہجوم ہے کہ گویا شمع کے گرد پروانے ہوں اور کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے، اس مجمع میں قلم اور کاغذ تھامے ہوئے نوجوان بھی ہیں اور عمر دراز بوڑھے بھی، اور وہی نوعمر شیخ تمام حاضرین کی توجہ کا مرکز ہیں، لوگ ان کے ایک ایک لفظ کو ایسی توجہ سے سنتے ہیں کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، اور منادی ایک ایک فقرے کو ایک صف سے دوسری صف تک پہنچا رہے ہیں، فروخ نے ہزار کوشش کی کہ شیخ کی صورت دیکھیں، لیکن فاصلہ کی وجہ سے دیکھ نہیں پائے، البتہ ان کے چشم کشا بیان، غیر معمولی حافظہ اور سمندر کی طرح ابلتے ہوئے علم نے ان کو اپنا مسحور بنا لیا تھا اور پھر ان کے سامنے لوگوں کا تواضع اور بچھاؤ کا ایسا منظر تھا جو فرّوخ کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔

درس ختم ہوا، شیخ اٹھے اور لوگوں کی ایک بھیڑ ان کے ساتھ ہو گئی، فرّوخ نے اپنے بازو کے شخص سے پوچھا کہ یہ شیخ کون ہیں؟ اس نے حیرت سے جواب دیا: کیا تم مدینہ کے باشندہ نہیں ہو؟ کیا مدینہ میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو شیخ سے واقف نہ ہو؟ فروخ نے کہا: میں تیس سال سے مدینہ سے باہر تھا اور رات ہی واپس آیا ہوں، اس شخص نے کہا: اب میں تمہیں شیخ کے بارے میں بتاتا ہوں، وہ تابعین میں کے اکابر میں سے ایک ہیں، مدینہ کے محدث وفقیہ اور نو عمری کے باوجود اس شہر کے امام ہیں، فروخ نے کہا: ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ، پھر وہ صاحب کہنے لگے: شیخ کی مجلس میں مالک ابن انسؒ، ابوحنیفہؒ، یحییٰ بن سعید انصاریؒ، سفیان ثوریؒ، عبدالرحمٰن اوزاعیؒ، لیث بن سعدؒ اور اس پایہ کے دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں، وہ بڑے ہی خوش اخلاق، متواضع اور سخی ہیں، اہل مدینہ نے ان سے بڑھ کر سخی اور دنیا کے معاملہ میں ان سے بڑھ کر زاہد اور بے رغبت شخص نہیں دیکھا۔

فروخ ان کا نام سننے کے لئے بے چین تھے، فروخ نے کہا: لیکن تم نے اب تک مجھے ان کا نام نہیں بتایا؟ اس شخص نے کہا: یہ ربیعۃ الرای ہیں، فروخ نے کہا: ربیعۃ الرائی؟ جواب ملا: ہاں، ان کا اصل نام ربیعہ ہے، لیکن جب وہ کسی معاملہ میں قرآن وحدیث کی صراحت نہیں پاتے تو اجتہاد سے کام لیتے ہیں، اور رائے پر فتویٰ دیتے ہیں، اسی لئے ان کا نام ہی ''ربیعۃ الرائی'' پڑ گیا ہے، فروخ نے ان کے والد کا نام پوچھا، اس شخص نے کہا: ان کے والد کا نام فروخ ہے، وہ اپنے والد کے سفر جہاد پر جانے کے بعد پیدا ہوئے اور ان کی ماں نے ان کی تعلیم و تربیت کی، میں نے ابھی نماز سے پہلے لوگوں سے سنا ہے کہ شاید گزشتہ رات وہ واپس آ گئے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ فروخ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ پڑا، وہ تیز تیز اپنے گھر کی طرف آئے، بیوی نے شوہر کی نم آنکھوں کو دیکھا تو بے چین ہو گئیں اور بول پڑیں: ابو ربیعہ! تمہیں کیا ہوا ہے؟ فروخ نے کہا کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں، میں نے آج اپنے لڑکے ربیعہ کو علم اور مقبولیت کے ایسے بلند مقام پر دیکھا ہے کہ اب تک کسی اور کو ایسا سعید بخت نہیں دیکھا، فرّوخ کی بیوی نے موقع غنیمت سمجھا اور استفسار کیا: تمہیں تیس ہزار دینار محبوب ہیں یا تمہارے لڑکے نے جو مرتبہ و مقام حاصل کیا ہے؟ فروخ نے کہا: خدا کی قسم! یہ مجھے پوری دنیا کے مال و اسباب سے زیادہ محبوب ہے، بیوی نے کہا: تم نے میرے پاس جو پیسے چھوڑے تھے، وہ میں نے اسی کام پر خرچ کئے ہیں، کیا تم کو میرا یہ عمل پسند ہے؟ فروخ نے کہا: ہاں، اور اللہ تعالیٰ تم کو میری طرف سے بھی، میرے لختِ جگر کی طرف سے بھی اور تمام مسلمانوں کی طرف سے بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے!!

یہ وہی ربیعہ ہیں جو امام مالکؒ کے خاص استاد ہیں، اور یہ علمِ دین کی برکت ہے، جس نے شفقت سے محرومی کے زیر سایہ بچپن اور نوخیز جوانی گزارنے والے شخص کو علم وفضل کے اس مقام پر پہنچایا، کسے معلوم تھا کہ یہ بے سہارا بچہ ربیعۃ الرائے بنے گا اور اس سے علم کا ایسا چشمہ جاری ہوگا کہ مشرق سے مغرب تک طالبانِ علم اس سے اپنی پیاس بجھائیں گے، آج کتنی مائیں

ہیں جو اپنے بچوں کو خدا کی خوشنودی کے لئے علمِ دین سے آراستہ کر کے ربیعہ بنانا چاہتی ہیں؟ اور کتنے فروخ ہیں جو اپنی محنت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اپنی اولاد کو علم دین کی دولت سے سرفراز کرنے کو تیار ہیں؟؟

۵/شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ ۱۹/نومبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

دینی مدارس پر امریکہ کی نظر

بیسویں صدی اس طرح گزری کہ امریکہ اور روس دو مقابل طاقتیں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں، یہ چوں کہ ایک دوسرے کے دانا دشمن تھے، اس لئے براہِ راست ان دونوں کے درمیان کوئی جنگ برپا نہیں ہوئی، لیکن سرد جنگ کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے ہتھیار مختلف ملکوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے رہتے تھے، روس میں اشتراکیت کا جو نظام وجود میں آیا، اس کی بنیاد سرمایہ داروں کی طرف سے غریبوں اور مزدوروں کا استحصال تھا اور یہ استحصال آج بھی ٹھیک اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا، آج بھی جو مزدور زندگی بھر کپڑے بنتا ہے، اس کے پاس تن ڈھنکنے کے لئے سلیقہ کا کپڑا نہیں ہوتا، جو ہاتھ شب و روز دیواریں کھڑی کرنے اور چھتیں چننے میں غبار آلود رہتے ہیں ان کا مقدر گندی جھونپڑیاں اور میلے کچیلے فٹ پاتھ ہوا کرتے ہیں، جن کا گرم پسینہ اور خونِ جگر زمین سے پیداوار گھر تک لانے میں خرچ ہوتا ہے ان کا حق دو کفِ جو سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا، اس لئے جس سماجی اور اقتصادی ظلم و بربریت کی بنیاد پر اشتراکی تحریک وجود میں آئی تھی، وہ آج بھی اسی طرح دنیا میں موجود ہے۔

لیکن یہ تحریک چوں کہ ردّ عمل میں پیدا ہوئی تھی اور ردّ عمل کی نفسیات یہ ہے کہ انسان دامن اعتدال کو چھوڑ دیتا ہے اور غلو اور انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے، چنانچہ اشتراکیت کے علمبردار اسی نفسیات کا شکار ہو گئے، انھوں نے ''عدل'' کے بجائے ''مساوات'' نعرہ لگایا، جو ایک غیر فطری نعرہ تھا، خدا نے اس کائنات میں مساوات کا قانون نہیں رکھا ہے، بلکہ قدم قدم پر قوتوں، صلاحیتوں اور ضرورتوں میں تفاوت رکھا ہے اور اسی تفاوت سے اس کائنات کا حسن متعلق ہے، اس لئے صحیح طریقۂ کار یہ ہے مساوات کے بجائے عدل قائم کیا جائے، اس مساوات کے لئے اشتراکی حضرات نے انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کے تصور کو

آگے بڑھایا، یہ بھی ایک خلافِ فطرت بات تھی، کیوں کہ انسان اپنی ذاتی املاک پر جو محنت کرتا ہے اور جیسی توجہ دیتا ہے، اجتماعی املاک پر اس درجہ توجہ نہیں دیتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی دفاعی طاقت تو بدستور قائم رہی، لیکن اندر ہی اندر اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

۱۹۸۹ء میں یہ واقعہ پیش آیا، مسلمانوں نے اسے بظاہر نیک شگون سمجھا، کیوں کہ روس کے بطن سے پانچ آزاد مسلم جمہوریتیں برآمد ہوئیں، بڑی خونریزی اور تباہی و بربادی کے بعد مشرقی یورپ کے قلب میں ایک مسلم مملکت ''بوسنیا'' نے اپنے وجود کو ثابت کیا، البانیا نے اپنی اشتراکی بساط لپیٹی اور ایک مسلمان ملک کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی، اس کے علاوہ چیچنیا، انگشتیا، کوسووو غیرہ کئی مسلم ریاستیں (جن کے نام تک صفحۂ ذہن سے مٹ چکے تھے) ایک بار پھر عالمی سطح پر ان کے وجود کو محسوس کیا گیا۔

لیکن اشتراکیت کے سقوط کا دوسرا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ دنیا میں دوسوپر طاقتوں کی وجہ سے جو توازن قائم تھا، وہ ختم ہو کر رہ گیا اور اب امریکہ واحد سوپر طاقت کی حیثیت سے پوری دنیا پر مسلط ہوگیا، جسے کوئی چیلنج کرنے والا باقی نہیں رہا، خدا قادر مطلق ہے اور انسان کو قدم قدم پر عاجز و محتاج بنا کر رکھا گیا ہے، انسان کا عجز بھی ایک سماجی اور عمرانی ضرورت ہے، جب کوئی انسان اپنے بارے میں یہ باور کر لیتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے، کوئی اسے چیلنج نہیں کرسکتا، تو پھر وہ فرعون بن جاتا ہے اور وہ کبریائی کے احساس کے تحت ''لمن الملک الیوم'' کا نعرہ لگانے لگتا ہے، اس وقت امریکہ کی یہی صورتِ حال ہے، جو پوری دنیا کا خود ساختہ داروغہ بنا ہوا ہے۔

''نظام'' کے مقابلہ نظام ہی کی قوت ہوتی ہے، کوئی حکومت خواہ کتنی طاقتور کیوں نہ ہو، اگر اس کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے کوئی فکر اور نظامِ حیات موجود نہ ہو، تو وہ اپنے وجود کو زیادہ دنوں باقی نہیں رکھ سکتی، اس کی مثال تاتاریوں کا فتنہ ہے، تاتاری کتنے طاقتور تھے، لیکن ان کے پاس اپنی کوئی فکر نہیں تھی، اس لئے بالآخر وہ خود اپنے مفتوحین کے ہاتھوں فتح کر لئے گئے، اشتراکی نظام کے زوال کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ اسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ

حیات موجود نہیں، اس حقیقت نے مغرب کو اسلام کے خلاف آتش زیر پا کر دیا ہے اور صہیونیت کے زیر اثر امریکہ اور اس کے حلیف عالم اسلام اور امتِ مسلمہ کو اتنا کمزور کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔

اس کے لئے دوہری حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے، فوجی یلغار اور فکری حملہ، ایک طرف چن چن کر ان مسلمان ملکوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جو نسبتاً طاقتور سمجھے جاتے تھے اور جو کبھی اسرائیل اور مغرب کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے تھے، افغانستان کے کوہ و بیابان میں آگ کی چادر بچھادی گئی، عراق میں خونِ مسلم کی ارزانی کا حال یہ ہے پٹرول اور پانی کی کیفیت بھی اس سے زیادہ ہے، شام اور ایران کو کھلی وارننگ دی جارہی ہے اور پاکستان کی بھی گھیرا بندی کا سلسلہ جاری ہے، لیکن مغرب اس سے خوب واقف ہے کہ آگ کے ذریعہ جسم جلائے جا سکتے ہیں، قید و بند کے ذریعہ خوف و دہشت پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے ذریعہ فکر کا سودا نہیں کیا جا سکتا اور کسی تہذیب کو اس طرح نیست و نابود کر دینا ممکن نہیں، فکر و نظر کی تبدیلی پائیدار اور دیرپا ہوتی ہے اور قتل و خون کی گرم بازاری ایک مدت ہی کے لئے قائم رکھی جا سکتی ہے۔

پھر مغرب کو جو چیز بے قرار کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یورپ نے تو حکومت اور کلیسا کی لڑائی کے نتیجے میں ہمیشہ کے لئے مذہب سے توبہ کر لی لیکن یہ امتِ مرحومہ ایسی سخت جان ہے، کہ اسے دامن محمدی ﷺ سے محروم کرنے کے لئے کتنی بھی تدبیر کی جائیں، ناکام و نامراد ہی رہتی ہیں، مغرب کی ہزار کوششوں اور جبر و دباؤ کے باوجود آج بھی عالمِ اسلام میں جہاں کہیں آزادانہ انتخاب ہوتا ہے، اسلام پسند جماعتیں غلبہ حاصل کرتی ہیں اور پوری دنیا میں مسلمانوں میں اپنی شناخت کا احساس اور شعائرِ اسلام سے محبت بڑھتی ہی جاتی ہے، ان حالات میں جب تک کوئی ایسی تدبیر اختیار نہ کی جائے، کہ مسلمان فکری طور پر مغرب کے غلام نہ بن جائیں اور مغربی تہذیب کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں، عالمِ اسلام اور مسلمانوں پر مغرب کو دائمی غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی پس منظر میں ...... خاص کر افغانستان میں طالبان حکومت کے قیام کے بعد ......

مغرب نے بہت گہرائی سے اس حقیقت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، کہ آخر مسلمانوں کی اس فکری بیداری اور مذہبی شناخت کے شدید احساس کا منبع اور سرچشمہ کیا ہے؟ اور وہ بجا طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ برصغیر کے دینی مدارس ہی اس کا اصل سرچشمہ ہیں، جو بے آمیز طریقہ پر اسلام کی پوری تعلیمات کی ترجمانی کرتے ہیں اور جو اپنی فکر وعمل کی راہ متعین کرنے میں اجنبی اثرات سے پوری طرح آزاد ہیں، چنانچہ اب انھوں نے مدارس کے نظام میں مداخلت کے لئے دوہری کوششیں شروع کردی ہیں، ایک طرف مسلم حکومتوں پر دباؤ ڈالا جارہا ہے، کہ وہ دینی مدارس کے نظام میں دخیل ہوں اور نصابِ تعلیم میں جدید کاری کے عمل کو پوار کریں، جدید کاری کا لفظ تو بہت خوب صورت ہے، لیکن اس سلسلہ میں اب تک جو تفصیلات سامنے آئی ہیں، وہ یہی ہیں کہ قرآن کی جو آیات، نیز احادیث یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے متعلق ہوں یا جن میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہو، انھیں نصاب سے حذف کردیا جائے، اس کے ساتھ شاید ان واقعات کو بھی حذف کرنے کا حکم فرمایا گیا ہوگا جو جہاد اور مسلمانوں کی شجاعت و بہادری سے متعلق ہیں اور یہ تو ابتدائے عشق ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، نہ معلوم کیا کچھ حذف کرایا جاتا ہے اور اسلام کے نام پر کیا کچھ باقی رکھا جاتا ہے؟

دوسری طرف ترغیب کا راستہ بھی اختیار کیا جارہا ہے، چند سالوں سے ہندوستان سے علماء اور اساتذۂ مدارس کی ایک مناسب تعداد کو امریکہ کا دورہ کرایا جاتا ہے، وہاں کے تعلیمی ادارے دکھائے جاتے ہیں، اور بالواسطہ طریقہ پر انھیں نرمانے اور ہموار کرنیکی کوشش کی جاتی ہے، ابھی پچھلے دنوں عالمِ اسلام میں امریکہ کے مریدِ خاص اور خوانِ مغرب کے لقمۂ خوار ''مصر'' میں ''تعلیم سب کے لئے'' کے عنوان سے عرب ممالک کے وزراءِ تعلیم کی ایک خصوصی کانفرنس منعقد ہوئی ہے اور کانفرنس کے اختتام پر اعلانِ قاہرہ جاری ہوا ہے، اس کانفرنس میں عرب ممالک کے ۱۲/ وزرائے تعلیم شریک ہوئے اور افتتاحی پروگرام میں مصر میں متعین امریکی سفیر نے بھی شرکت کی، اعلانِ قاہرہ کے بموجب اس طرح کی کئی کانفرنسیں اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام اور امریکہ کے زیرِ انتظام عالم اسلام میں منعقد کی جائیں گی، تاکہ مسلم ممالک میں تعلیم

کے سلسلہ میں مغرب کی مطلوبہ تبدیلیوں میں پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکے۔

درحقیقت دینی مدارس مسلمانوں کی مذہبی قوت کا سرچشمہ ہیں اور وہ اس وقت اسلام کو سیاسی دست برد سے بچانے اور ہر طرح کے اجنبی اثرات سے محفوظ رکھنے کا موثر ذریعہ ہے، ہندوستان میں بھی حکومت کی طرف سے مدارس کے بورڈ کے قیام اور مدارس کے تعاون کی جو باتیں سامنے آرہی ہیں، بعید نہیں کہ یہ ایسی ہی نامسعود کوششوں کی بازگشت ہو، اس لئے مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس فتنہ سے آگاہ رہیں اور وقتی مفادات پر مدارس کے اصل مقصود کو قربان نہ کریں، امتِ مسلمہ کا بھی فریضہ ہے کہ وہ اس دامِ ہم رنگ زمیں کومحسوس کریں اور مدارس کا اس طرح تعاون کریں کہ مغرب کی طرف سے ان کی جس اقتصادی ناکہ بندی کی کوشش کی جارہی ہے، مسلمان اپنے جذبۂ انفاق کے ذریعہ ایسی کوششوں کو نامراد کردکھائیں، ''فهل من مدكر''؟

۴/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ ۱۷/ دسمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

جنسی تعلیم — مرض یا علاج؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ کچھ ایسی ضرورتیں بھی رکھی ہیں، جو عمر کے ایک خاص مرحلہ میں پیدا ہوتی ہیں، قبل از وقت اگر ان کو وہ شیٔ فراہم کردی جائے تو مفید کے بجائے نقصاندہ ہوجاتی ہے، اور یہ شخصیت کی تعمیر کے بجائے تخریب کے مترادف ہوتی ہے، ایک بچہ کو دودھ پینے کی مدت میں ٹھوس غذا دی جانے لگے، تو یہ اس کے لئے یقیناً مضر بلکہ بعض صورتوں میں مہلک بھی ہوسکتا ہے، اسی طرح پانچ، چھ سال کے لڑکے کو وہ محتاط غذا دی جائے جو ایک بوڑھے اور مریض شخص کو فراہم کی جاتی ہے، تو اس سے اس کی نشو ونما متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے ضرورت اور صلاحیت کی رعایت کرتے ہوئے ہی کسی چیز کا مہیا کرنا مفید ہوتا ہے، ورنہ مفید سے مفید چیز بھی مواقع وحالات اور سن وسال کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے نقصان دہ ہوجاتی ہیں۔

انسان کی فطری ضروریات میں ایک جنسی تقاضے بھی ہیں، نسل انسانی کی افزائش کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے اندر صنفی جذبات رکھے ہیں، ان جذبات کو اگر پاکیزہ طریقہ پر قانون کی حدود میں پورا کیا جائے تو انسانیت کی تعمیر اور نسل انسانی کی افزائش اور بقاء کا یہ فطری ذریعہ ہے، اور اسی لئے اسلام نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے؛ لیکن اگر اس فطری جذبہ نے غلط راستہ اختیار کرلیا، تو اسی قدر انسانیت کے لئے تباہ کن بھی ہے، اور آج مغربی ممالک عملی طور پر اس کا تجربہ کررہے ہیں۔

۱۹۹۶ء کے اعداد وشمار کے مطابق دنیا میں جنسی امراض کے ۳۳ کروڑ تیس لاکھ مریض تھے، جس میں ایک کروڑ بیس لاکھ آتشک کے، ۶ کروڑ بیس لاکھ سوزاک کے، ۸ کروڑ نوے لاکھ Chlamydia کے اور ۱۷ کروڑ Trichomonas کے مریضوں کا اندازہ کیا گیا ہے، (مغربی تہذیب انحطاط کی شاہراہ پر: ص: ۲۵۷) بین الاقوامی ماہرین صحت کی رپورٹ ۱۹۹۷ء کے مطابق دنیا میں ہر سال ۱۶ کروڑ تیس لاکھ افراد جنسی امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ہندوستان کے ڈائرکٹر

جنرل آف ہیلتھ سروس نے ماہرین امراضِ جنسی کی ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

’’ملک میں جنسی امراض بہت تیزی سے پھیلتے جارہے ہیں اور ہر بیس افراد میں ایک فرد اس میں مبتلا ہورہا ہے۔(حوالۂ سابق:ص:۲۵۹)

یہ بات محتاجِ اظہار نہیں کہ ایڈس کی بیماری کا اصل سبب جنسی بے راہ رَوی ہی ہے، اور پچھتر فی صد یہ بیماری جنسی اتصال ہی سے پھیلتی ہے، اس وقت افریقہ اور بعض ایشیائی ممالک ایڈس کی طوفان کے زد میں ہیں، جنوبی افریقہ اور بوتسوانا میں اس سے متاثر افراد کا تناسب تیس فیصد سے بھی آگے بڑھ چکا ہے، اور ہمارے ہندوستان میں ایچ آئی او انفکشن اس کثرت سے بڑھ رہا ہے کہ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اس بیماری میں ابتلاء کے اعتبار سے جنوبی افریقہ کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔

یہ مصیبت انسان کے خود اپنے عمل کا انجام ہے ؛ کیوں کہ جب انسان فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو ضرور ہی ٹھوکر کھاتا ہے اور سزایاب ہوتا ہے، افسوس کہ بجائے اس کے کہ لوگ قدرت کی تنبیہ سے سبق لیتے اور اپنی رَوش کو درست کرنے کی کوشش کرتے ، مغربی تہذیب کا سبق یہ ہے کہ برائی کو محفوظ طریقہ پر کرو، چنانچہ مغربی معاشرہ ایک کنڈوم کلچر بن چکا ہے، نہ صرف جوان اور عمر رسیدہ لوگ اس کلچر کا حصہ ہیں ، بلکہ نوجوان ، قریب البلوغ ، نوعمر لڑکے اور لڑکیاں بھی اس میں مبتلا ہو چکے ہیں ، اسکولوں اور کالجوں میں اس کے لئے باضابطہ سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ، انسان خواہشات کی غلامی کا ایسا اسیر ہوگیا ہے، کہ وہ شیٔ کو زہر سمجھتے ہوئے بھی اسے استعمال کرتا ہے۔

مغربی معاشرہ میں پاکیزہ اور قانونی سیکس کے بجائے محفوظ سیکس کے اس تصور نے اس خیال کو بھی بڑھادیا ہے کہ بچوں کو کم عمری سے جنسیات کی تعلیم دی جائے ، یہاں تک کہ پرائمری کے مرحلہ سے ہی لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے، افسوس کہ ہمارا ملک بھی مغربی معاشرہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کررہا ہے، اور اس مذہبی اور مشرقی اقدار کے حامل ملک میں بھی محفوظ طریقہ پر گناہ کرنے کی دعوت دی جارہی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اسکولوں میں سیکس کی

تعلیم کی بات چل رہی ہے؛ چنانچہ چند دنوں پہلے ریاست کے چیف منسٹر نے اعلان کیا ہے کہ اب چھٹی کلاس سے سیکس کی تعلیم دی جائے گی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اتنی کم عمری سے جنسیات کی تعلیم بیماری ہے یا دَوا اور امرت ہے یا زہر؟ ایسا تو نہیں کہ یہ دو ماہ کے دودھ پینے والے بچہ کو بھینس کا گوشت کھلانے کے مترادف ہو ؛ کیوں کہ جب کسی چیز کی تعلیم دی جاتی ہے، تو انسان کے اندر اس کے بارے میں تجسس اور اس کے تجربہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، اور یہ رغبت عمل تک پہنچاتی ہے، اسی لئے مغربی ممالک میں نو عمر لڑکے اور لڑکیوں میں بدکاری کا تناسب بہت بڑھا ہوا ہے، اور بلوغ کے ساتھ ہی حمل اور اسقاطِ حمل کے واقعات کی کثرت ہے، اسکولوں میں باضابطہ مانع حمل اسباب کی سہولت فراہم کی گئی ہے، اور مجھے ایشیاء کے باہر ایک ملک جانے کا اتفاق ہوا، تو معلوم ہوا کہ وہاں بعض اسکولوں میں Rest Room رکھے گئے ہیں، بظاہر یہ پڑھنے لکھنے میں تھک جانے والے لوگوں کے لئے آرام گاہ ہے؛ لیکن حقیقتاً یہ طلبہ اور طالبات کے لئے برائی کا مرکز ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے چند نکات کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام برائی کو روکنے کا قائل ہے، نہ کہ برائی کو محفوظ طریقہ پر رواج دینے کا، اس لئے جنسیات کی تعلیم سے زیادہ اہم اخلاقیات کی تعلیم ہے، ہونا یہ چاہیے کہ ابتدائی جماعتوں سے لے کر میٹرک تک ایک مضمون اخلاقیات کا شامل نصاب کیا جائے، جس میں مختلف مذاہب اور اخلاقی معلمین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے کردار کی پختگی اور پاکیزگی کی اہمیت کو نمایاں کیا جائے، نیز اخلاقی برائیوں کی وجہ سے سماج کو جو نقصان پہنچتا ہے، اس کو واضح کیا جائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام ایسی تمام باتوں سے منع کرتا ہے، جو برائی کی طرف لے جانے والی ہیں، خواہ وہ تعلیم کے نام پر ہوں، اس لئے نابالغوں کو جنسی اعضاء کا وظیفہ سمجھانا، جنسی عمل کے بارے میں بتانا اور جنسی اتصال کا محفوظ طریقہ سمجھانا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے؛ کہ اس سے برائی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جولڑکے بالغ ہو چکے ہیں، ان میں اس طرح جنسیات کی تعلیم دی جاسکتی ہے کہ وہ جنسی اعضاء کے وظائف کو سمجھیں، ان کے غلط استعمال کے نقصانات سے واقف ہوں، اور یہ ساری تعلیم ایسے طریقہ پر ہو کہ الفاظ وتعبیر میں پردہ کا خیال رکھا گیا ہو، قرآن مجید نے مرد وعورت کے اتصال کے طریقہ پر روشنی ڈالی ہے، حدیث میں بھی صنفی تعلق کا ذکر ہے، لیکن ایسے پردہ اور شائستگی کے ساتھ کہ برائی کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا، اور جائز رشتہ وتعلق کا تقدس باقی رہتا ہے، اسی لئے عربی زبان میں مرد وعورت کے اتصال اور شرمگاہ وغیرہ کے لئے بظاہر کوئی ایسا لفظ نہیں پایا جاتا جس کو اہل لغت نے خاص اس مفہوم کے لئے وضع کیا ہو، بلکہ کنایہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اور لسانی اعتبار سے بھی یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان مفاہیم کے اظہار کے لئے عربی میں اور خود قرآن وحدیث میں متعدد الفاظ آئے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب کوئی کنایہ لفظ ایک خاص مفہوم کے لئے بکثرت استعمال ہونے لگتا ہے، تو آہستہ آہستہ وہ لفظ صریح کے درجہ میں آجاتا ہے، اور عریاں محسوس ہونے لگتا ہے، اس لئے اب اس کی جگہ دوسرے کنایہ لفظ کا استعمال ہوتا ہے، اور اس طرح اس مضمون کو ظاہر کرنے والے الفاظ کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، جنسیات کی تعلیم میں پردہ داری کی جہت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بالغ لڑکے اور لڑکیوں کو بھی کم سے کم ان مضامین کی تعلیم مخلوط کلاس روم میں نہ دی جائے، بلکہ دونوں کی ضرورت اور سہولت کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ لکچر کا نظم ہو؛ کیوں کہ جنسی معلومات کے بارے میں مردوں اور عورتوں کی ضروریات الگ الگ ہیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ لڑکوں کے لئے مرد استاذ ہوں اور لڑکیوں کے لئے خاتون استاذ؛ کیوں کہ اختلاط کا ماحول ایسے مضامین کے بیان واظہار کو غلط سوچ کی طرف لے جاتا ہے۔

اگر ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا، تو جنسیات کی تعلیم علاج کے بجائے ''بیماری'' ثابت ہوگی اور اس سے نفع کے بجائے سماج کو نا قابل بیان نقصان پہنچے گا، کم سے کم ہمارے ملک 'ہندوستان' —— جس کی سرشت میں مذہب اور اخلاق کا عنصر رہا ہے —— کے لئے ان اُمور

میں مغرب کی اندھی پیروی نہایت ہی نقصاندہ ثابت ہوگی ، اور اس طرح ہم مغرب کی علمی و صنعتی ترقی میں تو حصہ دار نہیں بن سکیں گے ، لیکن اس کے اخلاقی بگاڑ اور سماجی مفاسد کا بوجھ ضرور اپنی کمر پر اٹھالیں گے ۔

۲۹/ جمادی الثانی ۱۴۲۶ھ ۵/ اگست ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ بَعۡدِیۡ ؟

قرآن مجید میں جن اولوالعزم پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، ان میں ایک اہم ترین شخصیت حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے، جن کا مختلف عنوان کے تحت قرآن میں سولہ بار ذکر آیا ہے، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، جن کا ایک نام اسرائیل بھی ہے، بنی اسرائیل دراصل ان کی اولاد ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ مصر اور عراق کے خطہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی خدا کے اولوالعزم پیغمبروں میں ہیں، جن کو ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی رضا کے لئے قربان کیا تھا اور عید قرباں ان ہی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے دادا ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، جنھوں نے تعمیر کعبہ کی تجدید فرمائی، حج کے زیادہ تر افعال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں اور فرمانبرداریوں کی یاد کو تازہ کرنے کا باعث ہیں اور دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام آپ علیہ السلام کی عظمت پر متفق ہیں۔

قرآن نے خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توحید پر ایمان وایقان کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں ابتلاؤں اور آزمائشوں میں پورا اُترنے کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ آج جو مذاہب توحید کا اقرار کرتے ہیں، وہ سبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کے واقعہ پر قرآن مجید میں ایک مکمل سورت ''یوسف'' کے نام سے موجود ہے اور ان کی داستانِ زندگی کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص کے نام سے ذکر فرمایا ہے، گویا حضرت یعقوب علیہ السلام کا پورا خانوادہ نبیوں اور رسولوں کا، باپ، چچا، دادا، بیٹا، سب اللہ کے پیغمبر ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس خاندان میں کس قدر دین داری، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی رہی ہوگی اور گھر کے پورے ماحول پر کیسی اعلیٰ دینی فضاء سایہ فگن ہوگی، ایسے دین دار گھرانہ کے افراد سے گناہ اور

معصیت کا اندیشہ بھی لوگوں کو نہیں ہوتا، چہ جائے کہ کفر وشرک کا خوف ان سے ہو، لیکن جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے صاحبزادوں سے سوال کیا: **ماتعبدون من بعدی** (البقرہ:۱۳۳)، میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ صاحبزادوں نے جواب دیا :

> **نعبد الٰهک واله آبائک ابراهیم واسماعیل واسحق الهاً واحداً ونحن له مسلمون .** (البقرہ:۱۳۳)
>
> ہم آپ کے خدا، آپ کے آباء واجداد ابراہیم، اسماعیل، اسحاق کے خدا کی پرستش کریں گے، جو خدائے واحد ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہوکر رہیں گے۔

اسی طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو جو خود نبی تھے وصیت فرمائی :

> **ان الله اصطفیٰ لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون .** (البقرہ :۱۳۲)
>
> بے شک اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے دین کو منتخب کیا ہے، اس لئے تم لوگوں کی موت حالت اسلام میں ہونی چاہئے۔

غور کیجئے! کہ انبیاء کرام اپنے بچوں کے سلسلہ میں اس بات کے فکرمند ہیں کہ وہ دین پر قائم رہیں اور ان کو دین پر قائم رہنے کی حالت میں موت آئے، جب انبیاء کو اپنی اولاد کے بارے میں اتنی زیادہ فکرمندی تھی، تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو اس سلسلہ میں کتنا زیادہ فکرمند رہنے کی ضرورت ہے، آج ہماری نفسیات یہ ہے کہ ہم اپنی خاندانی روایات پر یقین کرکے اپنے بال بچوں کے بارے میں مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہمارے بچے اسی دین کے حامل رہیں گے، جو ہمیں ہمارے ماں باپ کی طرف سے ملا ہے۔

راقم الحروف ابھی چند دنوں پہلے برطانیہ کے سفر سے واپس آیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے

کہ مغربی ملکوں نے مذہب سے اپنا رشتہ پوری طرح توڑ لیا ہے اور اگر کوئی اپنے آپ کو عیسائی کہتا ہے تو وہ محض روایات کے طور پر ایک تہذیب کے نقطۂ نظر سے، یعنی کچھ مذہبی رسوم ہیں، جو بطورِ عقیدہ کے انجام نہیں دیئے جاتے، بلکہ اب وہ تہذیب اور روایت کا حصہ بن چکے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ جو مسلمان وہاں آباد ہیں اور خاص کر گجراتی مسلمان، کہ ہندوستان سے زیادہ تر وہی اس ملک میں پہنچے ہیں، ان کی نئی نسل میں بھی دین داری کا رجحان بہت ہی قابل تعریف اور لائق تحسین ہے، ایک ایسے ملک میں جہاں یوں محسوس ہوتا ہے کہ لباس عورتوں کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، اور جہاں نوجوان لڑکے نت نئے فیشن کے پرستار ہیں، وہاں بھی مسلمان خواتین کی اچھی خاصی تعداد برقعہ پوش ہے، یا کم سے کم چہرہ کے علاوہ پورا جسم بشمول سر کے ڈھنکا ہوا ہے، اور نوجوان لڑکوں کے چہروں پر کثرت سے داڑھیاں ہیں اور ان کی اچھی خاصی تعداد مشرقی لباس اور اسلامی وضع قطع کی حامل ہیں۔

اس کے اسباب یوں تو گھریلو ماحول اور طبعی سلامت رَوی، دینی تحریکوں اور جماعتوں سے تعلق اور خاص کر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کی محنت علماء اور مشائخ سے تعلق وارتباط وغیرہ بھی ہے، لیکن سب سے اہم کردار اس میں نظام مکاتب کا ہے، ریاستِ گجرات میں بہت زمانہ سے ایک نظام یہ ہے کہ گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہیں، جو طلبہ عصری درسگاہوں میں پڑھتے ہیں ان کے لئے ان مکاتب میں پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی بچہ مکتب کے اوقات میں کھیلتا ہوا مل جائے تو محلّہ کے لوگ بے تکلف بچہ کے سرپرست سے پوچھ بیٹھتے ہیں، کہ یہ مکتب نہیں جارہا ہے؟ اور سرپرست کو شرمسار اور معذرت خواہ ہونا پڑتا ہے، عام طور پر مکتب کی تعلیم سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ قاعدۂ بغدادی اور پارۂ عم جیسے تیسے پڑھا دیا جائے اور چند کلمات اور دُعائیں یاد دلا دی جائیں، بس یہ کافی ہے، یقیناً کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں ہونا بہتر ہے، لیکن گجرات کے نظم مکاتب کی سطح اس سے بہت بلند ہے، یہاں عام طور پر میٹرک تک آٹھ دس سال مکتب کی تعلیم ہوتی ہے، روزانہ ڈھائی گھنٹہ بچوں کا وقت لیا جاتا ہے، ایک معلم پندرہ، بیس طلبہ کو پڑھاتے ہیں، ناظرہ

قرآن تجوید کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، کچھ پارے حفظ کرائے جاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ساتھ آیات واحادیث کے ترجمے، ایمانیات، مسائل واحکام، سیرتِ نبوی ﷺ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور بعض جگہوں پر عربی زبان کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔

گجرات کے مسلمان تاجر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ جہاں بھی گئے مکتب کا یہ نظام بھی اپنے ساتھ لے کر گئے، اس لئے ان کی نئی نسل پر دین داری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہے، چاہے وہ کتنے ہی مخالفِ اسلام ماحول میں ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے اپنے دینی ربط وتعلق کی بناء پر نمایاں محسوس ہوتے ہیں، برطانیہ میں چوں کہ ۱۶ سال کی عمر تک سرکاری نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ہر بچہ پر لازم ہے، اس لئے اتنی عمر تک بچے پابندی سے مکتب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس طرح وہ نیم مولوی تو ہو ہی جاتے ہیں اور بعضے قرآن مجید کا حفظ بھی مکمل کر لیتے ہیں۔

بعض اہل بصیرت کا گمان ہے کہ ایشیاء میں جو ملک سب سے پہلے مغربی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور جو تیزی سے مغرب کی پیروی کی طرف جا رہا ہے وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے اور مغربی ممالک کو چوں کہ افرادی وسائل کی ضرورت ہے اور ہندوستان کے نوجوان ذہانت، صلاحیت، محنت اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مزاج بھی رکھتے ہیں، اسی لئے یہاں کے کارکنان ان کے لئے سب سے زیادہ قابل قبول ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اگلی نسلوں کو دین سے وابستہ رکھنے کے طریقۂ کار پر غور کریں اور ایسا راستہ اختیار کریں کہ ہمارے بچے عصری تعلیم میں بھی آگے ہوں اور دینی پہچان بھی پوری طرح قائم رہے، اس کے لئے سب سے مفید اور آزمودہ طریقہ نظام مکاتب کا ہے، کہ زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم ہوں، مکاتب صرف رسمی انداز کے نہ ہوں، بلکہ اس کا دس سالہ کورس ہو، جس میں ناظرہ قرآن، حفظ، منتخب آیات واحادیث کے ترجمے، عبادات ومعاملات اور شخصی زندگی سے متعلق ضروری احکام، نیز رسول اللہ ﷺ اور انبیاء کرام کی سیرت اور تاریخ ہند جیسے اہم مضامین شامل نصاب ہوں اور ان کی باضابطہ تعلیم ہوا

کرے، اُردو زبان بھی اس نصاب کا ایک اہم جزو ہو اور ان طلبہ و طالبات کو اچھی طرح اُردو لکھنا اور پڑھنا آ جائے، تا کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی ورثہ سے جڑے رہیں، علماء کو ان کا علم، مشائخ کو ان کی دینی نسبت اور دعوتی کام کرنے والوں کو ان کی دعوتی وابستگی انھیں اپنے بچوں کی طرف سے بے پرواہ نہ کر دے اور یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ ہماری یہ دینی وابستگی لازمی طور پر ہماری آنے والی نسلوں کو بھی دین سے مربوط رکھے گی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کے اسوہ کو یاد رکھیں کہ پورا خاندان نبوت کے نور سے منور ہے، اس کے باوجود انھیں اپنی وفات کے وقت یہی فکر دامن گیر ہے کہ ہماری اولاد دین پر قائم رہے گی یا نہیں؟ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے؟ اور کیا ہم نے بھی کبھی اپنی اولاد سے استفسار کیا ہے: **ماتعبدون من بعدی ؟؟**

۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

دینی مدارس، علماء اور اُمتِ مسلمہ

گذشتہ صدیوں میں مغربی دنیا سے کئی ایسے سائنسداں وفلاسفر پیدا ہوئے جنھوں نے کائنات کے بارے میں یہ تصور پیش کیا کہ کائنات کا پورا نظارم اپنے آپ چل رہا ہے اور کائنات میں اصل حکمرانی ' قانونِ فطرت' کی ہے، اس سلسلہ میں فرائڈ، نیوٹن، ڈارون اور کارل مارکس کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے دو بڑے معاشی نظام کمیونزم اور سرمایہ داری میں مذہب کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھا گیا، اسی لئے مغرب میں الحاد ولامذہبیت کی ایسی اندھی چلی کہ اس نے پوری دنیا میں مذہب کو کنارے کرکے رکھ دیا، اب اس وقت پوری دنیا میں صورتِ حال یہ ہے کہ یا تو لوگ سرے سے مذہب اور مذہبی افکار کے منکر ہیں یا روایتی طور پر مذہب سے وابستہ ہیں، لیکن انھوں نے مذہب کو چرچ اور مندر کی دیواروں میں قید کر رکھا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، مذہبی تقریبات کی حیثیت تہذیبی تہواروں کی ہوگئی ہے، جن کو وہ رنگ رلیاں منانے اور رقص وسرور کی بزم آراستہ کرنے کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں، نہ ان کے اندر خدا کی خشیت ومحبت ہے، نہ مذہبی پیشواؤں کی عظمت واحسان مندی اور نہ ان کی اتباع کا جذبہ ہے، نہ مذہب کی حرام کی ہوئی چیزوں سے اجتناب کی اہمیت ہے، نہ مذہب کی مسلمہ اخلاقی قدروں کی کوئی قیمت اور اہمیت ہے اور نہ اپنی مذہبی کتابوں سے ان کا رابطہ استوار ہے، اس وقت مشرق سے مغرب تک پوری دنیا اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور مادّیت کے نشہ میں مخمور ہے۔

اس صورتِ حال سے اگر کوئی قوم مستثنیٰ ہے تو وہ مسلمان ہیں، مسلمان آج بھی ان اَن دیکھی حقیقتوں پر بہ جان ودل ایمان رکھتا ہے جن پر مسلمان ہونے کا مدار ہے، خدا کا خوف، رسول کی محبت اور عظمت، جزاء اور سزا کا یقین، قرآن سے ایمان واعتقاد کا والہانہ تعلق، خدا سے نفع ونقصان اور کامیابی وناکامی کا ایقان اور اس کے لئے قربانی دینے میں بظاہر کھونے اور

حقیقتاً پانے کا تصور آج بھی ہر مسلمان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے، مسلمانوں کا تعلق اپنے دین سے مسجد کی چہار دیواروں تک محدود نہیں ہے، آج بھی وہ سماجی زندگی میں بڑی حد تک اپنی شریعت پر عمل کرتے ہیں، نکاح، طلاق، میراث، وصیت و ہبہ، عدت، نفقہ، اور رشتہ داروں کے حقوق اور ان جیسے دوسرے سماجی مسائل میں اکثر مسلمان قانونِ شریعت پر عمل پیرا ہیں اور اگر کوئی اس میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ اس پر شرمسار رہتا ہے۔

مالی معاملات میں بھی بڑی حد تک مسلمان اسلام کا دامن تھامے ہوئے ہیں، کوئی مسلمان خنزیر بیچنے اور شراب فروخت کرنے کو تیار نہیں ہوتا، سود اور جوئے سے بھی مسلمان عام طور پر اپنے آپ کو بچاتا ہے، اس لئے مختلف مسلم ممالک —— سعودی عرب، ملیشا، دبئی، سوڈان، ایران اور پاکستان —— میں اسلامک بینکنگ کا نظام ترقی کر رہا ہے اور اسے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، یہاں تک کہ بعض یورپین بینک بھی غیر سودی بینک کاری کا شعبہ قائم کر چکے ہیں اور خود ہندوستان میں بھی وزیر اعظم منموہن سنگھ اس سمت میں سوچ رہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت آج بھی اپنے ضمیر اور ایمان کی آواز پر سود کو ناپسند کرتی ہے، بعض مسلم ممالک میں اسلام کے فوجداری قوانین بھی نافذ ہیں اور وہ جرائم کی روک تھام میں بڑے مؤثر ثابت ہوئے ہیں یہ سب مسلمانوں کی مذہبی وابستگی کا نتیجہ ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان دین کی بقاء کے لئے کیسی ناقابل فراموش قربانیاں دے رہے ہیں، افغانستان، عراق، فلپائن، برما، چین، روس، بوسنیا، فلسطین اور خود بعض مسلم ممالک میں اسلام پر ثابت قدمی کی وجہ سے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کے لہو اس قدر بہائے گئے کہ اگر انھیں کسی دریا میں ملا دیا جاتا تو شاید اس کے پانی کا رنگ بدل جاتا اور اگر ان کے خونِ جگر سے کسی تالاب کو آباد کیا گیا ہوتا تو دنیا بھر کے درندہ جانوروں کی سیری کا سامان ہو جاتا، لیکن افسوس کہ یہ بھی درندہ انسانوں کی سیرابی کے لئے کافی نہیں ہو سکا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان بہت سی فکری اور عملی کوتاہیوں کے باوجود اپنے دین سے وابستہ ہیں۔

اسلام کا عملی زندگی میں موجود ہونا دراصل رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضا ہے؛ کیوں کہ قیامت تک دین حق کے چراغ کا روشن ہونا ضروری ہے اور جس روز یہ چراغ بجھ جائے گا اسی دن قیامت قائم ہو جائے گی، حضور ﷺ کی وفات کے بعد دین کا تحفظ اور اس کی تشریح و ترجمانی کی ذمہ داری علمائے امت پر آ گئی ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا ہے اور اسی لئے حدیث میں علم کی اور علماء کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے بڑھ کر ہے'' (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۱۸۹ بحوالہ مسند بزار) ایک اور روایت میں ہے کہ تھوڑا سا علم رکھنے والا زیادہ عبادت کرنے والے سے بہتر ہے'' **یسیر الفقه خیر من کثیر العبادة**'' (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ۱۹۸) حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے ایک عالم اور ایک عبادت گذار کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ شخص پر، (حدیث نمبر: ۲۶۸۵) ایک اور روایت میں ہے کہ ''ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عبادت گذاروں سے بھاری ہے'' **فقیه أشد علی الشیطان من ألف عابد**''۔

علماء کی رہنمایانہ اور قائدانہ صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زمین میں علماء کی مثال آسمان میں ستاروں کی سی ہے، خشکی اور تری کے اندھیروں میں انھیں ستاروں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اگر ستارے ڈوب جائیں تو ممکن ہے کہ راہ چلنے والے بھٹک جائیں، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۸۹) اس میں عام مسلمانوں کے لئے ہدایت ہے کہ وہ علماء سے اپنا رشتہ نہ توڑیں اور ان کی رہنمائی میں زندگی کا سفر طے کریں، اسی طرح وہ ہدایت پا سکتے ہیں، اور صحیح راہ پر گامزن رہ سکتے ہیں؛ کیوں کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے انبیاء بھیجے جاتے ہیں اور علم دین ہی انبیاء کی اصل میراث ہے، اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے: وہ ایک بار بازار سے گذرے، تو لوگوں نے دریافت کیا: کہاں؟ فرمایا: مسجد میں، لوگوں نے سمجھا کہ حضور ﷺ کے تبرکات تقسیم ہو رہے ہوں گے، اس

لئے سب دوڑتے بھاگتے مسجد کی طرف آئے، پھر واپس ہوئے اور کہنے لگے: ہم نے مسجد میں تو کچھ پایا ہی نہیں؟ کچھ لوگ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، کچھ لوگ نماز پڑھنے میں مصروف تھے اور کچھ لوگ حلال وحرام کا مذاکرہ کررہے تھے، حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے فرمایا: یہی تو حضور ﷺ کی میراث ہے، (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۱۹۷ بحوالہ طبرانی) علماءِ اُمت کے درمیان اسی میراث کی تقسیم میں شب وروز لگے ہوئے ہیں تاکہ دنیا ورثۂ نبوی ﷺ سے خالی نہ ہوجائے۔

بعض دفعہ لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ علماء اور اہل مدارس لوگوں پر بوجھ ہیں، یہ محض دین سے دوری اور خدا ناترسی کا نتیجہ ہے، لوگ اپنی دنیا کی حفاظت اور ترقی کے لئے کتنا کچھ خرچ کرتے ہیں، کیا دین کی اہمیت اتنی بھی نہیں ہے کہ اس کے لئے اپنی آمدنی میں سے دو تین فیصد خرچ کیا جائے؟ حضرت انس بن مالک ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دو بھائی تھے، جن میں ایک کسبِ علم کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں رہتا تھا اور دوسرا اکثر اوقات کسبِ معاش کی سرگرمیوں میں گذارتا تھا، اس دوسرے بھائی نے بارگاہِ رسالت میں اپنے پہلے بھائی کی شکایت کی، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شاید تم کو اسی کی وجہ سے رزق دی جارہی ہے ''لعلک ترزق بہ '' (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۳۴۵) اس لئے اگر کسی شخص کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق ہو تو اسے سمجھنا چاہیے کہ جو اسے خوشحالی اور فارغ البالی میسر آرہی ہے اس میں اس انفاق کا بھی حصہ ہے۔

عوام کا علماء کے بارے میں کیا سلوک ہونا چاہیے؟ اس پر حضرت ابوبکر ﷛ کی حدیث سے روشنی پڑتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تم عالم بنو یا متعلّم بنو یا علم کی باتیں سننے والے بنو یا عالم سے محبت رکھنے والے بنو اور پانچویں نہ بنو کہ ہلاک ہوجاؤ گے، پانچویں سے علم اور اہل علم سے بغض رکھنے والا مراد ہے، (جمع الفوائد: حدیث نمبر: ۱۹۹ بحوالہ طبرانی ومسند بزار) ایک اور روایت میں ہے کہ تین آدمیوں کا منافق ہی مذاق اڑا سکتا ہے، بوڑھا مسلمان، عالم اور منصف مزاج امام۔ (حوالۂ سابق، حدیث نمبر: ۲۰۰ بحواله المعجم الكبير)

جو قومیں اسلام سے عداوت رکھتی ہیں اور مسلمانوں کی سربلندی اور اسلام اور پیغمبر اسلام

ﷺ سے اُن کی اٹوٹ وابستگی ان کے آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی ہے، انھوں نے بہت ہی غور وفکر اور تحقیق وجستجو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دینی مدارس اور علماء ہی وہ سرچشمہ ہیں جہاں سے اسلام کی اشاعت کا کام سرانجام پاتا ہے اور جو مسلمانوں کو اسلام سے مربوط رکھنے اور ان کو انحراف سے بچانے میں نہایت اہم اور غیر معمولی کردار ادا کر رہے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو الحاد و بددینی کے طوفان کو تھامے ہوئے ہیں اور یہی وہ پشتے ہیں جو مادّیت وانحراف کے سیلاب کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، خاص کر برصغیر کے مدارس جہاں سے طلبہ علم کے ساتھ ساتھ ایمانی حمیت، دینی غیرت، دعوتی ذہن، اصلاح کا جذبہ، امت کے لئے دردمندی اور فکرمندی کی سوغات لے کر اور ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہیں، اور اس وقت یہی مدارس ہیں جو نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ مشرق بعید، چین سے لے کر یورپ، افریقہ اور امریکہ تک مسلمانوں کی نئی نسل میں اسلامی بیداری اور دین کی طرف رجوع کا باعث بن رہے ہیں۔

چنانچہ امریکہ، برطانیہ اور روس وغیرہ کے علاوہ ہندوستان میں سنگھ پریوار اور دوسری اسلام مخالف طاقتوں کی طرف سے مدارس پر سخت یلغار کا سلسلہ جاری ہے، ہر جگہ علماء اور مدارس پر بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کا الزام لگایا جارہا ہے اور انھیں بدنام ورسوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان حالات میں امت کا فریضہ ہے کہ وہ مدارس کے نظام کو تقویت پہنچائیں، علماء سے ان کا ارتباط گہرا ہو، دینی اداروں کو ان کا تعاون اور اعتماد حاصل رہے، بدقسمتی سے بعض حضرات اپنی ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے ایسی باتیں کہہ جاتے اور لکھ جاتے ہیں جن سے مدارس اور اہل مدارس کی بے وزنی ہوتی ہے، ادھر حیدرآباد کے بعض اخبارات میں اسی طرح کے کچھ مراسلے شائع ہوئے ہیں، ایسی باتوں سے امت کو نقصان ہی پہنچے گا، اللہ کا شکر ہے کہ عام طور پر مسلمان ایسی خدانا ترسانہ باتوں کا اثر قبول نہیں کرتے، اور ان شاء اللہ ہمارے غیرت منداور باشعور مسلمان بھائی اس طرح کی بے سروپا باتوں پر توجہ بھی نہیں دیں گے۔

لیکن اس طرح کی باتیں کہہ کر اور لکھ کر دراصل ہم اپنے دشمنوں کو طاقت پہنچاتے ہیں اور ان کے لئے یاوہ گوئی کا جواز فراہم کرتے ہیں، مسلمانوں کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ مادّیت کے پرستار نہیں ہیں، وہ خدائے واحد کے پرستار ہیں، ان کے لئے دنیا سے بڑھ کر دین ہے، ان کی منزل اس جہانِ فانی سے آگے ہے اور ان کے دین کا تحفظ علماء سے ارتباط اور مدارس کے بقاء میں ہے، علماء اور مدارس کی مثال سرحد پر متعین ان فوجیوں کی ہے جو دشمن سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کو کمزور کرنا اپنے آپ کو کمزور کرنے کے مترادف ہے!

۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ ۹/ دسمبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

اُردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں

جس وقت یہ سطور لکھی جارہی ہیں ، حیدرآباد میں ’ عالمی اردو کانفرنس‘ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جاری ہے، اردو زبان میں تنقید و تحقیق پر بیش قیمت خطبات دیئے جارہے ہیں ، احتجاج آمیز خطابات بھی اخبارات کی شہ سرخی بن رہے ہیں ، شعر وسخن کی بزمیں بھی آراستہ ہورہی ہیں اور غزل کے بادہ وخم بھی اہل ذوق کے لئے مستی وسرور کا سامان بہم پہونچانے میں لگے ہوئے ہیں؛ لیکن کیا اس جشنِ اردو سے مظلوم اردو کا حق ادا ہوجائے گا؟ یہ بات اہل اردو کے لئے سوچنے کی ہے۔

زبان کی حیثیت محض ایک ہتھیار اور ذریعہ کی ہے، وہ کسی خاص مذہب اور فکر کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ اظہار وتعبیر کا ایک ذریعہ ہوتی ہے، جس کے ذریعہ اچھی فکر کو بھی فروغ دیا جاسکتا ہے اور منفی اور نقصاندہ فکر کو بھی پروان چڑھایا جاسکتا ہے؛ اس لئے زبان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ہاں بعض ایسی زبانیں ہیں جن میں کسی خاص مذہب کی بنیادی کتاب موجود ہے، اس پہلو سے اسے اس مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس نسبت میں کوئی برائی نہیں ، جیسے سنسکرت زبان ہندو مذہب کے لئے ، فارسی پارسیوں کے لئے ،عبرانی یہودیوں کے لئے اور عربی مسلمانوں کے لئے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، اردو زبان اس معنی میں کوئی مذہبی زبان نہیں، اس زبان کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ہندی کا پھر فارسی کا ہے، زبان کی بنیاد اس کے گرامر اور قواعد پر ہوتی ہے، الفاظ اور تعبیرات تو ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں ، اردو قواعد اصل میں ہندی زبان سے ماخوذ ہیں، واحد وجمع ، مذکر ومؤنث کے صیغے ، جملوں کی ترتیب وغیرہ عام طور پر وہی ہیں جو ہندی کی ہیں، محاورے بھی زیادہ تر ہندی ہی کے اردو میں مستعمل ہیں، تشبیہات و استعارات میں غالباً فارسی نے زیادہ حصہ پایا ہے، ہندی کی سادگی اور فارسی کی مٹھاس کے ساتھ عربی الفاظ کی شمولیت نے اس کے شوکت وشکوہ میں اضافہ کیا ہے، اس کے علاوہ سنسکرت ،

انگریزی، پنجابی، دکنی اور سنسکرت زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نے اس کو ایک گلدستہ سا بنا دیا ہے، جس میں ہر پھول کا رنگ جدا اور ہر غنچہ کی خوشبو ایک دوسرے سے سوا ہے، اس لئے اس کا نام ہی ''اردو'' پڑ گیا؛ گویا یہ ایک زبان نہیں بلکہ زبانوں کا لشکر ہے، یہ گل نہیں بلکہ ہم رنگ پھولوں کا گلستاں ہے، اس حقیقت نے اس زبان کو بیک وقت مختلف زبانوں کی خوبیوں کا امین بنا دیا ہے۔

اسی لئے ہمیں اردو زبان کی خدمات میں شروع ہی سے غیر مسلم حضرات کا نمایاں کردار نظر آتا ہے، کسی زبان کو معیاری زبان کا مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے اپنے اصول وقواعد متعین ہو جائیں، گرامر کے بغیر زبان ایک عوامی بولی تو ہوتی ہے، ایسی زبان نہیں ہوتی جس میں معیاری اور ادبی، علمی اور تحقیقی لٹریچر تیار ہو سکے، اس کے قواعد مرتب کرنے والوں میں سب سے ابتدا میں جن لوگوں کا نام ملتا ہے، وہ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تین شخص ہیں: جان جوشوا کٹلر، مشنری شلز، ہیڈلے، (قواعد اردو، مقدمہ: ص: ۱۵) اور یہ بات اہل علم کے لئے محتاج اظہار نہیں کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں 'فورٹ ولیم کالج' اردو زبان میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا اہم مرکز تھا، یہ تو انگریزوں کا ذکر تھا، اردو زبان میں ہندو بھائیوں کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ ان پر کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، جناب چکبست نسیم، کرشن چندر، پریم چند، آنند نرائن ملا شعراء اور ادباء ہیں جن کے بغیر اردو زبان کی تاریخ نامکمل اور نا تمام رہے گی، اردو کتابوں کی طباعت میں 'منشی نول کشور' کی جو خدمات ہیں، شاید ہی کوئی بڑا سے بڑا مسلمان ناشر بھی اس باب میں ان کی ہمسری کر سکے، انھوں نے فوٹو آفسیٹ پریس کے دور سے پہلے جس خوب صورت، روشن اور بڑی حد تک کتابت کی غلطیوں سے پاک وصاف اردو، فارسی اور عربی لٹریچر پیش کیا وہ کام نہیں کارنامہ ہے، اسی طرح اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج اور ان کے افکار ونظریات کو پیش کرنے میں بھی اردو کا بہت ہی نمایاں حصہ رہا ہے، اس سلسلہ میں جناب محمد عزیر کی تالیف ''اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ'' (صفحات: ۳۲۴، ناشر انجمن ترقی اردو) خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر میں اپنا مذہبی لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں پیش کیا، محض اس وجہ سے اردو زبان کو ایک گروہی زبان کی حیثیت دے دی گئی اور یہ تأثر دیا گیا کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے؛ حالاں کہ اگر یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تب بھی یہ ملک کی ایک ایسی اقلیت کی زبان قرار پاتی ہے جن کی تعداد سرکاری اعداد وشمار کے مطابق چودہ فیصد کے قریب ہے اور جن کی حقیقی تعداد پندرہ تا بیس فیصد بتائی جاتی ہے، جو زبان ملک میں اتنے بڑے گروہ کے لئے ذریعہ اظہار ہو، کیا اس کی اہمیت سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ اس کے لئے ضرورت ہے مخلصانہ جد وجہد، بے غرض کاوش اور اس تحریک کے لئے حکیمانہ قیادت کی، اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اردو زبان کے حقوق کے لئے جد وجہد کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ خود اس میں غیر مخلص ہوتے ہیں، وہ اسے ایک سیاسی ایشو کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ خود اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کے گھر میں اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، وہ اس شور وہنگامہ کو سیاسی مفادات کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں اور جہاں ان کی اقتدار اور پیسوں کی بھوک کم کرنے کے لئے ایک دو لقمے منہ میں ڈال دیئے جاتے ہیں زبان گنگ ہو جاتی ہے، سیاسی قائدین اردو کے دوسری سرکاری زبان ہونے کا اعلان تو کرتے ہیں، لیکن یہ سرکاری حکم فائلوں میں دفن رہتا ہے اور عملی طور پر اردو کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

آزادی کے بعد اگر سرکاری سطح پر اردو کی ترقی کے لئے کوئی کام ہوا ہے تو وہ 'انجمن ترقی اردو بورڈ' کا قیام اور اس کے تحت فنی، سائنسی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت اور 'مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' کا قیام ہے، ان دونوں اداروں نے علمی، تحقیقی اور تعلیمی اعتبار سے اردو کو بڑا فائدہ پہونچایا ہے، اور ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، اردو ادب کو صرف لیلی مجنوں کی کہانیوں، شیریں وفرہاد کی داستانوں، اور جام و پیمانہ کی سرمستیوں سے ایک ایسی زبان نہیں بنایا جاسکتا جو علم وتحقیق کی ضرورت کو پورا کرتی ہو اور اپنے دور کے سماجی ومعاشی مسائل اور اپنے عہد کے افکار ونظریات کی ترجمان بن سکتی ہو؛ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم زبان کی ترقی وتعمیر کے ایسے اداروں کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کا ایسا تعاون کریں کہ وہ ملک میں

ایک باوقار ادارہ کی حیثیت سے جانے جائیں۔

اُردو زبان سے متعلق دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس زبان میں جتنا کثیر اسلامی لٹریچر ہے، عربی زبان کے بعد دنیا کی کسی اور زبان میں اتنا بڑا اسلامی سرمایہ موجود نہیں، اُردو زبان میں متعدد ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ انھیں عربی کا جامہ پہنایا جارہا ہے اور وہ عرب علماء و محققین سے بھی داد و تحسین وصول کررہی ہیں، اس وقت دنیا میں مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنی بول چال کے لئے اُردو کا گرویدہ ہے، صرف برصغیر میں تقریباً چالیس کروڑ مسلمانوں اردو بولتے اور سمجھتے ہیں، یورپ اور افریقہ کے مختلف ملکوں نیز امریکہ و کناڈا وغیرہ میں برصغیر کے تارکین وطن کی وجہ سے اُردو وہاں کی زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں سے ایک ہوگئی ہے، میں جب برطانیہ گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں سے پانچ اُردو روزنامے نکلتے ہیں، خلیجی ممالک سے دو کثیر الاشاعت اُردو روزنامے شائع ہورہے ہیں، اس طرح اُردو ایک عالمی اور انٹرنیشنل زبان ہوگئی ہے۔

اس وقت دنیا کے اکثر آزاد دینی مدارس میں اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے، ہندو پاک میں تو ایسا ہونا باعث تعجب نہیں، لیکن امریکہ، یورپ اور افریقی ملکوں میں بھی آزاد دینی مدارس میں تدریس کی زبان اردو ہے، اس لئے مسلمانوں کے حق میں یقیناً اردو زبان کی اہمیت دوچند ہے، اردو ان کے مذہبی اور تہذیبی ورثہ کی امین ہے، اردو سے رشتہ کی استواری اپنی تاریخ، اپنے مذہب اور اپنی فکری اور تہذیبی روایات سے مربوط ہونا ہے، اردو زبان میں اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تعبیرات ایسی رچ بس گئی ہیں جیسے گلاب میں اس کی سرخی اور موتیا میں اس کی خوشبو، یہاں تک کہ غیر مسلم ادباء بھی اپنی تحریروں میں بے تکلف ''**ماشاء اللہ ، سبحان اللہ ، الحمد للہ ، نعوذ باللہ**'' وغیرہ الفاظ لکھتے ہیں اور ایسی تشبیہات سے کام لیتے ہیں جن کے پیچھے اسلامی فکر کارفرما ہوتی ہے۔

اہل اردو کو دینی مدارس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ معاشی مواقع سے رشتہ ٹوٹ جانے کے باوجود انھوں نے اس زبان کو زندہ رکھا ہے، اگر کوئی قوم اپنی زبان کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرلے

اوراس کے لئے کسی قدر قربانی دینے کے لئے تیار ہوتو کوئی طاقت اس سے اس کی زبان نہیں چھین سکتی، ہندی اور سنسکرت ایک ایسی زبان ہے جو کئی صدیوں سے حکمرانی سے محروم تھی اور سرکاری زبان فارسی تھی ؛ لیکن اس زبان کے بولنے والوں نے اسے زندہ رکھا، عبرانی زبان ہزاروں سال سے کسی حکومت کی زبان نہیں رہی ، نہ عام بول چال میں اس کا رواج رہا، لیکن یہودیوں نے زبان کو باقی رکھا اور اسرائیل بننے کے بعد اسے سرکاری حیثیت حاصل ہوئی، کیا مسلمان اپنی اس زبان کو جوان کی طرف منسوب کردی گئی ہے، اپنی کوششوں سے باقی نہیں رکھ سکتے ؟ یقیناً باقی رکھ سکتے ہیں ، بشرطیکہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ اور مخلص ہوں ، محض حکومتوں سے شکوہ اس مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتا، جو قومیں زندہ ، بالغ نظر، بیدار مغز اور حوصلہ مند ہوتی ہیں، وہ اپنے مسائل خود حل کرتی ہیں اور اپنے آپ کو بیسا کھیوں کا محتاج نہیں ہونے دیتیں۔

اس پس منظر میں اردو زبان کے بقا اور تحفظ کے سلسلے میں عام لوگ جو حصہ ادا کر سکتے ہیں، اس سے متعلق چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں :

☆ جو انگلش میڈیم اسکول مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں ، ان میں خاص طور پر اردو زبان کے لئے دسویں کلاس یا کم سے کم ساتویں کلاس تک مستقل ایک گھنٹی رکھی جائے اور پوری توجہ کے ساتھ تعلیم دی جائے ؛ کیوں کہ اب اردو میڈیم اسکول یا تو قائم نہیں ہورہے ہیں ، یا قائم ہورہے ہیں تو انھیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پارہی ہے جو ہونی چاہیے؛ اس لئے اب انگلش میڈیم اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے نہ سہی تو کم سے کم بحیثیت زبان ہی اردو پڑھانی ضروری ہے۔

☆ معیاری اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور عام لوگوں کا ذہن بنایا جائے کہ وہ ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ان میں اپنے بچوں کو داخل کریں، جیسا کہ مہاراشٹر اور بعض دوسرے صوبوں میں اردو میڈیم اسکولوں کی بہت اچھی کارکردگی سامنے آرہی ہے۔

☆ زیادہ سے زیادہ اخبارات ورسائل خرید کئے جائے، اس وقت ہندوستان میں اردو

کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ''منصف'' ہے جس کی اشاعت ساٹھ ہزار ہے، حیدرآباد کے تمام اردو اخبارات کی مجموعی اشاعت ایک لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، حالاں کہ حیدرآباد شہر، تلنگانہ اور کرناٹک و مہاراشٹر کے وہ اضلاع جو دکن اسٹیٹ میں شامل تھے، میں اردو قارئین کی تعداد ایک کروڑ سے کم نہ ہوگی، صرف حیدرآباد میں مسلمانوں کی آبادی تیس لاکھ سے متجاوز ہے، اگر پانچ فیصد اردو خواں حضرات بھی اردو اخبارات خرید کر پڑھنے کا مزاج بنالیں تو کم سے کم صرف حیدرآباد اور اس کے اطراف میں چھپنے والے اردو اخبارات کی تعداد اشاعت پانچ لاکھ سے بڑھ جائے گی، یہ حال تو حیدرآباد کا ہے جہاں اخبار خرید کر پڑھنے کا ذوق نسبتاً بہتر ہے، ملک کے دوسرے علاقوں میں تو اس سے بھی زیادہ افسوسناک صورت حال ہے، اس لئے اردو قارئین کو چاہیے کہ وہ ایک مہم کے طور پر اردو اخبارات و رسائل کی ہمت افزائی کریں اور ہوٹل کی میز پر اخبار پڑھنے کے بجائے شخصی طور پر زیادہ سے زیادہ اخبارات خرید کریں، ایک اخبار کی قیمت چائے کی ایک پیالی سے بھی کم ہوتی ہے، اگر آپ نے دو تین اخبار خرید کئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے آج دو تین پیالی چائے کم پی، لیکن اس سے آپ کی زبان کو جو تقویت پہونچے گی، آپ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔

☆ اردو کتابوں کی فروخت بھی بڑی مشکل سے ہوتی ہے، بعض کتابیں ایسی ہیں جو انگریزی یا عربی میں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں، لیکن وہی جب اردو زبان کا پیکر اختیار کرتی ہیں، تو ایک تو ہزار، گیارہ سو نسخے چھپتے ہیں اور ان کے نکلنے میں بھی دس، گیارہ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے، اس لئے ہمیں اپنے گھروں میں اردو کتابیں پڑھنے اور انھیں خریدنے کا مزاج بنانا چاہیے، اپنے دیوان خانوں کو مصنوعی پھولوں کے گلدستوں سے آراستہ کرنے کے بجائے کتابوں سے آراستہ کیجئے کہ یہ آپ کے اور آپ کی نسلوں کے لئے دل و دماغ کی غذا ہیں، نیز اپنی آمدنی کا ایک حصہ ہر ماہ کتابوں کے خرید کرنے کے لئے مخصوص کرلیجئے، اس طرح آپ اپنے ترکہ میں زر و زمین کے ساتھ ساتھ علم و دانش بھی چھوڑ کر جاسکیں گے۔

☆ اردو میں خط و کتابت اور نجی یادداشتیں لکھنے کا مزاج بنایئے، گھر میں اپنے بال بچوں

سے اردو ہی میں گفتگو کا اہتمام کیجئے اور خاص کر اتوار کے دن کو اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے کا دن بنائیے، گھر میں اردو زبان کا یہ ماحول اردو کے تحفظ اور اس کے بقا کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔

غرض کہ اردو زبان کے تحفظ میں ہمیں صرف سیاسی کوششوں پر قناعت نہیں کرنی چاہیے اور حکومتوں سے مطالبات کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے؛ بلکہ خود اپنا حصہ بھی ادا کرنا چاہیے، خود بے عملی کا راستہ اختیار کر کے حکومت سے تحفظ کا مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص دوسروں سے اپنے گھر کی حفاظت کی امید رکھے اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہے۔

۲۰/جنوری ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

بچوں کو اغواء ہونے سے بچایئے!

آج کل ظلم وتعدی اور زیادتی کی جو قبیح صورتیں سماج میں جڑ پکڑتی جارہی ہیں، ان میں ایک بچوں کا اغوا بھی ہے، معصوم بچوں کا اغوا کرلیا جاتا ہے اوران کی رہائی کے لئے منہ مانگی رقم طلب کی جاتی ہے، چوری اور ڈکیتی کی طرح اسے بھی پیسہ کمانے کا ایک حربہ بنالیا گیا ہے، ملک کی راجدھانی دلی کو اس سلسلہ میں خصوصی امتیاز حاصل ہے اور آئے دن وہاں اغوا کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

جب بھی اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے، ہلچل سی مچ جاتی ہے، اخبارات ورسائل ہوں یا الیکٹرانک میڈیا، ہر جگہ اس واقعہ کی گونج سنی جاسکتی ہے، قوم ومذہب اور علاقہ ووطن کی تفریق سے اوپر اٹھ کر تمام ہی لوگ ایسے واقعات پر ملول اور بے قرار ہوجاتے ہیں، اور ایسا ہونا فطری بات ہے؛ کیوں کہ بچے معصوم پھول ہوتے ہیں، پھول اگر کیچڑ میں ہو تب بھی محبوب ہوتا ہے، اسی طرح بچے امیر کے ہوں یا غریب کے، اس کی معصومیت، اس کا بھولا پن اور اس کی دل کو لبھا لینے والی حرکتیں ہر ایک کو عزیز ہوتی ہیں۔

لیکن اغوا کا ایک اور طریقہ بھی ہے، جس کی طرف لوگوں کا ذہن نہیں جاتا، جہاں لوگ خود اپنے بچوں کو اغوا کاروں کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں اور التجائیں کر کر کے اسے قبول کر لینے پر آمادہ کرتے ہیں، اس میں بچے کی جان کا خطرہ نہیں ہوتا، اغوا کاروں کی طرف سے رقم تو اچھی خاصی لی جاتی ہے، مگر زور زبردستی کے ساتھ نہیں، بلکہ ایسی محبت کے ساتھ کہ جیسے نذرانۂ عقیدت پیش کیا جارہا ہو، اس میں اغوا بچوں کے ایمان اور ان کے عقیدہ کا ہوتا ہے، اس میں جسم وتن کے بجائے دل ودماغ کا اغوا کیا جاتا ہے، اس میں مال وزر کے بجائے فکر ونظر کا تاوان وصول کیا جاتا ہے، اس میں دل کے ٹکڑے ماں باپ کی نگاہِ محبت سے محروم نہیں کئے جاتے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت سے محروم کئے جاتے ہیں، اس میں جسمانی

موت کا خطرہ تو نہیں ہوتا، لیکن روحانی موت کا خطرہ ضرور ہوتا ہے، مگر یہ اغوا کی ایسی صورت ہے کہ نہ اس پر دل لرزتے ہیں، نہ دماغ بے سکون ہوتا ہے، نہ زبان پر آہ وفغاں ہوتی ہے، نہ گھر میں کوئی کہرام مچتا ہے اور نہ سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، بلکہ مسرتوں اور خوشیوں کے سایہ میں اغوا کی یہ کاروائی انجام کو پہنچتی ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اغوا کی یہ کیا صورت ہے جو جبر و دباؤ کے بجائے رضاء ورغبت کے ساتھ عمل میں آتی ہے، جس کے لئے معصوم بچوں کے والدین خود روپے نثار کرتے ہیں، اور سر کے بل چل کر اپنی اولاد کا نذرانہ پیش کرتے ہیں؟ —— یہ اغوا شدہ بچے وہ نونہالانِ قوم ہیں جنھیں ایسی درسگاہوں میں رکھ دیا گیا ہے، جہاں خدا اور رسول ﷺ کا کوئی ذکر نہیں، جہاں آخرت کا تصور نہیں، جس میں اخلاقیات کو از کار رفتہ خیالات کا درجہ دیا جاتا ہے، جہاں مخلوط تعلیم اور لڑکیوں کے لئے کھلی ہوئی ٹانگوں پر مشتمل یونیفارم کو تہذیب وشائستگی کی علامت باور کیا جاتا ہے، اگر یہ درس گاہیں عیسائی مشنریز کے زیر انتظام ہیں، تو بچے حضرت مسیح علیہ السلام کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کرتے ہیں اور اگر ہندو انتہا پسند تنظیموں سے قربت ہے، تو وندے ماترم کا ترانہ پڑھوایا جاتا ہے اور گا ہے ان کے عقیدہ کے مطابق علم کی دیوی سرسوتی جی پر پھول بھی چڑھائے جاتے ہیں، غرض ہر دو جگہ بچوں کو ان کے مذہبی عقائد سے مانوس کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مسلمانوں کی تاریخ اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ مسلمان سلاطین گویا غارت گروں کا ایک گروہ تھے، انھوں نے ملک کی تعلیم وترقی کے لئے تو کوئی کام نہیں کیا، البتہ اپنی عیش کوشی اور عشرت سامانی کے ایک سے ایک سامان کئے اور لوگوں پر ظلم وستم اور جور و جفا کے پہاڑ ڈھائے۔

اس کے علاوہ موقع بہ موقع مسلمان طلبہ وطالبات کو احساسِ کمتری میں بھی مبتلا کیا جاتا ہے، کبھی انھیں دہشت گردی کا طعنہ دیا جاتا ہے، کبھی طلاق اور تعددِ ازدواج کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے، کبھی پردہ اور نقاب پر تنقید کی جاتی ہے، عورتوں کے تئیں اسلامی تعلیمات کو ناانصافی پر مبنی قرار دیا جاتا ہے، یہ مضامین چاہے کتاب میں لکھی ہوئی حالت میں موجود نہ ہوں، لیکن سبق

کے دوران استاذ اسے وقتاً فوقتاً طلبہ کے ذہن میں ڈالتا رہتا ہے اور درسگاہ کے پورے ماحول میں یہ سوالات ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مسلمان طلبہ و طالبات اپنے آپ کو سخت احساسِ کمتری کا شکار پاتے ہیں، یہ محض فرضی واقعات اور امکانی سوالات نہیں ہے، بلکہ غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی کسی بھی تعلیم گاہ کے دو چار مسلمان بچوں کو اگر آپ کریدنے کی کوشش کریں تو وہ اس کڑوی حقیقت کو آپ کے سامنے اگل دیں گے، اگر کبھی کسی کم ظرف شخص کی دریدہ دَہنی کی وجہ سے بات اسکول کے ماحول سے باہر آگئی تو اب لوگوں کے کان کھڑے ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کی طرف سے ردِّعمل کا مظاہرہ ہوتا ہے، لیکن اس ردِّعمل کی حیثیت ایک ایسی ناپائیدار آندھی کی ہے، جو زور وشور کے ساتھ آئے اور لمحوں میں گزر جائے۔

ان تعلیم گاہوں سے تعلیم پا کر جو مسلمان بچے باہر آتے ہیں، ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو نسلی مسلمان تو ہوتے ہیں، لیکن شاید شعوری طور پر مسلمان نہیں ہوتے، ابھی سال دو سال پہلے ٹی وی کے مقبول پروگرام ''کون بنے گا کروڑ پتی؟'' میں عرفان نامی لڑکا رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد کا نام بھی نہیں بتا سکا اور معروف ماہر تعلیم جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے چشم دید بیان کے مطابق IAS میں کامیاب ہونے والی طالبہ یہ نہیں بتا سکی کہ معراج سے کیا مراد ہے اور کیا اس عنوان سے سیرت کا کوئی واقعہ معروف ہے؟ یہ افسوس ناک مثالیں منظر عام پر آگئیں، ورنہ تو مسلمانوں کی نئی نسل میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اگر مسلمانوں نے اس صورتِ حال کی طرف توجہ نہیں کی اور اس کے سدباب کو نہیں سوچا تو ان کی نسلوں کو ذہنی طور پر اغوا کر لیا جائے گا اور وہ اسے محسوس بھی نہیں کر سکیں گے، ان کا نسبی رشتہ آباء واجداد سے ضرور قائم رہے گا، لیکن ان کا ایمانی رشتہ آپ ﷺ سے کٹ چکا ہوگا، خدا اور رسول ﷺ کی نسبت سے قلم اطاعت اٹھانے کے بجائے قلم بغاوت ان کے ہاتھوں میں ہوگا اور یہی غفلت خدانخواستہ ہماری صفوں سے سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور حمید دلوائی جیسی خدا بیزار شخصیتوں کو جنم دے گی۔

بچوں کا ذہن سادہ بلیک بورڈ کی طرح ہے، والدین اس پر جو کچھ لکھ دیں وہ نقش ہو جائے

گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بچوں کی تعلیم وتربیت کو بے حد اہمیت دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھی تربیت سے بہتر چیز نہیں دی ''**ما ورث والد ولدا خیرا من أدب حسنٍ**'' (مجمع الزوائد: ۸/ ۱۰۵، ۱۰۶) بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے کان میں اذان واقامت کہلائی جاتی ہے اور حدیث میں تلقین کی گئی ہے کہ بچوں کو پہلے اللہ کا نام لینا اور کلمۂ طیبہ پڑھنا سکھایا جائے، ان سب کا منشا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے رگ وریشہ میں سماجائے۔

اپنے بچوں کو شعوری طور پر مسلمان باقی رکھنے اور احساس کمتری اور مرعوبیت سے محفوظ رکھنے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں :

☆ مسلمان خود معیاری اسکول قائم کریں، یہ اسکول ''نہ نفع اور نہ نقصان'' کی اساس پر چلائے جائیں، ان اسکولوں کی توجہ فلک بوس عمارتوں کے بجائے افراد کی تعمیر پر ہو اور اپنے وسائل تعلیم کو کم خرچ اور معیاری بنانے پر صرف کئے جائیں، ان اسکولوں کا ماحول شریعت کی مقرر کردہ حدود سے ہم آہنگ ہو، یہ ضروری نہیں کہ اسکول کو مدرسہ بنادیا جائے اور ان کے لئے ایسا یونیفارم مقرر کیا جائے کہ وہ کسی دینی درسگاہ کے طالبِ علم محسوس ہوں، بلکہ شاید ایسا کرنا مناسب بھی نہ ہوگا؛ کیوں کہ ایسی سخت گیر تربیت سے وہی بچے اسکول میں آسکیں گے جو پہلے سے پختہ دینی ذہن رکھتے ہوں یا اہل دین اور اربابِ صلاح سے قریب ہوں، ان کے لئے تو گھر کا ماحول بھی دین پر قائم رہنے میں معاون ہوتا ہے، اصل مسئلہ ان بچوں کا ہے جن کے یہاں پہلے سے دینی مزاج و ماحول موجود نہ ہو، اس لئے یہ بات کافی ہے کہ طلبہ کا یونیفارم شرعی حدود کے دائرہ میں ہو اور درس گاہ کا مجموعی ماحول اسلامی ہو، اساتذہ کی ایسی تربیت ہو کہ خواہ وہ کوئی بھی مضمون پڑھائیں، لیکن اس کے ضمن میں اسلام کی عظمت دلوں میں بٹھاتے جائیں۔

☆ اردو میڈیم اسکولوں کو تقویت پہنچائی جائے، کیوں کہ زبان کی بجائے خود ایک تہذیب ہوتی ہے، اردو پڑھنے والے بچے ایک عظیم الشان اسلامی ورثہ سے جڑ جاتے ہیں، یہ تعلق ان میں اسلامی فکر کو پروان چڑھاتا ہے اور اسلامی تہذیب کے رنگ میں ان کو رنگ دیتا ہے۔

☆ اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی ضرورت بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب کی ہے، یہ مکاتب ناظرۂ قرآن پڑھانے اور کچھ دعائیں یاد کرانے تک محدود نہ ہوں، بلکہ منتخب آیات و احادیث کے ترجمے، رسول اللہ ﷺ کی مختصر سیرت اور آپ ﷺ کے اخلاقی واقعات، مسلمانوں کی تاریخ، علمی اور تمدنی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ، ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور آزادی میں مسلمان حکمرانوں کی خدمات جیسے اہم موضوعات کا بھی احاطہ کرتی ہو، مسلمانانِ گجرات کا نظامِ مکاتب اس سلسلہ میں ایک نمونہ اور آئیڈیل کا درجہ رکھتا ہے اور انھوں نے یورپ میں بھی اپنے اس نظام کو پورے انضباط و اہتمام کے ساتھ قائم رکھا ہے، جس کے گہرے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

☆ مغربی ملکوں میں ہفتہ واری دینی کلاسز کا مفید سلسلہ بھی ہے، جس میں ہفتہ اور اتوار کو مسلمان طلبہ و طالبات کی دینی تعلیم کا وسیع اور ہمہ گیر نظم کیا جاتا ہے اور اچھی خاصی واقفیت انھیں احکام دین کے سلسلہ میں ہوجاتی ہے، ہندوستان میں بھی منظم طور پر اسے رواج دینے کی ضرورت ہے اور مسجد کی شکل میں ہمارے پاس اس کے لئے مطلوب بنیادی انفرااسٹرکچر موجود ہے۔

☆ اپریل سے لے کر جون تک ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم گاہوں میں گرمائی تعطیلات ہوتی ہیں، یہ تعطیل کم و بیش پچاس دن پر مشتمل ہوتی ہے، پچاس دنوں کا وقت کچھ کم نہیں ہے، اگر صحیح طور پر اس وقت کا استعمال ہو، تاہم حالات کو پیش نظر رکھ کر طلبہ و طالبات کی عمر کے لحاظ سے اس پچاس روزہ مدرسہ کا نصاب مقرر کیا جائے اور باضابطہ طریقہ پر تعلیم و تربیت کی جائے تو اس سے بھی بڑا فائدہ ہوسکتا ہے، الحمد للہ اس وقت گرمائی کلاسز کا ایک مفید سلسلہ چل پڑا ہے، لیکن زیادہ تر کلاسز چند سورتوں اور دعاؤں کے یاد دلانے تک محدود ہیں، یقیناً ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس وقت مسلمانوں کی نئی نسل پر جو فکری یلغار ہورہی ہے، اس کے مقابلہ کے لئے صرف اتنی سی تعلیم کافی نہیں۔

موسمِ گرما سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف دینی جماعتیں اور تنظیمیں بھی اپنے پروگرام

چلاتی ہے، نوجوانوں کو ان سے وابستہ کرنا نہایت ہی مفید ہے، اس سے نہ صرف ان کی وقتی تربیت ہوتی ہے؛ بلکہ ان کو سلیم الفکر دوستوں کا ماحول مل جاتا ہے، اور یہ رفاقت انھیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھتی ہے، خاص کر اس حقیر کے تجربہ میں اگر طلبہ کچھ وقت تبلیغی جماعت کے پروگرام میں لگادیں، اور چالیس دن یا اس سے کچھ کم وقت بھی اس ماحول میں گزر جائے تو دینی اعتبار سے بہت پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے پھسلنے کے اندیشے کم ہو جاتے ہیں۔

اگر ہمیں اپنی نسلوں کے ایمان کو بچانا ہے اور عالمی سطح پر ان کو اغوا کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس سے محفوظ رکھنا ہے تو ہمیں ان تدبیروں کو اختیار کرنا ہوگا۔

۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ ۱۲/ مئی ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

دینی خدمت گذار اور امت کی ذمہ داری

جیسے جسم انسانی کا باقی رہنا روح پر موقوف ہے اور بظاہر جان کی حفاظت معالجین سے وابستہ ہے، اسی طرح مسلمان سماج کی روح دین ہے اور دین کی حفاظت اور اس کی بقاء علماء اور دینی خدمت گزاروں پر موقوف ہے، مساجد کے ائمہ اور مؤذنین نہ ہوں، تو مسجدیں کیوں کر آباد رہیں گی؟ خطباء و واعظین اور داعیان و مبلغین نہ ہوں، تو کس طرح لوگوں کی زندگی میں دین باقی رہے گا؟ اگر فتاویٰ دینے والے اہل افراد موجود نہ ہوں، تو حلال و حرام کے بارے میں کس طرح امت کی رہنمائی ہو سکے گی؟ اگر مدارس و مکاتب کا نظام نہ ہوتا تو کیا یہ بات ممکن بھی تھی کہ مسلمانوں کی حکومت گم ہو جانے کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی اس ملک میں مسلمان اپنے مذہبی تشخصات کے ساتھ باقی رہتے؟ دینی جماعتیں اور تنظیمیں اگر موجود نہ ہوتیں تو بہت سے قومی و ملی کام کس طرح انجام پا سکتے تھے؟ اگر اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والے علمی و تحقیقی ادارے، تصنیفات و تالیفات اور رسائل و جرائد موجود نہ ہوتے تو کیسے اسلامی فکر کی اشاعت ہوتی اور کس طرح مخالفِ اسلام افکار و نظریات کی تردید کی خدمت انجام پاتی؟

یہ تمام شخصیتیں، درس گاہیں، تحریکیں، تنظیمیں و ادارے اور کاوشیں اسلام کی خدمت کا حصہ ہیں اور ان کے ذمہ داران و کارکنان دینی خدمت گذار ہیں، جیسے کسی انسانی معاشرہ کے لئے ہسپتال اور اسکول ضروری ہیں، اسی طرح کسی قوم اور ملت کی بقاء کے لئے ان اداروں اور شخصیتوں نے معمولی خس پوش عمارتوں میں بیٹھ کر وہ خدمات انجام دی ہیں جو ہمارے بادشاہوں اور امراء و رؤساء نے قصور و محلات میں رہ کر بھی انجام نہیں دیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج اس ملک میں نوجوانوں کے اندر اسلام سے جو وابستگی اور شعائر اسلام کی جو محبت اور اسلام کے لئے کٹ مرنے اور نثار ہو جانے کا جو جذبہ موجود ہے، وہ مسلم سلطنتوں میں بھی موجود نہیں تھا؟ ایوانِ اقتدار سے محرومی اور اسبابِ عیش و عشرت سے مہجوری کے اس دور میں

اسلام کی اشاعت وحفاظت کی جو خدمت انجام پا رہی ہے اور علم وتحقیق کا جو کام سامنے آ رہا ہے، مسلمان حکومتیں بھی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں، ہندوستان سے کئی عالمگیر اسلامی تحریکیں اٹھی ہیں، آج مشرق سے مغرب تک چپہ چپہ پر اس کے نقوش موجود ہیں اور ان تحریکات نے پوری دنیا میں احیاء دین اور رجوع الی الاسلام کے ایک نئے جذبہ کو وجود بخشا ہے، بلکہ ان جذبات کو شورش وتلاطم سے ہم کنار بھی کیا ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اس خطہ سے ایسی فکری کشور کشائی اور جہاں بانی کی مثالیں نہیں دیکھی گئیں۔

ظاہر ہے یہ سب بظاہر ان ہی دینی خدمت گزاروں اور مذہب وملت کے وفا شعاروں کی سعی مسلسل اور کاوشِ بے غرض سے عبارت ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے معاشی وسائل محدود سے محدود تر اور کم سے کم تر، بلکہ بعض اوقات کمترین ہوتے ہیں، ان کے لئے شہر کے پرسکون اور بیش قیمت مقامات پر سکونت کا تصور کرنا بھی دشوار ہوتا ہے، یہ اپنے بچوں کو ذہنی استعداد بہم پہنچنے کے باوجود اعلیٰ عصری تعلیم کے بعض شعبوں میں داخل نہیں کر سکتے، انھیں سادہ رہن سہن اور معمولی اسبابِ زندگی پر قناعت کرنا پڑتا ہے، یہ بس اس لئے کہ وہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہیں، بلکہ ایک مشن اور تحریک کا حصہ ہیں، یہ مشن ہے اسلام کی حفاظت واشاعت کا، یہ مشن ہے دین کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کا، یہ تحریک ہے اسلام کی بقاء اور اس کے احیاء کی، اور یہ تحریک ہے نفس کی بندگی پر اللہ کی بندگی کو غالب رکھنے کی۔

کیا ہم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس طبقہ کے تئیں ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ہمارا ان کے ساتھ کیا سلوک ورویہ ہونا چاہئے؟ اور جو سلوک ہونا چاہئے کیا واقعی ہمارا عمل اس کے مطابق ہے؟ باپ سے بڑا حق دینی خدمت گزاروں کی توقیر اور ان کا احترام واکرام ہے، حضرت ابوامامہ ؓ راوی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> تین اشخاص وہ ہیں کہ جن کے ساتھ منافق ہی استخفاف اور بے توقیری کے ساتھ پیش آ سکتا ہے : بوڑھا مسلمان، عالم اور منصف مزاج امام۔ (مجمع الزوائد : ۱/ ۱۲۷، باب معرفۃ حق العالم)

''منصف مزاج امام'' (امام مقسط) میں اداروں، تنظیموں اور جماعتوں کے وہ ذمہ داران بھی شامل کئے جاسکتے ہیں جو انصاف اور دیانت پر قائم ہوں۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے کسی شخص کو قرآن کی ایک آیت بھی سکھادی وہ اس کا مالک ہے'' **من علم عبدا آية من كتاب الله فهو مولاه** ''اب نہ اس کے لئے اس کی تحقیر کی کوئی گنجائش ہے اور نہ یہ کہ وہ دوسروں کو اس پر ترجیح دے، (مجمع الزوائد: بحوالہ طبرانی: ۱/ ۱۲۸) ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کو بہ چشم محبت دیکھنے کو بھی باعثِ اجر قرار دیا، اس سے معلوم ہوا کہ علماء اور دینی کاموں کے ذمہ داروں کے بارے میں ہمارا رویہ توقیر واحترام اور جہاں تک ممکن ہو اعتبار واعتماد کا ہونا چاہئے۔

احترام میں یہ بات داخل ہے کہ کسی شرعی ضرورت کے بغیر ان کی غیبت اور ان کی کوتاہیوں کے اظہار واشاعت سے بچا جائے، کیوں کہ کوئی انسان غلطی سے پاک نہیں، لیکن جو لوگ دین کی خدمت انجام دے رہے ہوں، اگر ان کی کمزوریوں کو اچھالا جائے، تو اس سے نہ صرف ان کا اعتماد مجروح ہوگا، بلکہ خود دین پر لوگوں کا یقین متزلزل ہو جائے گا، علامہ ابن عبد البرؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک تفصیلی ارشاد نقل کیا ہے، جس میں عالم کے حقوق بتائے گئے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان ان کی کمزوریوں کا متلاشی نہ رہے، ''**أن لا تطلب زلته**'' ان کے راز کا افشاء نہ کرے اور نہ ان کی غیبت کرے'' **و أن لا تفشي له سرا ... و أن تحفظه شاهدا و غائبا** '' (کنز العمال، حدیث: ۲۹۵۲۰) افسوس کہ آج کل دینی کام کرنے والوں پر بے اعتباری، ان کے بارے میں افواہوں کا پھیلانا اور بلا تحقیق تبصرے کرنا، مسجد کی خدمت کرنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور اونٹ کو نگل جانے والے مصلیوں کا ان کے اندر تنکے تلاش کرنا ایک عام سماجی مرض ہو چکا ہے اور افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض دینی کاموں میں لگے ہوئے لوگ بھی علماء اور دینی اداروں کے خدمت گزاروں کی غیبت کرنے، بلا تحقیق تبصرے کرنے اور خوردہ گیری کرنے سے نہیں چوکتے۔ **و إلى الله المشتكى**

ایک اہم مسئلہ دینی کام کرنے والوں کی معاشی ضروریات کا ہے، ضروریات ہر انسان

کے ساتھ ہیں، یہ دنیا تمناؤں اور آرزوؤں سے سجائی ہوئی ہے، اس سے کسی بھی شخص کو مفر نہیں، اگر مرد زہد وقناعت کو اپنا شعار بنالے اور مادّیت کے خارزار سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کرے، تب بھی کیا گھر کی عورتوں اور بچوں سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ سب کے سب اسی رنگ میں رنگ جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک ناقابل عمل بات ہے، اس لئے امت کا فریضہ ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو اپنی ضرورت سمجھیں اور ان کی معاشی سطح کو اونچا اٹھانے کی کوشش کریں، انھیں اس بات سے خوشی ہو کہ جو لوگ ان کی دینی خدمت انجام دینے والے ہیں، وہ بہتر حالت میں ہیں، ایسا نہ ہو کہ اگر انھوں نے کسی امام، کسی دینی تنظیم یا جماعت کے سربراہ کو اچھے مکان میں رہتے، اچھے لباس میں ملبوس اور اچھی گاڑی پر چلتے ہوئے دیکھے تو اسے گھٹن ہونے لگے اور دل خوش ہونے کے بجائے رنجیدہ ہو کہ کچھ سال پہلے تو اس کے پاس جھونپڑی بھی نہیں تھی اور آج یہ بہتر مکان میں ہیں، کچھ دنوں پہلے سائیکل بھی میسر نہیں تھی اور اب آرام دہ کاریں ان کے قدموں میں ہیں، جیسے انسان اپنے اعزہ اور اہل تعلق کے بارے میں نیک جذبات رکھتا ہے اور ان کو بہتر معاشی موقف میں دیکھنا چاہتا ہے، علماء اور خادمین دین کے بارے میں بھی اس کے یہی جذبات ہونے چاہئیں، حضرت علی ﷺ نے عالم کا ایک حق یہ بھی قرار دیا ہے کہ اگر اسے کوئی حاجت پیش آئے تو لوگ اس کی خدمت میں سبقت کرنے کی کوشش کریں ''وإن کانت لہ حاجة سبقت کل القوم إلی خدمته''۔ (کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۹۵۲۰)

رسول اللہ ﷺ نے ایک دینی خدمت گذار سے فرمایا کہ ہم پر اتنا واجب ہے کہ تمہارے خورد ونوش کا نظم ہو جائے، رہائش کا انتظام ہو جائے، تم شادی کرلو اور خادم رکھ لو، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی شخص کو اتنا حق المحنت ملنا چاہئے کہ خورد ونوش اور رہائش کا نظم کر سکے، جو کام انسان خود نہ کر سکے اس کے لئے خادم کا نظم ہو، خادم انسان بھی ہو سکتا ہے اور خدمت گذار مشینیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نکاح کرنے میں بیوی بچوں کے اخراجات اور ضروریات بھی شامل ہیں، لیکن بنظر انصاف دیکھا جائے کہ آج مساجد میں ائمہ ومؤذنین کو، مدارس ومکاتب میں اساتذہ ومعلمین کو اور مختلف دینی جماعتوں میں خدام وکارکنان کو کیا تنخواہیں میسر ہیں؟ پھر اپنے

گریبان میں جھانک کر دیکھا جائے کہ کیا ہم اپنی کم سے کم ضروریات معمولی سطح پر بھی اس قلیل وحقیر حق المحنت سے پوری کر سکتے ہیں؟

اس کوتاہی میں مساجد و مدارس اور تنظیموں اور اداروں کے ذمہ داروں کا قصور کم ہے اور امت کے اصحابِ ثروت کا قصور زیادہ ہے، ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہم مسجد کے پر شکوہ میناروں اور جاذبِ نظر گنبدوں کی تعمیر کے لئے تو پیسے دیتے ہیں، جلسوں اور جلوسوں اور کانفرنسوں اور ریلیوں کے لئے تو تعاون کرتے ہیں، لیکن دین کی خدمت کرنے والے افراد و اشخاص جو ہمارے تعاون کے اصل مستحق ہیں، ان پر خرچ کرنے اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے تعاون کی توفیق نہیں ہوتی، بلکہ بعض لوگ تو اسے مدِ فضول یا کم اجر والا کام خیال کرتے ہیں، اللہ تعالی نے انفاق کی خاص مد کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

> ...... ان حاجت مندوں کے لئے جو اللہ کے راستہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں آنا جانا نہیں کر سکتے، ناواقف انھیں ان کی خود داری کی وجہ سے مالدار خیال کرتے ہیں، تم انھیں ان کے چہرے کے نقوش سے سمجھ سکتے ہو، وہ لوگوں سے گڑ گڑا کر نہیں مانگتے اور جو بھی تم خرچ کروگے، اللہ اس سے خوب آگاہ ہیں۔ (البقرہ:۲۷۳)

یہ اللہ کے راستے میں روکے ہوئے کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں وہ دینی کام کرنے والے بھی شامل ہیں، جو کاروبار اور معاشی تگ و دو کے لئے اپنے وقت کو خالی نہیں کرتے، اور اللہ کی زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ محتاج عالم پر صدقہ کرنے کا ثواب زیادہ ہے ''**التصدق علی الفقیر العالم أفضل من التصدق إلی الجاهل**'' (ہندیہ:۱/۱۸۷) اسی طرح مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ نے علماء کے ساتھ ساتھ زاہدوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ (درّ مختار مع الرد:۳/۳۰۴)

آج کل بعض حضرات یہ مہم چلا رہے ہیں کہ مدارس میں عام قسم کی ٹکنیکل تعلیم دی جانی چاہئے، تاکہ ہنر مند علماء پیدا ہوں اور اس طرح ان کے معاشی حالات بہتر ہوں، اس سے قطع

نظر کہ اس کے بعد ہنر مند حفاظ وعلماء آئندہ اپنے ہنر کی خدمت کریں گے یا دین کی؟ اس پر کیوں توجہ نہیں دی جاتی کہ ہم اپنی قوم کو اس جانب متوجہ کریں کہ وہ اپنے علماء اور دینی خدمت کرنے والوں کے معاشی معیار کو بہتر بنائیں اور اس کے لئے حسب ضرورت قربانی دیں؟

آخر میں حضرت ابو مالک اشعری ﷜ کی ایک روایت نقل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے، ان میں سے تیسری بات یہ ہے کہ لوگ صاحبِ علم کو دیکھیں گے، اسے ضائع کردیں گے اور اس سے بے توجہی برتیں گے، **وأن یروا ذا علمهم فیضیعونه و لا یبالون علیه** ۔ (مجمع الزوائد : ۱/ ۱۲۸)

ضائع کرنے سے مراد ان کو اہمیت نہ دینا اور ان کی ضروریات سے بے توجہی برتنا ہے۔

۱۷/ جمادی الاولی ۱۴۲۴ھ ۱۸/ جولائی ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

ائمۂ مساجد — فرائض اور ذمہ داریاں

صحت مند مردوں کے لئے جو سفر میں نہ ہوں، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا واجب ہے، اس میں اختلاف ہے کہ جماعت ہر شخص پر انفرادی حیثیت سے واجب ہے، یا ایک محلّہ کے مسلمانوں پر اجتماعی طور پر واجب ہے اور انفرادی حیثیت سے اہم ترین سنتِ مؤکدہ ہے؟ لیکن جماعت کی اہمیت اور اس کی فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، قرآن مجید میں بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ، (البقرۃ:۴۳) حدیثوں میں بھی ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو جماعت میں شریک نہ ہوں اور رسول اللہ ﷺ سے لے آج تک ہر عہد میں مسجدوں میں جماعت کے اہتمام کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔

جب بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے گی یقیناً ایک امام اور بقیہ لوگ مقتدی ہوں گے، ایک شخص نماز پڑھائے گا باقی لوگ اس کی پیروی کریں گے، اس طرح امام کی حیثیت مقتدیٰ اور رہنما کی ہوئی، یہ معنی خود اس کے اندر موجود ہے، عربی زبان میں ''امام'' کہتے ہی اسے ہیں جس کی اقتدا کی جائے، یعنی قوم کا سردار، اسی نسبت سے مصلح قوم، نبی، خلیفہ اور سپہ سالارِ لشکر کو عربی زبان میں 'امام' کہتے ہیں، (القاموس المحیط:۱۳۹۲) اسی مادہ سے عربی زبان میں ایک اور حرف ''اُم'' کا آیا ہے، جس کے معنی کسی چیز کی اصل اور جڑ کے آتے ہیں، اور ''اُم القوم'' کے معنی ''سردارِ قوم'' کے ہیں، (القاموس المحیط:۱۳۹۱) ماں چوں کہ انسانی وجود کے لئے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے اسے بھی ''اُم'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام کی اصطلاح میں یہ لفظ دو عہدوں کے لئے استعمال ہوا ہے: ایک وہ شخص جو نماز پڑھائے، دوسرے وہ شخص جو مسلمانوں کی سربراہی پر فائز ہو، بعض حضرات نے نماز کی امامت کو ''امامتِ صغریٰ'' اور قوم کی اجتماعی قیادت کو ''امامت کبریٰ'' سے تعبیر کیا ہے، اس تعبیر سے واضح ہے کہ امامت قیادت سے عبارت ہے اور مسجد کا امام گویا اہل مسجد کا رہبر و رہنما ہے، رسول

اللہ ﷺ کے بعد صحابہ ؓ نے باتفاقِ رائے حضرت ابوبکر ؓ کو خلیفہ منتخب کیا، حضرت ابوبکر ؓ کے علم و فہم، ورع و تقویٰ اور حسن اخلاق کے علاوہ اس انتخاب میں جس چیز نے صحابہ ؓ کی رہنمائی کی، وہ یہی کہ اپنے مرضِ وفات میں آپ ﷺ نے اپنی جگہ حضرت ابوبکر ؓ کو امام بنایا، یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ آپ ؓ ہی امت کی قیادت و امامت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اس سے مساجد میں امامت کے منصب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، امام کے سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، امام کی ذمہ داریاں اور امام میں مطلوبہ صلاحیت، امام بنیادی طور پر مقتدیٰ اور رہنما ہوتا ہے، عام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ مذہبی امور میں امام سے رہنمائی حاصل کریں، رسول اللہ ﷺ نے نماز کے سلسلہ میں امام کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا :

إنما جعل الإمام ليؤتم به فإذا كبر فكبروا وإذا قرأ فانصتوا ، وإذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين ، وإذا ركع فاركعوا ، وإذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا اللهم ربّنا ولك الحمد وإذا سجد فاسجدوا وإذا صلى جالساً فصلوا جلوساً أجمعين .

امام اس لئے ہے کہ اس کی اتباع کی جائے ، لہذا جب وہ اللہ اکبر کہے، تم بھی اللہ اکبر کہو، جب قرأت کرے تو تم خاموش رہو، جب **غير المغضوب عليهم و لا الضالين** کہے تو آمین کہو، جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب **سمع الله لمن حمده** کہے تو تم **اللهم ربنا و لك الحمد** کہو، الخ ۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۸۴۶)

گویا امام قائدِ نماز ہے اور مقتدی کے لئے ہر نقل و حرکت میں اس کی اقتداء و اتباع واجب ہے، جب نماز اسلام کا رکن اعظم ہے، اس میں امام کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ زندگی کے دوسرے مسائل میں بدرجہ اولی امام کی اتباع واجب ہوگی۔

اسی سے امام کی ذمہ داریاں واضح ہوتی ہیں، قیادت صرف اعزاز نہیں ہے، بلکہ ذمہ

داریوں سے عبارت ہے، رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اوراس کے بعد بھی امام کی حیثیت سماج میں مصلح اور رہنما کی ہوا کرتی تھی، جسے سردارِ قوم نامزد کیا جاتا وہی لوگوں کی امامت بھی کیا کرتا، امام کی ذمہ داریوں میں لوگوں کی تعلیم وتربیت، سماجی مسائل میں ان کی مشکلات کو حل کرنا، باہمی اختلاف کو رفع کرنا، لوگوں کو معروف کی دعوت دینا اور منکر سے روکنا، ان کے عام قسم کے نزاعات اور مقدمات کو فیصل کرنا، اگر آپس میں اختلاف ہو تو ان میں صلح کرانا شامل ہے، امام ان تمام امور کو انجام دیا کرتا تھا، اس طرح امام سماج کے دل کی دھڑکن اور معاشرہ کی ہمہ پہلو ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہوا کرتا تھا، اس لئے بڑے بڑے علماء اور محدثین وفقہاء اس فریضہ کو ادا کرتے تھے۔

آج بھی مسلمانوں کے سماجی مسائل کو حل کرنے اور ان میں اتحاد ویکجہتی کو برقرار رکھنے کی صورت یہی ہے کہ مساجد کو مسلمانوں کا ہمہ مقصدی مرکز بنایا جائے اور امام کی حیثیت اس کے ذمہ دار اور رہنما کی ہو، ہر مسجد کے تحت بچوں اور بڑوں کے لئے دینی تعلیم کے مکاتب ہوں، روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل میں شرعی احکام کی رہنمائی کا نظم ہو، ہر مسجد کے تحت محلّہ کے لوگوں کے مسائل کو حل کرنے، ان کے اختلاف کو دور کرنے اور خاص کر ازدواجی الجھاؤ کو حل کرنے کے لئے امام کی رہنمائی میں پنچایت کمیٹی ہو، مساجد کے تحت ضروری اسلامی لٹریچر سے آراستہ لائبریری کا انتظام ہو، محلّہ میں اگر کوئی برائی پھیل رہی ہو، تو اس کو دور کرنے کے لئے اجتماعی کوشش کی جائے، محلّہ کے غرباء اور ضرورت مند مسلمانوں کا سروے کیا جائے، مسجدوں کے ریکارڈ میں ان کی بنیادی مطلوبہ ضروریات مندرج ہوں اور اگر محلّہ کے دوسرے لوگوں کے پاس زائد از ضرورت اشیاء، جیسے فاضل برتن، کپڑے، فرنیچر، دوائیں وغیرہ ہوں، تو ان کا ڈاٹا بھی مسجد میں موجود ہو اور محلّہ کے جن ضرورت مندوں کو مطلوب ہو، انھیں یہ چیز پہنچائی جائیں، اسی طرح مسجد کے تحت اجتماعی طور پر 'صدقۃ الفطر' جمع کیا جائے اور مستحق لوگوں تک انھیں پہنچایا جائے، تو مسجد لوگوں کی سماجی اور معاشی ضروریات کو پورا کرنے کا ایک ہمہ مقصدی مرکز بن سکتا ہے۔

ان تمام کاموں کو امامِ مسجد کی رہنمائی میں انجام دیا جاسکتا ہے، اس طرح مسجدیں صرف عبادت گاہ ہی نہیں رہیں گی، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک ہمہ مقصدی اور سماجی مراکز کی حیثیت حاصل کرلیں گی اور ائمۂ مساجد کی حیثیت صرف نماز پڑھانے والے امام ہی کی نہیں ہوگی، بلکہ ایک ایسے رہنما کی ہوگی جو تمام مذہبی اور سماجی مسائل میں امت کی رہبری کا فریضہ انجام دیتا ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ امامت ایک مذہبی مشن اور دینی تحریک کے بجائے بندھی، ٹکی ملازمت بن گئی ہے، ایک امام پچیس سال سے امامت کرتا ہے، لیکن اس کا کام صرف مسجد میں آنے والوں کو نماز پڑھا دینا ہے، پچیس سال میں اس نے نماز نہ پڑھنے والے پچیس افراد کو بھی نمازی بنانے میں کامیابی حاصل نہیں کی، محلّہ میں بڑی سے بڑی نزاع پیدا ہوجائے، کتنے ہی اختلافات بڑھ جائیں، لیکن صلح کی کوشش کرنا اور ایسے اختلاف کو حل کرنا امام اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔

امامت کے لئے مطلوبہ صلاحیت کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے جو ترجیحات بیان فرمائی ہیں، ان میں دو نہایت اہم ہیں، جن کا ذکر اکثر حدیثوں میں آیا ہے، ایک قرآن مجید کی قراءت اور دوسرے احکامِ دین کا علم "**یؤم القوم أقرأهم لكتاب الله فإن كانوا في القراءة سواء فأعلمهم بالسنة**" (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ امام کو ایک تو قرأت قرآن سے بہتر طور پر واقف ہونا چاہئے، دوسرے نمازیوں سے متعلق شرعی مسائل سے بھی بہتر طور پر آگاہ ہونا چاہئے، علم کے اس وسیع دائرہ میں عبادات، معاملات اور مسلمانوں کے سماجی مسائل سبھی آجاتے ہیں، البتہ مقام کے لحاظ سے امت کی ضروریات اور تقاضے مختلف ہوتے ہیں، ایک شخص شہر کے کسی تعلیم یافتہ محلّہ میں امامت کرتا ہو، کسی کالج اور یونیورسٹی میں امام ہو، مارکٹ اور بازار میں امامت کا فرضہ انجام دے رہا ہو، غریب بستی اور مسلم آبادی میں مسجد واقع ہو، دیہات اور گاؤں میں امامت کررہا ہو، ظاہر ہے ان تمام مقامات پر لوگوں کے مسائل اور ان کی ضروریات یکساں نہیں ہوں گی، ہر جگہ لوگ اپنی سطح کے لحاظ سے امام سے رہنمائی کے طالب ہوں گے، دیہات میں مسائل محدود ہوں گے اور کم استعداد کے ذریعہ بھی

ان کی ضروریات پوری ہو جائیں گی ، شہر میں لوگوں کے مسائل بہ نسبت دیہات کے زیادہ ہوتے ہیں، تعلیم گاہوں اور پڑھی لکھی آبادیوں میں لوگ گہرے علمی سوالات کرتے ہیں اور فکری اعتبار سے بہت سے لوگوں میں انحراف پایا جاتا ہے، ان کو مطمئن کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ استعداد مطلوب ہوگی ، اس لئے محلّہ اور مقام کے اعتبار سے امام میں صلاحیت مطلوب ہے، لیکن فی الجملہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے مسائل کو براہِ راست یا دوسرے اہل علم کے تعاون سے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ہر امام کی حیثیت اپنے ماحول میں دین کے داعی اور مبلغ کی ہے، دعوت کے لئے علم، حکمت اور دردمندی بنیادی ہتھیار ہیں، جس چیز کی دعوت دی جائے ، اس کے بارے میں علم ہی نہ ہو، تو اس کی دعوت ناقص اور ناتمام ہی ہوگی ، اگر حکمت اور دوراندیشی نہ پائی جاتی ہو لوگوں کے مسائل کو سمجھانے اور انھیں برائیوں سے روکنے کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا اور انسانوں کے لئے سب سے بڑا رہنما دردِ دل ہے، دلِ دردمند کے بغیر اصلاح کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی، یہ دردمندی ہی ہے جو انسان کو دوسرے کے لئے گھلنا اور اپنے آپ کو گھلانا سکھاتی ہے۔

ائمہ کو ان فرائض کی ادائیگی کے لائق بنانے کے لئے سہ طرفہ کوشش ضروری ہے: اوّل تو خود ائمۂ مساجد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اپنے منصب و مقام کو سمجھیں، وہ قوم کے ملازم نہیں، بلکہ ان کے رہبر و رہنما ہیں اور ان کی نگاہ اجرت کے بجائے اجر پر ہونی چاہئے ، یہ راہ عسرت و تنگی ، صبر و قناعت اور عیش و عشرت سے مہجوری کی ہے اور جس کا دل اس کے لئے تیار نہ ہو اس کے لئے اس کوچہ میں قدم رکھنا کسی طور مناسب نہیں۔

دوسری ذمہ داری دینی مدارس کی ہے، مدارس میں ائمہ کی تربیت کا شعبہ ہونا چاہئے ، اس شعبہ میں صرف تصحیح قراءت پر اکتفاء نہ کیا جائے ، بلکہ ائمہ میں خطابت کی صلاحیت پیدا کی جائے ، اپنے عہد کے سماجی مسائل سے ان کو واقف کرایا جائے ، انھیں نزاعات کے فیصلوں کی تربیت دی جائے ، ضروری حد تک کمپیوٹر کی تربیت دی جائے ، مقامی زبان سے واقف کرایا

جائے، جنرل نالج کی کوئی کتاب بھی پڑھائی جائے، تاکہ وہ ایک زمانہ شناس، معاملہ فہم اور رہبری کی صلاحیت کا حامل امام بن سکے۔

تیسری ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے، بدقسمتی یہ ہے کہ لوگ دنیا کے معاملہ میں تو قابل سے قابل اور باصلاحیت سے باصلاحیت افراد کی تلاش کرتے ہیں، اور اس کے لئے منھ مانگی تنخواہیں ادا کرتے ہیں، لیکن دینی کاموں کے لئے ایسے افراد کے متلاشی ہوتے ہیں جسے کم سے کم پیسے دیئے جاسکیں، ائمہ سے اتنی حقیر تنخواہوں پر کام لیا جاتا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔

یہ کیسی زیادتی کی بات ہے کہ آپ امام سے صلاحیت، آئی اے ایس آفیسر کی سی چاہیں اور تنخواہ چپراسی کی بھی دینے کو تیار نہ ہوں، صورتِ حال یہ ہے کہ مسجد کی تزئین و آرائش، اس کے بلند میناروں اور جاذبِ نظر گنبدوں کی تعمیر پر تو لاکھوں روپئے خرچ کئے جاتے ہیں، لیکن مسجد کے خدام (جو اصل میں نماز جیسی عبادت کے ذمہ دار اور فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق ''ضامن'' ہیں) پر اس کا ہزارواں حصہ بھی خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

یہ ایک افسوس ناک رجحان ہے، خشت و سنگ کی دیواروں اور آراستہ و پیراستہ عمارتوں سے کسی قوم کی تعمیر نہیں ہوتی، انسان کی تعمیر انسان ہی سے ہوتی ہے، اس لئے مساجد کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ ائمہ کو کم سے کم اتنی تنخواہ تو دیں کہ ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں، اس کے علاوہ مساجد میں امام سے ملاقات کے لئے آفس، اس کی مراجعت کے لئے کتب خانہ اور خدامِ مسجد کے لئے رہائش، محلّہ کی ضروری معلومات کا ڈاٹا محفوظ کرنے کے لئے کمپیوٹر اور اس طرح کی ضروریات اگر مسجد کی جانب سے مہیا ہوں، تو امام مطلوبہ فرائض کو انجام دے سکتا ہے اور مسجدیں ہمہ مقصدی مذہبی مراکز کی حیثیت حاصل کرسکتی ہیں۔

۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ ۳/ اکتوبر ۲۰۰۳ء

❏ ❏ ❏ ❏

مواعظِ جمعہ — کچھ مخلصانہ مشورے

اسلام کے امتیازات میں سے ایک اس کی اجتماعیت ہے، قرآن وحدیث میں قدم قدم پر مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اتحاد اور اجتماعیت کو برقرار رکھیں، پھر اس نصیحت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عبادات 'جس کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہوتا ہے' میں اجتماعی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، نمازیں گھر پر بھی ادا کی جاسکتی تھیں اور انھیں تنہا تنہا بھی پڑھا جاسکتا تھا، جیسا کہ نفل نمازیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان میں جماعت کو واجب قرار دیا گیا اور اس طرح ہر دن کم سے کم پانچ وقت محلّہ کے مسلمان جمع ہوتے اور ایک دوسرے سے ملتے ہیں، روزہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا، زکوۃ کی بنیاد ہی باہمی تعاون وتناصر اور اجتماعی کفالت پر ہے، حج پوری امتِ مسلمہ کا بین الاقوامی اجتماع ہے، جو دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے افرادِ امت کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے، اسلام کی ایک عبادت قربانی ہے، یہ اصل میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خودسپردگی اور فدا کاری کی یادگار ہے، لیکن یہ تقریبِ عید بھی ایک ہی دن اور ایک ہی وقت منعقد ہوتی ہے اور مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں اور پڑوسیوں کو قربانی کی سوغات بھی پیش کرتا ہے، یہ تو عبادات ہیں، زندگی کے دوسرے مسائل میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ امت انفرادی وجود کے ساتھ ساتھ اپنے اجتماعی وجود کو بھی برقرار رکھے، یہی اس کی اصل طاقت و قوت اور یہی دنیا میں اس کی سربلندی وسرفرازی اور فلاح وکامیابی کی کلید ہے۔

نماز چوں کہ امت کے ہر طبقہ پر فرض ہوتی ہے، غریب ہو یا امیر، جوان ہو یا بوڑھا، صحت مند ہو یا مریض، مسافر ہو یا مقیم، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ، اس لئے اس کو مسلمانوں کی اجتماعیت، باہمی ارتباط اور دعوت واصلاح کے لئے خاص طور پر ذریعہ ووسیلہ بنایا گیا، پانچ وقت کی نمازوں میں مسجد کے اڑوس پڑوس کے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا، کئی محلوں کے لوگوں کو

جوڑنے کے لئے ہفتہ میں ایک دن جمعہ کی نماز رکھی گئی، سال میں دو دن عید کے رکھے گئے، تا کہ پورے شہر کے لوگ اکٹھا ہو جائیں، یہ مذہبی اجتماعات اسلام کی پہچان بھی ہیں اور دعوتی اعتبار سے بھی ان کی خاص اہمیت ہے، خاص طور پر جمعہ کی نماز ہر ہفتہ مسلمانوں کو یکجا کرتی ہے، اس نماز کے ساتھ ایک ضروری عمل خطبہ کا رکھا گیا اور نماز سے پہلے اس کی جگہ متعین کی گئی، تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ خطبہ میں شریک رہیں، پھر اس خطبہ کے سننے کی تاکید کی گئی۔

جمعہ کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کو فرض قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ قیامت تک کے لئے ہے، جو اسے بغیر عذر چھوڑے گا، —— چاہے امامِ عادل جمعہ پڑھائے یا جابر و ظالم، —— تو اس کے حالات سنور نہیں سکیں گے، اس کے معاملہ میں برکت نہیں ہوگی، نہ اس کی نماز مقبول ہوگی، نہ حج، نہ صدقہ اور نہ کوئی اور نیکی، (مجمع البحرین: ۲/۱۹۴) اور جمعہ میں گفتگو کرنے کو منع کیا گیا اور خاموش رہنے کا حکم فرمایا گیا، یہاں تک کہ اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کوئی دوسرا گفتگو کر رہا ہو تو اسے خاموش رہنے کی زبان سے تلقین کی جائے، بلکہ ایسے شخص کو اشارہ سے خاموش رہنے کی ترغیب دینے کی بات فرمائی گئی۔

اس طرح جمعہ مسلمانوں کے لئے ہفتہ وار اجتماعیت اور خطبہ اس اجتماع میں تذکیر و موعظت اور دعوت و اصلاح کی ایک مسلسل اور مستقل تدبیر ہے، شاید کسی قوم میں اس کی مثال مل سکے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اصلاحی اعتبار سے جمعہ کا اجتماع جس قدر مؤثر اور مفید ہے، شاید ہی کوئی اور جلسہ اور اجتماع مسلمانوں کی زندگی پر اس درجہ اثر انداز ہو، مسجد کا ماحول، چوں کہ نماز سے پہلے جا نہیں سکتے؛ اس لئے پوری یکسوئی اور توجہ، سارے لوگ پاکی کی حالت میں، صفائی ستھرائی کی وجہ سے ماحول میں انبساط اور جمعہ کا تقدس اور اس کی عظمت کا تصور، پھر ہر ہفتہ تسلسل کے ساتھ تقریباً ایک ہی خطیب کی بات کو سننا اور اپنے دل و دماغ میں اسے جذب کرنا، یہ ساری باتیں وہ ہیں جو انسان کے دل و دماغ پر گہرے نقوش مرتسم کرتی ہیں، اور قلب و ذہن کے تزکیہ میں نہایت مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین نیز بعد کے ائمہ و سلاطین نے خطبہ عربی زبان میں

دیا ہے، اب ان کا عربی میں یہ خطبہ دینا اس وجہ سے تھا کہ خطیب اور سامعین کی زبان عربی تھی اور عربی نہیں تو عرب فاتحین کی وجہ سے لوگوں پر اس زبان کا ایک خاص اثر تھا، اور عربی نہ جاننے والے لوگ عربی زبان کو جاننے کی کوشش کرتے تھے، یا اس لئے کہ خطبہ میں ایک پہلو ذکر وعبادت کا بھی ہے، قرآن نے اس کو'ذکر' سے تعبیر کیا ہے اور اسی لئے فقہاء نے اسے نماز جمعہ کے لئے شرط قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں دو نقاطِ نظر ہیں، پہلے نقطۂ نظر کے حاملین سامعین کی زبانوں میں بھی خطبہ کی اجازت دیتے ہیں اور دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار کرنے والے حضرات عربی زبان ہی میں خطبہ ضروری قرار دیتے ہیں، اور دونوں ہی کے پاس اپنی رائے کے لئے بعض معقول دلائل موجود ہیں۔

آج کل ایک درمیانی شکل یہ مروّج ہوگئی ہے کہ خطبہ عربی زبان میں دیا جائے، اس سے پہلے اردو یا علاقہ کی مروّجہ زبان میں ایک تذکیری اور اصلاحی بیان ہو جائے، یہ سب سے بہتر شکل ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں کسی کا اختلاف نہیں اور فی الجملہ حدیث سے اس کا ثبوت بھی ہے، سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد غزوۂ احد تک حضور ﷺ کے خطبۂ جمعہ سے پہلے منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی تھوڑی دیر خطاب کرتا تھا، اور اس میں اللہ ورسول کی اطاعت کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلاتا تھا، غزوۂ احد میں آپ ﷺ کے ساتھ اس نے جو بدعہدی کی اور عین مقابلہ کے وقت اپنے متبعین کے ساتھ میدانِ جنگ سے لوٹ آیا، اس نے انصارِ مدینہ میں (جو اس کو ایک مخلص مسلمان سمجھتے تھے) بے وقار اور ناقابل اعتبار بنادیا، چنانچہ خود انھوں نے اسے خطاب سے روک دیا اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا، اس سے فی الجملہ خطبہ سے پہلے خطاب کا ثبوت ملتا ہے، اسی طرح بنوامیہ کے عہد میں مروان کے خطبہ سے پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے خطاب کا بھی ذکر آیا ہے، لہذا خطبہ سے پہلے خطاب ایک حد تک عہد نبوی ﷺ اور عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ثابت ہے۔

یہ خطاب اصلاح وتربیت، تعلیم وتزکیہ اور ذہن سازی کے لئے نہایت سنہرا موقع ہے، ہر ہفتہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ جب کوئی بات کہی جاتی ہے، تو دل ودماغ پر اس کا گہرا اثر

پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ فکر ونظر کا سانچہ بنتا جاتا ہے، پانی کی تیز لہریں، جن میں تسلسل اور دوام نہ ہو شوریدہ سر موجوں کے ذریعہ ایک طوفان تو کھڑا کر دیتی ہیں، لیکن ان سے کسی سخت جان پتھر کے دل میں سوراخ نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر کسی چٹان پر مسلسل پانی کا ایک قطرہ گرتا رہے، تو وہاں گہرا سوراخ پڑ جاتا ہے، وقتی اجتماعات، طویل الاوقات جلسوں، کانفرنسوں اور جمعہ کے بیانات و ہفتہ وار دروس و اجتماعات کے درمیان یہی فرق ہے، اس لئے جمعہ عام مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کے لئے نہایت ہی بہترین موقع ہے، جس میں دیندار اور کم دیندار، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، پابندِ نماز اور نماز میں غفلت و کوتاہی برتنے والے ہر طرح کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور وہ پوری توجہ، یکسوئی اور جذبۂ تاثر کے ساتھ اسے سنتے ہیں، اگر ان بیانات کا رخ صحیح ہو، تو یہ تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ و وسیلہ بن سکتے ہیں۔

ان بیانات میں جن باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں :

☆ خطاب اصلاحی اور مثبت موضوعات پر ہوں اور خاص طور پر سماجی مسائل، —— نکاح و طلاق، مختلف رشتہ داروں کے حقوق، میراث کے احکام، باہمی اختلاف کو حل کرنے کا طریقہ، فضول خرچی کی ممانعت، کسبِ حلال کی اہمیت، منشیات سے اجتناب، پڑوسیوں سے تعلقات غیر مسلم بھائیوں سے روابط، بلند اخلاقی، نظافت و ستھرائی، پردہ کے احکام، تعلیم کی اہمیت وغیرہ —— کو ایک ترتیب کے ساتھ موضوعِ گفتگو بنایا جائے۔

☆ بیانات میں موقع و حال کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے، جیسے ہجری سال کی ابتداء پر ہجرت اور ہجری تقویم، محرم میں یوم عاشوراء، صفر میں برکت و نحس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر، ربیع الاول میں رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ، رجب میں واقعۂ معراج کا عبرت خیز پہلو، نماز کی اہمیت، شعبان میں شبِ براءت، انفاق اور توبہ، رمضان المبارک میں روزہ، قرآن مجید، احکامِ زکاۃ، اعتکاف اور قیامِ لیل کے فضائل، ذوالحجہ میں حج اور قربانی وغیرہ مسائل پر خطاب کیا جائے۔

اسی طرح شوال میں دینی مدارس کے آغاز کی مناسبت سے دینی مدارس کی اہمیت،

جون میں عصری تعلیم کے آغاز کی رعایت کرتے ہوئے عصری تعلیم کی اہمیت، الیکشن کے زمانہ میں ووٹ کی شرعی حیثیت، یا ملک میں اور جو مسائل ابھریں، ان مسائل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت، اس طرح کے موضوعات پر اظہارِ خیال سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی دین سے مربوط ہے، دین صرف نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظام ہے، جو مؤمن کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔

☆ ان بیانات کو اختلافی مسائل کے بیان کے لئے استعمال نہ کیا جائے اور نہ امت کے کسی طبقہ کی دل آزاری کی جائے، اگر کسی شخص کو ایسی چیزوں کے بارے میں تحمل نہ ہو اور اظہارِ اختلاف ہی سے اسے تسکین حاصل ہو تو ایسی اختلافی باتوں کو اپنی نجی مجلسوں اور معتقدین کی خصوصی محفلوں کے لئے اٹھا رکھیں اور امت کے وسیع مفاد اور اجتماعیت کے لئے تھوڑی سی اپنی تسکین نفس کی قربانی دیں۔

☆ بعض حضرات جمعہ کے بیان میں ہمیشہ ایک ہی مضمون کو کسی قدر فرق کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں، جیسے اللہ ﷺ کی اطاعت، رسول کی اطاعت، محبتِ رسول ﷺ، اولیاء کا مقام، شرک و بدعت کی مذمت، ان باتوں کی اہمیت سے انکار نہیں اور کبھی کبھی دوسروں کی دل آزاری کے بغیر مثبت انداز پر ان مضامین کو بیان کرنے میں حرج نہیں، لیکن ہمیشہ کے لئے اسی کو اوڑھنا بچھونا بنالینا اور عملی زندگی میں پیش آنے والے سینکڑوں مسائل کو نظر انداز کردینا یقیناً کوئی مفید بات نہیں ہوگی۔

☆ آج کل جماعتیں اور تحریکیں اپنے کام کی مناسبت سے خاص پہلوؤں پر بیان کرتی ہیں، جلسے یا تو سیرتِ نبوی ﷺ کے موضوع پر ہوتے ہیں، یا اصلاحِ معاشرہ کے موضوع پر، اور اصلاحِ معاشرہ کے موضوع کو بھی اتنا محدود کردیا گیا ہے کہ سوائے نکاح کی فضول خرچی کے اور کسی موضوع پر کم ہی گفتگو ہو پاتی ہے، جمعہ کے ان بیانات کو مسلمانوں کی عمومی اصلاح و تربیت کے لئے استعمال کیا جائے اور اسے اختلاف و نزاع سے دور رکھتے ہوئے امت کی

ذہن سازی کا کام لیا جائے، تو اس سے بہت سی برائیاں دور ہوسکتی ہیں، نو جوانوں کا رشتہ دین سے مضبوط ہوسکتا ہے اور کردار وعمل کے اعتبار سے جو زوال وانحطاط اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے جو مغربیت اور بے دینی محسوس کی جارہی ہے اس کا بہت کچھ تدارک ہوسکتا ہے۔

کاش! ائمہ وخطباء امت کی فلاح وصلاح، مسلمانوں کی وحدت کے لئے اور خدا کے حضور سرخروئی اور اس کی رضا اور خوشنودی کو مقدم رکھتے ہوئے جمعہ کے منبروں کو اپنی مسلکی، جماعتی اور تنظیمی وابستگیوں سے آزاد کر کے امت کے وسیع تر مفاد کے لئے استعمال کریں اور اپنے حلقۂ اثر اور حلقۂ ارادت کو مضبوط کرنے کے بجائے آخرت کی سرخروئی کو اپنی کوششوں اور کاوشوں کا لیلائے مقصود بنائیں۔

۱۳/ شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ/۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

ظلم کی مدافعت — ایک اسلامی فریضہ

صدام حسین کی گرفتاری اور گرفتاری کے وقت خود سپردگی نے بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو، جو اس حجاجِ وقت کو اسلام کا سپاہی خیال کرتے تھے، ایک طرح کی مایوسی اور پژمردگی سے دوچار کردیا ہے، حالاں کہ یہ واقعہ چنداں خلاف توقع نہیں تھا، صدام حسین بعث پارٹی کے سرگرم اور پر جوش قائدین میں تھے، جس کی بنیاد ایک دشمن اسلام نے رکھی تھی، اور جس پارٹی کی اسلام دشمنی اور خدا بیزاری آفتابِ نصف النہار سے کم واضح نہیں تھی، پھر انھوں نے انتخاب اور رائے عامہ کے ذریعہ منصبِ صدارت حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ جور وظلم اور سازشوں کے ذریعہ زبردستی عہدۂ صدارت پر متمکن ہوگئے تھے، خلیجی ممالک نے اس حکمتِ عملی کے تحت ان کا تعاون کیا کہ وہ اپنی دفاعی طاقت بڑھائیں اور پورے خلیج کے لئے تحفظ کا ذریعہ بنیں اور اس سمت میں انھوں نے بہتر کوششیں کیں، لیکن افسوس یہ کہ طاقت انھیں ہضم نہ ہوسکی، اور پہلے تو انھوں نے اپنے بڑے پڑوسی مسلمان ملک ایران پر حملہ کیا اور دس سال اس جنگ میں الجھے اور الجھائے رہے، جس میں صرف عراق کے دس لاکھ مسلمان فوجی کام آگئے، ایرانی فوج کی تعداد اس کے علاوہ ہے، اس جنگ نے نہ صرف عراق بلکہ ایران اور سعودی عرب کی معیشت کو بھی بری طرح متاثر کیا اور آج تک یہ ممالک اس جنگ کے معاشی اثرات سے باہر نہیں آسکے۔

پھر جلد ہی اپنے پڑوس کی چھوٹی سے مسلمان عرب مملکت، جس نے برے وقتوں میں عراق کی مدد کی تھی، بے شان وگمان اس پر چڑھ دوڑے، یہاں تک کہ کویت کی سرحد عبور کرکے عراقی فوج سعودی عرب کے سرحدی شہر میں بھی داخل ہوگئی، اس کے نتیجہ میں امریکی افواج کو خلیج میں اترنے اور فوجی اڈے قائم کرنے کا موقع ملا اور کویت میں ایسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے کہ ان کو سن کر بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، بالآخر نہایت ہی ذلت وخواری کے ساتھ کویت سے

نکال باہر کئے گئے ، ان حالات میں اگر صدام حسین نے ایثار سے کام لے کر اقتدار سے سبکدوشی کو قبول کرلیا ہوتا تو عراق کے عوام بھی عالمی پابندی کی مصیبت سے چھٹکارا پاسکتے ،،اور اخیر میں جو امریکہ وعراق جنگ ہوئی اور براہِ راست امریکی فوج عراق پر قابض ہوگئی اس کی بھی نوبت شاید نہیں آتی ، لیکن وہ اب بھی نوشتۂ دیوار کو پڑھنے سے قاصر رہے اور جب امریکی فوج عراق کے مختلف شہروں کو روندتی ہوئی بغداد میں داخل ہوئی تو مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے لئے انھوں نے تہ خانۂ عافیت کا انتخاب کیا اور نہایت ذلت وتحقیر کے ساتھ کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کر لئے گئے ۔

عراق کے بارے میں عرب ملکوں میں یہ بات مشہور ہے کہ یہاں دو ہی شخص نے مستحکم حکومت کی ، ایک حجاج بن یوسف نے اور دسری صدام حسین نے ، کیوں کہ صدام حسین بھی اپنی طبیعت اور مزاج میں حجاج سے کسی طور کم نہیں تھے ، طبع خوں آشام کا حال یہ ہے کہ خود اپنے بہنوئی اور اپنے برادرِ نسبتی کو بھی قتل کیا اور اپنے دو داماد کو بیٹیوں اور نواسوں کی خوشامد کے علی الرغم کتوں سے نوچوادیا ، اس لئے ایسے شخص سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا قلب اعلاء کلمۃ اللہ سے موجزن ہوگا ، خوش فہمی اور خام خیالی ہی کہی جاسکتی ہے ، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان کے وزیر اعظم اور خاص معتمد طارق عزیز نہ صرف عیسائی ہیں ، بلکہ عیسائی کے ایک غالی اور متشدد طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ، کرد اہل سنت مسلمانوں پر انھوں نے جو ستم ڈھایا ہے وہ بھی ساری دنیا کے سامنے ہے ، گویا ان کی زندگی حقیقی معنوں میں **''أشداء علی المسلمین و رحماء بالکفار''** کی تصویر تھی ۔

ان سطور کا مقصد صدام حسین کی مذمت نہیں ؛ کیوں کہ اب وہ تختۂ اقتدار سے اتر کر تختۂ دار کی طرف بڑھ رہے ہیں ، اور جن لوگوں نے ان کے ستونِ اقتدار کو مضبوط کیا تھا ، وہی اب ان کے لئے تختۂ دار بھی آراستہ کر رہے ہیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ عالم اسلام کے قلب عراق میں امریکی فوج کا اترنا اور استعماریت کی ایک نئی مہم کا آغاز کرنا یقیناً باعثِ تشویش بھی ہے اور موقع حسرت وافسوس بھی ، اور اس سلسلہ میں مسلمانانِ عراق جس مزاحمت اور مدافعت کا مظاہرہ

کررہے ہیں وہ قابل تعریف اور لائق صد تحسین ہے اوران کی جرأت فرزانہ اور ہمت مردانہ کو جتنی داد دیجئے کم ہے۔

اسلحہ کی طاقت اور دفاعی ٹکنالوجی کے اعتبار سے مسلمان مغرب سے بہت پیچھے ہیں اور مغربی ممالک نے یہ بات بھی طے کررکھی ہے کہ وہ عالم اسلام کو دفاعی قوت کے اعتبار سے آگے بڑھنے نہیں دیں گے، ظلم کے خلاف مزاحمت اوراس کے لئے سرفروشی وجانبازی کا جذبۂ بے پایاں ہی مسلمانوں کا اصل اثاثہ ہے اور اگر وہ اس متاعِ گرانمایہ سے محروم ہوتے تو موجودہ عالمی حالات میں ان کے لئے اپنی شناخت کو برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا؛ کیوں کہ دنیا میں جتنے مذاہب اس وقت موجود ہیں وہ سب مذہب کی اصل تعلیمات اور خدا کی معرفت سے بہت دور اور اخلاقی اقدار سے آزاد ہو چکے ہیں، اسلام ہی دنیا کا واحد مذہب ہے، جو تاریخی اعتبار سے مکمل طور پر محفوظ بھی ہے اور حق وصداقت کا نقیب اور ترجمان بھی، اور روشنی سے تاریکی کی لڑائی اور سچائی سے جھوٹ کا بغض وعناد یہ ایک دائمی حقیقت ہے اور قرآن مجید نے انبیاء اور ان کی اقوام کے احوال کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے بخوبی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حق کی مخالفت اور سچائی سے مخاصمت باطل کی فطرت میں ہے، اس کے لئے اسباب ومحرکات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے تصادم کی نوبت آئے، ایک دشواری یہ بھی ہے کہ جو گروہ باطل فکر کا حامل ہے اس کے لئے دوسرے باطل گروہوں سے ''لواوردو'' کی بنیاد پر مفاہمت آسان ہوتی ہے، کیوں کہ فکر ونظر کے اختلاف کے باوجود حق اور سچائی سے دور ہونے میں ان کے درمیان باہمی اشتراک ہے، اگر کوئی قوم تین خداؤں کو پوجتی ہوتو وہ تین سو خداؤں کو پوجنے والوں سے صلح کرسکتی ہے، لیکن جو امت حق کی ترجمان ہو وہ فکر کے باب میں باطل سے کوئی مصالحت نہیں کرسکتی اور ایک خدا کی عبادت کرنے والوں کے لئے دو خداؤں کا انکار بھی اس طرح ضروری ہے جس طرح دو سو خداؤں کا، اسی لئے اسلام اور امتِ مسلمہ کے مقابلہ میں ملتِ کافرہ کا اتفاق عین قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔

فلسطین اور عراق کے مسلمان تحسین وآفریں کے مستحق ہیں، انھوں نے وقت کی سب

سے جابر اور ظالم قوتوں کے خلاف اپنی مخاصمت جاری رکھی ہے ؛ کیوں کہ ظلم کی مدافعت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے اور دنیا کے کسی حصہ میں اگر مسلمانوں پر ظلم و جور رَوا رکھا جاتا ہو تو تمام مسلمانوں پر اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق مظلوم بھائیوں کی مدد کرنا واجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ مسلمان پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے (بے یار و مددگار ظالم کے مقابلہ میں) چھوڑ دیتا ہے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں مشغول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں مشغول رہتے ہیں اور جو شخص کسی مسلمان سے ایک مصیبت دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس سے دور کریں گے اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲)

پس ایک مسلمان کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ وہ خود اپنے دامن کو ظلم سے بچائے رکھے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی قدرت اور صلاحیت کے مطابق مظلوم کی مدد کرے اور اس کا دوسرا بھائی جس مصیبت میں مبتلا ہے اسے اس مصیبت سے نجات دلائے، ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ ؓ کو یہ بات عجیب محسوس ہوئی، انھوں نے دریافت کیا کہ ہم مظلوم کی تو مدد کریں گے، لیکن ظالموں کی مدد کیوں کریں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ ان کا ہاتھ تھام لیا جائے، ''تأخذوا فوق يديه'' (بخاری، عن انس ؓ، حدیث نمبر: ۲۴۴۴) کیوں کہ ظالم کا ہاتھ نہ تھاما تو ظلم کی ڈوری دراز سے دراز تر ہوتی جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: لوگ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا

عذاب ان سب کو گرفت میں لے لے، (ترمذی، حدیث نمبر:۲۱۶۸) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اسے رسوا کرسکتا ہے، نہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے اور نہ کسی مصیبت میں جس سے مسلمان دوچار ہوا سے بھلا سکتا ہے۔ (مجمع الزوائد:۱۸۵/۸)

یہ تو دوسرے مسلمانوں کے تئیں تعاون و تناصر کی بات ہے، لیکن اگر خود اس شخص پر ظلم ہو تو اس کے لے بھی جہاں تک ممکن ہو مدافعت کرنی واجب ہے، اسی لئے رسول اللہ انے ارشاد فرمایا: جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنی عزت وآبرو کی حفاظت میں مارا جائے، وہ بھی شہید ہے، فقہاء نے حتی المقدور حفاظتِ جان کی کوشش کو واجب قرار دیا ہے، امام محمدؒ کے قول: ''**فحق علی المسلمین أن یقتلوہ**'' (مسلمانوں پر حق ہے کہ قتل کے لئے حملہ کرنے والوں کو قتل کرڈالیں) پر بحث کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے کہ اس میں حفاظت جان کے لئے مدافعت کے واجب ہونے کی طرف اشارہ ہے، (الهداية مع تكملة الفتح :۲۳۲/۲) اسی طرح عزت وناموس کی حفاظت میں بھرپور اقدام کرنے کو بھی واجب قرار دیا گیا ہے اور اس پر فقہاء کا اتفاق ہے، جیسا کہ علامہ بن تیمیہؒ نے نقل کیا ہے: ''......**فإن لم یندفع إلا بالقتل کان له ذلک باتفاق الفقهاء**'' (الاختيارات الفقهيه :۲۹۱/۱) مال سے مدافعت کو بھی فقہاء نے واجب قرار دیا ہے، لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک یہ جائز ہے، واجب نہیں ''**أما الدفاع عن المال فاغلب الفقهاء یرونه جائزا لا واجبا**'' (التشريع الجنائي الاسلامي :۴۷۶/۱) جن صورتوں میں مدافعت کرنا واجب ہے، ان صورتوں میں اگر کوئی شخص مدافعت نہ کرے اور قتل اور بے عفتی کے لئے خودسپردگی پر راضی ہوجائے تو وہ گنہگار ہوگا؛ اس لئے ظلم کے خلاف مدافعت ایک دینی اور انسانی فریضہ ہے؛ کیوں کہ اگر ایسے لوگ باقی نہ رہیں جو ظالم کے پنجہ کو تھامنے کے لئے کوشاں ہوں تو ظلم پیشہ طبیعتوں پر کوئی خوف باقی نہ رہے، پھر تو ظلم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا، حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ راوی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ :

تم میں سے کوئی ایسی جگہ پر کھڑا نہ رہے، جس میں کسی شخص کو ظلماً قتل

کیا جائے؛ اس لئے کہ جو شخص وہاں ہو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت اترتی ہے؛ اس لئے کہ اس نے اس مظلوم کی طرف سے مدافعت نہیں کی اور تم میں سے کوئی شخص ایسی جگہ کھڑا نہ رہے جہاں کسی مظلوم کو زدوکوب کیا جائے؛ اس لئے کہ اس شخص پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے؛ کیوں کہ اس نے اس کی طرف سے مدافعت نہیں کی۔ (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۵۲۰۰)

ان احادیث کی روشنی میں ان مسلم ممالک کے رویہ کو دیکھا جاسکتا ہے جو فلسطین، بوسنیا اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی حالتِ راز کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے عیش کدوں میں آسودہ خاطر ہوکر بیٹھے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے قتل وخون اور ان کے لہو کی ارزانی کو دیکھ کر نہ ان کے دل میں کوئی ہوک اٹھتی ہے اور نہ ان کے سینوں میں کوئی کسک پیدا ہوتی ہے۔

۹/ ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ/۲/ جنوری ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

حیاء پر بے حیائی کی فتح

کائنات میں قدرت کا نظام یہ ہے کہ جو چیز اہم، نازک، لوگوں کے لئے مرکزِ توجہ اور رغبت کا باعث ہیں، انھیں چھپا کر اور حفاظت کے حصار میں رکھا جاتا ہے اور جو چیزیں نسبتاً کم اہم ہوتی ہیں، یا نازک اور پُر خطر نہیں ہوتیں، ان کے لئے حفاظت اور بچاؤ کا یہ اہتمام بھی نہیں ہوتا، مٹی اور پتھر کھلے عام زمین پر پائے جاتے ہیں، لیکن سونے کے ذرّات پتھر کی تہوں میں چھپا کر رکھے گئے ہیں اور بیش قیمت موتی سیپ کے حصار میں بند ہوتے ہیں، یہ نظام نہ صرف ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات میں کار فرما ہے، بلکہ ہمارے وجود میں بھی یہی نظام جاری وساری ہے، ہاتھ، پاؤں اور جسم کے بہت سے اعضاء بیرونی حصہ میں واقع ہیں، لیکن آبگینۂ چشم پر گھنیری پلکوں کے پہرے ہیں، دل جس پر گردشِ خون کا مدار ہے سینہ و پشت کی ہڈیوں کے بیچ چھپا کر رکھا گیا ہے، دماغ کا حجم کچھ زیادہ نہیں، لیکن یہ جسم کا بادشاہ ہے اور احساس و عمل کی تمام قوتیں ایک وفادار سپاہی کے طرح اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئی ہیں، اسی لئے اسے مضبوط ہڈیوں کے خول میں قلعہ بند کر کے رکھا گیا ہے، کہ دل و دماغ کی لطافت و نظافت اور اس کی اہمیت و قدر و قیمت کا تقاضا یہی تھا۔

انسان سماجی زندگی میں بھی قدم قدم پر اس کو برتنے کا عادی ہے، بیماروں کی دیکھ بھال صحت مندوں سے زیادہ کی جاتی ہے، بوڑھوں کا خیال بہ مقابلہ جوانوں کے کئی چند زیادہ رکھا جاتا ہے، اگر پندرہ سال کا نوجوان سڑک اور بازار کی طرف چلا جائے تو کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی، لیکن اگر تین چار سال کا بچہ اپنے طور پر کہیں نکل جائے اور دو چار گھنٹے گذر جائیں تو گھر میں کہرام مچ جاتا ہے اور تلاش شروع ہو جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بوڑھے، بیمار یا بچے کو کمتری کی نظر سے دیکھا گیا ہے، بلکہ اس میں ان کی محبت اور ان کے تحفظ کا جذبہ کار فرما ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جنس کے اعتبار سے جو دو صنفیں پیدا کی ہیں، مرد اور عورت، ان

میں عورتوں کی لطافت ونزاکت اوران کے تحفظ کی ضرورت ایک واضح حقیقت ہے، اگر کسی کا لڑکا کالج جائے اور چار چھ گھنٹہ دیر سے آئے تو گھبراہٹ نہیں ہوتی، لیکن اگرلڑکی کی واپسی میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی بھی تاخیر ہوتو تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے، اور گھر کے ذمہ دار لوگ تلاش میں سرگرداں ہوجاتے ہیں، اگر کسی نوجوان یا جوان مرد کو حیدرآباد سے دلی جانا ہوتو ماں باپ بہ خوشی روانہ کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ضروری محسوس نہیں کرتے کہ انھیں گھر سے اسٹیشن جا کر چھوڑا جائے، لیکن اگر کوئی نوجوان لڑکی یا جوان عمر خاتون بلکہ ادھیڑ عمر خاتون بھی تنہا سفر کرنا چاہے، تو ذمہ دار اسے اس کی اجازت نہیں دیں گے اور اگر کسی مجبوری کے تحت روانہ کردیں، تو اہتمام سے ٹرین پر سوار کرائیں گے، کسی شریف پڑوسی کو توجہ دلائیں گے، پھر دہلی میں کوئی شناسا ہوتو اس سے خواہش کریں گے کہ وہ دہلی اسٹیشن پر آ کر لے لیں اور بے چینی کے ساتھ اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے منتظر رہیں گے۔

یہ فرق کیوں ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے، عورت صنفِ لطیف ہے، یہ لطافت اسے مرکزِ توجہ بھی بناتی ہے اور نازک بھی اور نزاکت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے تحفظ اور نگہداشت کا سروسامان کیا جائے، غور کیجئے کہ جرائم کے اعداد وشمار میں ایک قابل لحاظ حصہ زنا بالجبر، جنسی ہراسانی اور چھیڑخوانی کا ہے، لیکن ان واقعات میں ہمیشہ عورت ہی مجبور کی جاتی ہے اوراسی کو ہدف بنایا جاتا ہے، شاذ ونادر ہی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہو جسمیں عورت کے بجائے مرد جبر واکراہ کا نشانہ بنتا ہو، ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ایک تو قدرت نے عورت میں جذب و کشش کے محرکات زیادہ رکھے ہیں، دوسرے یہ کہ مرد اپنی حفاظت آپ کرسکتے ہیں، لیکن عورت اپنی نگہداشت کے لئے مرد کی محتاج ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر شریعت نے عورتوں کے لئے حجاب کا قانون رکھا ہے۔

پردہ عورت کے لئے نہ قید ہے نہ اس کی تحقیر اور نہ اس پر بے اعتباری کا اظہار، بلکہ اس کا مقصود عورت کا تحفظ اور اس کی نگہداشت ہے، اگر آپ سفر میں جارہے ہیں تو چادر اور تکیہ اور جوتا اور تولیہ تو یوں ہی رکھ دیں گے، لیکن اگر آپ کے ساتھ سونا ہو، خطیر رقم ہو، یا ہیرے اور موتی

ہوں تو آپ انھیں یوں ہی کھلی جگہ پر ڈال دینا گوارہ نہیں کریں گے، بلکہ ایسی جگہ رکھنا چاہیں گے جس میں اس کے تحفظ کا بھر پور نظم ہو اور اسے لوگوں کی نگاہ سے بچا کر رکھنا چاہیں گے، یہی حال بلکہ اس سے بڑھ کر خواتین کا ہے، کیوں کہ باعزت اور غیرت مند لوگوں کے لئے عزت اور آبرو کی اہمیت مال وزر سے زیادہ ہے، اگر آپ کا نوجوان لڑکا شریکِ سفر ہو اور چند لوگ اس کی طرف نظر گڑا کر دیکھیں تو اس سے کوئی تشویش پیدا نہیں ہوگی، لیکن اگر یہی بات نوجوان لڑکی کے ساتھ پیش آئے تو یقیناً ناگوار گذرے گا، پس یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ بمقابلہ مرد کے عورت کی حفاظت وصیانت اور اس کی عفت وعصمت کی نگہداشت کا خصوصی لحاظ رکھا جائے۔

پردہ کے مسئلہ کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے، مگر افسوس کہ مغربی تہذیب میں پردہ کو عورتوں کے ساتھ ظلم وزیادتی، انحطاط کی علامت اور ترقی میں رکاوٹ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، یہ محض غلط فہمی اور حقیقت ناشناسی ہے، پردہ کا تعلق لباس سے ہے، یعنی ایسا لباس جو جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے، اتنا چست نہ ہو کہ اعضاء کی ساخت نمایاں ہو جائے، سر ڈھکا ہوا ہو، چہرہ بھی اجنبی کے سامنے نہ کھولیں، اور تعلیم کا تعلق انسان کی قوتِ فکریہ اور اس قوت کے استعمال سے ہے، اس لئے لباس سے تعلیم اور ذہنی وفکری ترقی اور پستی کا تعلق نہیں، اسی طرح سماج میں اگر پردہ کی رعایت ملحوظ ہو اور مرد وعورت کے اختلاط کو روکا جائے تو عورتوں کے لے کام کے مواقع بڑھ جائیں گے؛ کیوں کہ پرائمری سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک جب لڑکیوں کے لئے جداگانہ درسگاہیں قائم ہوں گی، خواتین کے لئے علاحدہ عدالتی نظام اور گورنمنٹ کے دفاتر میں الگ کاؤنٹر ہوں گے اور دوکانوں میں خواتین کے لئے الگ گوشہ ہوگا، تو اس سے خواتین کے لئے ملازمت کے زیادہ مواقع بہم پہنچیں گے، اور وہ کسی نفسیاتی دباؤ کے بغیر اپنا کام انجام دے سکیں گی، اس لئے یہ سمجھنا خام خیال ہے کہ پردہ کی وجہ سے خواتین کام کے مواقع سے محروم ہو جائیں گی۔

فرانس میں حجاب کی ممانعت کا جو قانون نافذ ہوا ہے، وہ حیرت انگیز ہے، یہ خلافِ فطرت بھی ہے اور اس دعوئ آزادی کے مغائر بھی جو مغربی ممالک کرتے آئے ہیں، آزادی کا

تقاضا یہ ہے کہ جیسے نیم عریاں لباس پہننے، بلکہ بے لباس رہنے کی اجازت ہے، اسی طرح اگر کوئی پردہ دار لباس اختیار کرنا چاہے تو اس کو بھی اس کی پوری آزادی حاصل ہو، پھر یہ کہ حجاب کی حیثیت عورتوں کے حق میں اسلامی شناخت کی ہے، اب یہ عجیب بات ہے کہ عیسائیوں کو تو اپنی مذہبی شناخت ساتھ رکھنے اور صلیب لٹکانے کی اجازت ہے، لیکن مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کر دیا جائے، مگر یورپ کا سیکولرزم یہی ہے کہ برائی کرنے کی تو آزادی ہے، لیکن برائی سے بچنے کی آزادی نہیں!!

۱۶/ ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ ۹/ جنوری ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

ایک نئے فتنۂ ارتداد کی آہٹ

ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے، جو بینائی سے محروم ہو، اس کے لئے پوری دنیا تاریکی و تیرگی سے عبارت ہے، دن اور رات اور سیاہ وسفید اس کے لئے یکساں ہیں، اگر ایسے شخص سے پوچھا جائے کہ تمہاری خواہش کیا ہے؟ اگر ایسے شخص کے سامنے ایک طرف سیم و زر اور دوسری طرف چھوٹی سے چشم بینا ہوتو وہ کسے ترجیح دے گا؟ یقیناً وہ آنکھ کا اور روشنی کا طلب گار ہوگا، کہ جو شخص آنکھ سے محروم ہو، اس کے لئے سونا اور پھتر دونوں برابر ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اور آنکھ بھی دی ہے، بصیرت وعبرت کی آنکھ، اور اس کو ہدایت اور ایمان کی پتلی سے سجایا ہے، یہ آنکھ چہرہ پر نہیں، بلکہ دل کے اندر رہتی ہے، اس آنکھ سے سونا چاندی اور جھوٹ، حق اور باطل، خالق کی خوشنودی اور ناخوشنودی کو پہچانا اور جانا جاتا ہے، اس ہدایت سے دنیا کی فلاح بھی متعلق ہے اور آخرت کی بھی، اس زندگی کی بھی اور آئندہ زندگی کی بھی، اس لئے انسان کے لئے یہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اس کی زندگی کا گراں قدر اثاثہ ہے۔

ہدایت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہر نماز اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس سورت کا اختتام ہدایت ہی کی دعاء پر ہوتا ہے، ہدایت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے متعلق ہے، یہاں تک کہ یہ پیغمبروں اور رسولوں کے بھی اختیار میں نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کی، حضرت نوح علیہ السلام اپنے صاحبزادے کی، حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیوی کی اور رسولِ اقدس ﷺ اپنے بعض قریبی اعزہ کی ہدایت کے لئے بے چین تھے، کہ وہ ہدایت سے سرفراز ہو جائیں، لیکن ان کے لئے یہ نعمت مقدر نہیں تھی اور وہ اس سے محرومی ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے، یہاں تک کہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، إِنَّكَ لاَ تَهْدِى مَنْ أَحْبَبْتَ۔ (قصص:۵۶)

جیسے اگر انسان صحت مند ہو، تو اس کو مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے کہ وہ ہمیشہ صحت مند ہی

رہے گا، بلکہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے، اسی طرح انسان کو ایمان و ہدایت کے بارے میں بھی مطمئن نہ ہونا چاہیے، قرآن مجید میں ایک مستقل دعا سکھائی گئی ہے: ''رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا'' (آل عمران:۸) ''پروردگار! ہدایت دینے کے بعد پھر ہمیں کج دلی میں مبتلا نہ فرمائیے''۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسی دعائیں سکھائیں، جس میں ایمان اور اسلام پر خاتمہ کا ذکر ہے، جیسے صحت کے بعد بیماری، دولت کے بعد غربت اور آسانی کے بعد تنگی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، اسی طرح ہدایت کے بعد پھر اس سے محرومی ایسی بدنصیبی ہے کہ اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف واپس ہونے کو ارتداد کہتے ہیں اور ارتداد کفر سے بھی بڑھ کر ہے، اگر اسلامی حکومت ہو تو وہاں کفر کو تو گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ارتداد کو نہیں۔

پچھلے دنوں راجستھان سے ارتداد کے واقعہ کی خبر ملی، یہ واقعہ بلکہ سانحہ دلوں کو لرزا دینے والا اور اہل ایمان کو تڑپا دینے والا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے، مسیلمہ اور طلیحہ اسدی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، بنو حنیفہ اور اہل یمامہ کی بہت بڑی تعداد مسیلمہ کذاب کے خیمہ میں چلی گئی، طلیحہ اسدی پر بنو اسد اور بنو طئی اور کچھ دوسرے لوگ ایمان لے آئے، یہ اسلام کے لئے بہت ہی نازک وقت تھا، کیوں کہ ایک طرف یہ مرتدین تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کے باقی رہنے سے انکار کر دیا تھا، یا کم سے کم زکوٰۃ حکومت کے حوالہ کرنے کو تیار نہ تھے، (دیکھئے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۶/۳۱۱ اور اس کے بعد) اس صورتِ حال نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو عموماً اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خصوصاً بے قرار کر دیا اور مسلمانوں کو چو مکھا مقابلہ کرنا پڑا، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ مانعینِ زکوٰۃ کے معاملہ کو ابھی مؤخر رکھا جائے اور پہلے مرتدین سے نمٹا جائے، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیک وقت سبھوں سے مقابلہ کا عزم محکم فرمایا، (حوالۂ سابق) کیوں کہ اگر اس موقع پر کسی گروہ کے ساتھ نرمی اور درگذر کا معاملہ کیا جاتا، تو یکے بعد دیگرے نئے نئے فتنہ وجود میں آتے اور لوگوں کے حوصلے بڑھ

جاتے ، اس موقع سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حمیتِ ایمانی سے معمور تاریخی فقرہ نکلا، جو ہر صاحب ایمان کے لئے آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے: "أالدين ينقص وأبو بكر حي ؟" (کیا ابوبکر کے جیتے جی اللہ کے دین میں کمی کر دی جائے گی؟) یعنی یہ ممکن نہیں کہ ابوبکر زندہ رہے اور خدا کے دین کا کوئی حصہ کم کر دیا جائے ، یہی بے چینی اور بے قراری ہر مسلمان سے، ہر جگہ، ہر زمانہ میں مطلوب ہے۔

ارتداد کا فتنہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ کیا اس لئے کہ اسلام عقل و مشاہدہ اور دلیل و برہان کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ؟ نہیں ، اور ہرگز نہیں ! دلیل کے اعتبار سے اسلام کا مغلوب ہو جانا ممکن نہیں ، اسلام کے تمام عقائد نہایت صاف ستھرے اور واضح ہیں ، دوسرے مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی ، مثال کے طور پر ہندو دھرم ہی کو لے لیجئے ، اس مذہب کی بنیاد بھی اصل میں عقیدۂ توحید ہی پر ہے ، گیتا اور ویدوں میں اس پر بہت سی تصریحات موجود ہیں ، لیکن بعد کے لوگوں نے جو آمیزشیں کی ہیں ، اس کے نتیجہ میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں خدا وجود میں آ گئے ، کوئی پہاڑ کو ہاتھ پر لئے بھاگا جا رہا ہے اور اپنی دُم سے آگ لگائے جا رہا ہے ، کوئی بے لباس گوپیوں کو اپنے جسم کی نمائش پر مجبور کرتا ہے ، کسی کا جسم انسان کا ہے اور سر ہاتھی کا ہے ، کیا عقل اور انسانی شرافت ایسے واقعات کی تصدیق کر سکتی ہے؟ اور کیا کسی مذہب کے بزرگ لوگوں سے ایسی بات کی امید رکھی جا سکتی ہے؟ اس لئے یقیناً یہ بعد میں آنے والے لوگوں کی ملاوٹ اور آمیزش کا نتیجہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیا میں سب سے بڑی تعداد عیسائیوں کی ہے ، عیسائیت کی بنیاد دو عقیدہ پر ہے ، تثلیث اور کفارہ ، تثلیث کا مطلب یہ ہے کہ تین مل کر ایک خدا ہیں ، گویا توحید کا اقرار بھی ہے ، اور تین خداؤں کا اعتقاد بھی ، یہ ایسا کھلا ہوا تضاد ہے ، جسے آج تک عیسائی دنیا حل نہیں کر سکی ، عقیدۂ کفارہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نسل در نسل گناہ منتقل ہوتا آ رہا تھا ، اس لئے نعوذ باللہ ان کے بقول خدا نے اپنے بیٹے کو بطورِ کفارہ قربان ہونے کے لئے بھیجا اور اس طرح وہ اس نسل در نسل آنے والے گناہ کے لئے

کفارہ بن گئے، اب غور کیجئے! کہ نسل در نسل گناہ کی منتقلی اور گناہ ایک شخص کا ہو اور کفارہ دوسرا شخص ادا کرے، یہ کیا عقل میں آنے والی باتیں ہیں؟ اور کیا کسی بھی درجہ میں فطرتِ انسانی سے مطابقت رکھتی ہیں؟

اس لئے اسلام جیسے سادہ، فطرت سے ہم آہنگ اور عقل کے موافق دین کے بارے میں یہ بات سوچی نہیں جاسکتی کہ اسے دلیل وبرہان کی بنیاد پر رد کردیا گیا ہو، بلکہ ارتداد کی اصل وجہ جہالت وناواقفیت، غربت وافلاس، یا ایک درجہ میں خوف ودہشت ہے، لیکن سب سے بڑا سبب جہالت ہے، مسلمانوں نے فاقہ مستیوں کے باوجود ہمیشہ دین پر ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور کبھی پیسوں کے لئے وہ اپنے ایمان کو فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، خوف ودہشت سے بھی مسلمانوں کو کفر کی طرف نہیں لے جایا جاسکتا، اس کی روشن مثال روس کے جابر، کمیونسٹ اقتدار کے دور میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور اس کے باوجود مسلمانوں کی اپنے ایمان وعقیدہ پر ثابت قدمی ہے، اصل سبب ایسی گمراہیوں کا جہالت اور ناواقفیت ہے، کتنے ہی دیہات ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، لیکن مسجدوں کا وجود نہیں، مسلمان بچے اور بچیاں ہیں، لیکن ان کی تعلیم کے لئے مکاتب اور مساجد کا انتظام نہیں، مساجد کے نہ ہونے کی وجہ سے وہاں دینی جماعتوں اور تحریکوں کا گذر نہیں، علماء اور مشائخ کی آمد ورفت نہیں، دوسری طرف ان کی معمولی آبادی غیر مسلم تہذیب وثقافت سے پوری طرح متاثر، یہ صورتِ حال عملی ارتداد سے ایمانی ارتداد تک پہنچا دیتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ شہر کے مسلمان دیہات کے مسلمانوں سے اپنا رشتہ جوڑیں، ان کی دینی اور ماڈی ضروریات کی طرف متوجہ ہوں، شہر میں وسیع وعریض اور پرشکوہ مساجد کی تعمیر پر جو پیسے خرچ کئے جاتے ہیں وہی زائد پیسے دیہاتوں میں مساجد کی تعمیر پر صرف کیا جائے اور ان کی ضرورت کے مطابق چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنائی جائیں، کیوں کہ مسجدوں سے مسلمانوں کے اندر اپنی پہنچان اور شناخت کا احساس پیدا ہوتا ہے، ان ہی مساجد میں مکاتب کا قیام عمل میں آئے اور بچوں کو دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم دی جائے، ضروری نہیں کہ

یہ معلمین علماء وحفاظ ہی ہوں، بلکہ اگر گاؤں ہی کے کسی سمجھ داری آدمی کو چار چھ ماہ تربیت دے کر ناظرہ خواں بنادیا جائے، نماز پڑھنا، اذان دینا، وضواور غسل کرنا اور نکاح پڑھانا، جانور ذبح کرنا وغیرہ سمجھا دیا جائے، تو کافی ہے اور ایسے لوگ کم اجرت پر مہیا ہو جائیں گے اور اس طرح کم سے کم ان کے ایمان کی حفاظت تو ہو ہی جائے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ دیہات کے غریب مسلمانوں پر معاشی پہلو سے توجہ کرنا بھی ضروری ہے، مسلمان کاشتکار ہیں، لیکن انھیں پانی میسر نہیں، اگر ان کے لئے ایک یا چند بورنگ کردی جائے کہ وہ سب مل کر اس سے استفادہ کریں، تو ان کی کاشت بہتر ہوسکتی ہے، دیہات میں لوگوں کو سال بھر مزدوری کے لئے کام نہیں مل پاتا ہے، شہر میں جو مسلمان بلڈر ہیں یا دوسرے کاروبار کرتے ہیں، وہ دیہاتوں سے اپنے غریب بھائیوں کو بحیثیتِ مزدور لائیں اور ان سے کام لیں، یا اگر دیہات کی مسلم آبادی میں کوئی ایسا کاروبار شروع کرسکتے ہوں جس سے لوگوں کو مزدوری کے مواقع مہیا ہوسکتے ہوں تو وہاں کوئی کاروباری یونٹ شروع کریں، تو اس سے خود ان کے کاروبار کو بھی فروغ ہوگا اور ان کے ذریعہ مسلمان غریب بھائیوں کی مدد بھی ہوگی اور اس طرح لوگ انھیں دامِ ارتداد میں پھانس نہیں سکیں گے، اسی طرح اپنی زکوٰۃ وصدقات میں بھی دیہات کے مسلمان بھائیوں کو ملحوظ رکھیں۔

غرض یہ کہ جب تک شہر کے مسلمان دیہات کے مسلمانوں سے رابطہ استوار نہیں کریں گے اور تعلقات کو فروغ نہیں دیں گے اور باہمی فاصلہ اور تہذیبی، دینی اور معاشی خلیج کو کم نہیں کریں گے، انھیں اس فتنہ سے بچانا دشوار ہوگا، اور اگر مسلمان خود اسلام کے داعی بن جائیں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف آنے کی دعوت دیں، تو کوئی انھیں لقمۂ تر نہیں بنا سکے گا، کیوں کہ جو خود داعی ہوا سے دعوت نہیں دی جاتی، کاش ہم حالات کی سنگینی پر غور کریں اور شہادتِ حق کا جو فریضہ ہم سے متعلق ہے، اسے ادا کریں۔

۱۳/محرم الحرام ۱۴۲۴ھ ۵/ مارچ ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

اسلام میں تجارت کی اہمیت

قرآن مجید میں کم سے کم ۳۲ مقامات پر زکوۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے، یا اس کی ترغیب دی گئی ہے اور اسی طرح ۱۶ مواقع پر بطور ترغیب یا مدح کے صدقہ دینے اور دینے والوں کا ذکر آیا ہے، اس کے برخلاف شاید ہی کوئی آیت ہو جس میں زکوۃ اور صدقہ لینے کی ترغیب دی گئی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا منشا یہی ہے کہ مسلمان جائز طریقہ پر اپنے آپ کو اس لائق بنانے کی کوشش کریں کہ وہ خود زکوۃ ادا کریں، وہ صدقہ دینے کے موقف میں ہوں نہ کہ لینے کے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اوپر یعنی دینے والے کے ہاتھ کو نیچے کے ہاتھ یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر قرار دیا ''الید العلیا خیر من الید السفلیٰ''۔

دنیا کے مذاہب میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے جو معتدل اور متوازن تصور مال کے سلسلہ میں اسلام کا ہے، قرآن مجید نے مال کو ''خیر'' (البقرۃ:۲۱۵) اور ''فضل'' (جمعہ:۴) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی اچھی اور بھلی چیز کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو مناسب مقدار میں مال حاصل ہو جائے، انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! میں مال کے لئے مسلمان نہیں ہوا، میں اپنی قلبی رغبت سے مسلمان ہوا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صالح آدمی کے لئے صالح یعنی حلال مال بہت ہی بہتر شئے ہے ''نعم المال الصالح للمرأ الصالح'' (مسند احمد:۱۷۳۰۹) پس اگر حلال طریقہ پر مال حاصل کیا جائے اور صحیح راستہ میں اسے خرچ کیا جائے، تو یہ اسلام میں عین مطلوب ہے؛ کیوں کہ بہت سے حقوق مال ہی سے متعلق ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فقر و محتاجی کے بارے میں فرمایا: یہ ایسی چیز ہے جو بعض دفعہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے یہاں جو اعتدال و توازن تھا، ایک واقعہ سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ایک دن آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھے تھے، لوگوں نے دیکھا

ایک صحت مند، طاقتور نوجوان دوڑ بھاگ میں لگا ہوا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کہنے لگے: اس شخص پر افسوس ہے، کاش! اس کی جوانی اور طاقت اللہ کے راستہ میں صرف ہوتی، حضور ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کہو، اگر یہ اس لئے محنت کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو دستِ سوال پھیلانے سے اور لوگوں کی محتاجی سے بچائے، تو یہ اللہ ہی کے راستہ میں ہے، اسی طرح اگر اس کی دوڑ دھوپ کمزور والدین اور اپنے چھوٹے بچوں کے لئے ہو، تاکہ ان کی ضروریات پوری کرے، تب بھی وہ اللہ ہی کے راستہ میں ہے، ہاں! اگر اس کی یہ جدوجہد اس لئے ہو کہ دوسروں پر فخر کرے اور اپنی دولت مندی کا مظاہرہ کرے، تب اس کی دوڑ دھوپ شیطان کے راستہ میں ہے۔ (احیاء العلوم: ۲/۶۱)

کسبِ معاش کی بہت سی صورتیں ہیں اور جو بھی جائز صورت ہو، اسے اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں؛ لیکن سب سے زیادہ بابرکت ذریعہ تجارت کا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیانتدارانہ تجارت میں اللہ تعالیٰ کی مدد ہے: ''و اعلم أن عون اللّٰه في صالح التجارة '' (طبرانی، عن صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ، مجمع الزوائد: ۴/۶۳) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ حضور ﷺ کی رفاقت سے تھوڑی سی محرومی کو بھی پسند نہیں کرتے، لیکن پھر بھی آپ ﷺ کی موجودگی میں بصرہ کا سفر تجارت کیا اور حضور ﷺ کو بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فراق پسند نہیں تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا۔ (طبرانی عن ام سلمۃ، مجمع الزاوائد: ۴/۶۲)

آپ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور اکثر مہاجرین کا ذریعۂ معاش تجارت ہی تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ چوں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں مشغول رہتے تھے، اس لئے انھیں اس کا موقع کم ملا، تاہم گاہے گاہے انھوں نے بھی تجارت فرمائی ہے، سرخیل فقہاء امام ابوحنیفہؒ بڑے تاجروں میں تھے، راس المحدثین امام بخاریؒ بھی تجارت کیا کرتے تھے اور تجارت پر مال لگایا کرتے تھے، اسی طرح اکثر سلف صالحین کا ذریعۂ معاش تجارت تھا، ان کا یہ مشغلہ اس لئے بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو حکومت اور اہل ثروت کے احسان سے بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے تاجر کے بارے میں فرمایا کہ سچے اور امانت دار تاجر کا حشر قیامت

میں انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، (ترمذی، حدیث نمبر:۱۲۰۹) اسلام سے پہلے عرب میں لوگ تاجروں کے لئے 'سمسار' کا لفظ استعمال کرتے تھے، جس کے معنی ''دلال'' کے ہیں، یہ ایک ناگوار تعبیر سمجھی جاتی تھی، آپ ﷺ نے ان کے لئے ایک مہذب لفظ ''تاجر'' کا اختیار فرمایا اور فرمایا کہ اے جماعتِ تجار! خرید وفروخت میں لغو بات بھی آجاتی ہے، اور قسم کھانے کی نوبت بھی آتی ہے؛ لہٰذا صدقہ کے ذریعہ اس کی تلافی کیا کروگے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۳۲۶) رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے پاکیزہ کمائی کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے ہاتھ کا کام اور صحیح طریقہ پر تجارت ''**عمل الرجل بيده و كل بيع مبرور**''۔ (مسندِ احمد، حدیث نمبر:۱۶۸۱۴)

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام؛ حالاں کہ تاجر بھی اپنا سرمایہ لگاتا ہے اور سود خوار بھی، تاجر بھی اپنے سرمایہ لگانے کی مدت کے لحاظ سے نفع حاصل کرتا ہے، اور سود خوار بھی مہلت کی گویا اجرت حاصل کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا اور اسے بے برکتی کا باعث بتایا اور تجارت کو حلال قرار دیا اور باعثِ برکت بتایا گیا، کیوں کہ تاجر اپنے نفع کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے، اسے نہیں معلوم کہ اس سے نفع ہوگا یا نقصان، نفع ہوگا تو کس قدر؟ اور سود خوار اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنا نفع بہر صورت متعین کرانا چاہتا ہے۔

تجارت کی فضیلت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تاجر اور گاہک کا ربط بہت ہی گہرا ہوتا ہے اور خلیق و دیانت دار تاجر بہت آسانی کے ساتھ گاہک کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں، اس میں مذہب وملت اور قبیلہ وخاندان کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی، انسانی فطرت یہ ہے کہ جہاں ارزاں اور سستا سودا ملے، انسان اسی دکان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، خواہ دوست کی ہو یا دشمن کی اور اپنوں کی ہو یا بیگانوں کی؛ اس لئے ایک خداترس اور فہیم تاجر اپنی تجارت کو اسلام کی دعوت و اشاعت کا بہترین وسیلہ بنا سکتا ہے، اور دنیا کی تجارت کے ساتھ ساتھ آخرت کی ''تجارتِ ربح'' کو بھی انجام دے سکتا ہے؛ بشرطیکہ تجارت میں راست گوئی، دیانت داری اور خداترسی کی راہ

اختیار کی جائے اور جو تجارت جھوٹ اور دھوکہ سے آلودہ ہو، وہ تجارت کو بے برکت اور بے فیض بنادیتی ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قسم کھا کر سامان تو بیچا جاسکتا ہے، لیکن اس سے برکت ختم ہوجاتی ہے ''منفقة للسلعة ممحقة للبركة''۔ (بخاری:۲۰۸۷)

اسلامی تاریخ میں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں، کہ محض تاجروں کے ذریعہ ایک پورے علاقہ اور وسیع خطہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی خدمت پائی، خاص کر مشرقی ایشیا اور افریقی ممالک میں زیادہ تر مسلمان اور عرب تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی، انڈونیشیا میں اسلام کے ابتدائی دور میں جزیرہ سوماترا پر عرب تجار اترے اور پھر خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں عرب تاجروں نے جزائرِ انڈونیشیا کو اپنی دعوتی کوششوں کا خاص مرکز بنایا، فلپائن میں عرب تجار قیام پذیر ہوئے اور ان ہی کی نسلوں سے اسلام پھیلا، ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہلی صدی سے چوتھی صدی تک عرب تاجروں کی دعوتِ اسلام کی کوششیں بار آور ہوتی رہیں، سری لنکا میں بھی پہلی صدی ہجری میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام پہنچا، چھٹی صدی ہجری میں برما عرب تجار کے ذریعہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا، اور ملیشیا کے مسلمان تاجروں کے ذریعہ پہلی سے چوتھی صدی ہجری تک برونائی میں اسلام کی اشاعت ہوئی، جو اس وقت صد فیصد مسلم ملک ہے، کمبوڈیا میں نویں صدی ہجری میں اور سنگاپور میں ابتدائی صدیوں میں تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام پہنچا، عرب تاجروں ہی کے ذریعہ پہلی صدی ہجری میں ہانگ کانگ اور تیسری صدی ہجری میں جنوبی کوریا میں اسلام کا چراغ روشن ہوا، اسی طرح چین کے ساحلی علاقوں میں بھی مسلمان تاجر ہی اسلام کی امانت لے کر پہنچے۔

افریقہ میں عرب سے قریبی علاقوں میں تو مجاہدین اور علماء کی کوششیں ہوئیں، لیکن دور دراز علاقوں تک دعوتِ اسلام کے پہنچنے کا ذریعہ تجار ہی بنے، تنزانیہ میں پہلی صدی ہجری اور نائیجریا کے شمالی علاقوں میں دوسری صدی ہجری میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی، موریطانیا میں بربر کے تازہ دَم نومسلم تجار نے اشاعتِ اسلام کا فریضہ ادا کیا، مزنبیق میں ابتدائی صدیوں ہی میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام پہنچا اور بارہویں صدی

ہجری کے بعد پوری قوت سے اسلام کی اشاعت ہوئی، سوڈانی مسلمان تجار وسطی افریقہ میں بارہویں صدی ہجری میں اسلام کی امانت لے کر پہنچے، انگولا میں اس وقت پچیس فیصد مسلمان ہیں، اور یہ مسلمان تاجروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، بنوامیہ کے عہد میں عرب تجار اور مراکشی مسلمان سینگال میں خیمہ زن ہوئے اور ان کے ذریعہ وہاں اسلام کی بادِ نسیم چلی، بحر ہند کے جزائر قمر میں چوتھی صدی ہجری میں عرب تاجر دین اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنے، اسی طرح مغربی افریقہ کے مختلف ممالک میں تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی عالمتاب کرنیں ضیاء بار ہوئیں۔ (ملخص از: انتشار الاسلام فی العالم، حصہ اول، تالیف: ڈاکٹر عبداللہ مبشر طرازی)

صرف ایشیا اور افریقہ ہی نہیں، بلکہ یوروپ کے بہت سے علاقوں تک بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت تاجروں کے ذریعہ سرانجام پائی، اگر آج بھی مسلمان تجار دعوتی شعور سے ہمکنار ہوں، تو وہ متاعِ دنیا کے ساتھ ساتھ متاعِ آخرت کے تاجر بھی بن سکتے ہیں، اور کفر کی تاریکیوں میں اسلام کا چراغ جلا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان کے لئے پیشۂ تجارت کو اختیار کرنا، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، کیوں کہ تعصّبات کی گھٹاؤں نے مسلمانوں کے لئے معیشت کے مواقع کو تاریک تر کر دیا ہے، ملازمتوں میں ان کا تناسب اس طرح ہے :

درجۂ اوّل کی ملازمت	:	۶۱،۱ر فیصد
درجۂ دوم کی ملازمت	:	۳ر فیصد
درجۂ سوم کی ملازمت	:	۴۱،۴ر فیصد
درجۂ چہارم کی ملازمت	:	۱۲،۵ر فیصد

اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، کہ درجہ چہارم کی ملازمت، کہ جس میں کوئی خاص لیاقت وصلاحیت مطلوب نہیں ہے، اس میں بھی مسلمان ملازمت سے محروم ہیں، صنعت اور کارخانوں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی کم ہے، ایک تو وہ اتنے سرمایہ لگانے کے متحمل نہیں ہوتے، دوسرے انھیں

لائسنس اور سرکاری رعایتیں حاصل کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتی ہیں، اس لئے ان کے سامنے نسبتاً آسان راستہ تجارت ہی کا رہ جاتا ہے، گو مسلمانوں کی تجارت پر بھی موقع بہ موقع فرقہ پرستوں کا قہر ٹوٹتا رہتا ہے اور عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات کا ہدف ان ہی شہروں کو بنایا جاتا ہے جہاں مسلمان تجارتی اعتبار سے کسی قدر بہتر حالت میں ہوں، جمشید پور، بھاگلپور، مرادآباد، راوڑ کیلا، مالیگاؤں، بھیونڈی، سورت اور اخیر میں گجرات کا شرمناک قتل عام، یہ سب اس کی کھلی مثالیں ہیں، لیکن اس کے باوجود نسبتاً یہی راہ ان کے اپنے اختیار اور قدرت میں ہیں اور اب ایک بہتر رجحان مسلمان آبادی کے ارتکاز اور اجتماعی رہائش کا پیدا ہو رہا ہے، ان سے اس علاقوں میں زیادہ محفوظ طریقہ پر تجارت کی جا سکتی ہے۔

پوری قوم اگر تجارت میں نمایاں مقام حاصل کر لے، تو ملک اور سماج میں اس کو ایک اخلاقی طاقت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ پریشر ڈالنے کے موقف میں آجاتی ہے، امریکہ میں یہودیوں کی آبادی ڈھائی تین فیصد اور یوروپ میں اس سے بھی کم ہے، ہندوستان میں برہمن آبادی کا تناسب بھی اسی کے آس پاس ہے، لیکن مغرب کی سیاست پر یہودیوں کا اور ہندوستان کی سیاست پر برہمنوں کا جو اثر ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں، انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ میں چینی نسل کے لوگ اقلیت میں ہیں، لیکن تجارت سے وابستگی کی وجہ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں، جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب محض ڈیڑھ فیصد ہے، لیکن گجراتی مسلمانوں کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں وہاں ایک باعزت مقام حاصل ہے، ہندوستان میں مسلمانوں نے اس طرف کما حقہ توجہ نہیں دی ہے، بلکہ ایک زمانہ تک وہ زمینداری کے نشہ میں ایسے مدہوش رہے کہ تجارت انھیں ایک حقیر پیشہ نظر آتا تھا، مثلاً دکن اسٹیٹ حیدرآباد میں ۱۹۴۸ء تک مسلمان برسر اقتدار رہے، لیکن حضور نظام کے دَور میں مسلمانوں کی پوری توجہ ملازمتوں کے حصول پر رہی، گو ملازمت میں بھی ہندوؤں کا تناسب زیادہ تھا، جو نظام کی رَواداری کی واضح مثال ہے، لیکن تجارت پر تو برادرانِ وطن ہی کا قبضہ تھا اور مسلمان اس وقت بھی اس میں پیچھے ہی تھے، یہ بہت ہی نقصان دہ رجحان تھا اور اس رجحان کو بدلنے کی ضرورت ہے،

مسلمانوں کے ذوقِ تجارت کا یہ حال تھا کہ وہ صحرائے عرب سے نکل کر ایشیاء کے مشرقِ بعید علاقوں اور افریقہ کے کم آباد دور دراز جزیروں تک بلکہ یوروپ کے بہت سے علاقوں تک تجارتی مقصد کے تحت سفر کیا اور سمندر کا سفر اس زمانہ میں نہایت غیر محفوظ ہونے کے باوجود ہزاروں میل کا سمندری سفر کشتیوں پر طے کرتے تھے۔

اس لئے تجارت رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے اور سلفِ صالحین کا خاص ذریعۂ معاش بھی، رزق میں برکت کا ذریعہ بھی ہے اور اسلام کی دعوت و اشاعت کا وسیلہ بھی اور اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی معاشی سطح کو اوپر اٹھانے اور اقتصادی مشکلات کو حل کرنے کا تیر بہدف نسخہ بھی۔

۲۰/محرم الحرام ۱۴۲۴ھ/۱۲/ مارچ ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

اراضی پر ناجائز قبضہ

غور کیجئے تو کائنات میں انسان کا تمام اشیاء سے بڑھ کر زمین سے تعلق ہے، وہ خود زمین سے پیدا کیا گیا ہے، (الانعام:۲) یہی زمین میں اس کے لئے بستر استراحت ہے، ''جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشاً'' (البقرۃ:۲۲) اسی زمین میں موت تک اس کا قیام ہے، ''وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِيْنٍ'' (البقرۃ:۳۶) خدا نے اس متواضع اور بچھی ہوئی زمین کو بلند و بالا اور سر پر سایہ فگن آسمان سے بھی پہلے پیدا فرمایا ہے، (البقرۃ:۲۹) قرآن مجید میں زمین کی قسم کھائی گئی ہے (طارق:۱۲) زمین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مختلف عنوان سے ۴۶۱ بار زمین کا ذکر کیا ہے، شاید ہی مخلوقاتِ عالم میں کسی کا اس تکرار اور کثرت کے ساتھ ذکر ہو، پھر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تمام ضرورتوں کو زمین ہی سے متعلق رکھا ہے، اسی زمین سے درخت اگتے ہیں، پودے پنپتے ہیں، پھل پھول اور نوع بنوع غذائیں پیدا ہوتی ہیں، دلوں کو لبھانے اور آنکھوں کو بھانے والے خوب صورت گل بوٹے اور مشام جان کو عطر بیز کرنے والے خوشبودار بہار بر دوش پھول اور پتے وجود میں آتے ہیں۔

اسی زمین نے اپنے سینہ میں دودھ سے بھی زیادہ قیمتی پانی چھپا رکھا ہے، جو ہماری تشنہ کامی کا مداوا ہے، سونا، چاندی، لوہا، تانبا، رنگ برنگ پتھر، بہتا ہوا پٹرول اور توانائی سے بھرپور گیس اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہیں جس کو زمین نے نہایت صبر وضبط کے ساتھ اپنے اندر چھپا رکھا ہے، دولت مند ہے لیکن نشۂ دولت سے خالی، وسیع و عریض ہے لیکن کبر و ترفع سے عاری، ہر وقت انسان کے قدموں میں بچھی ہوئی اور ہمہ دم اس کی خدمت کے لے تیار و مستعد، پھر آخر انسان کو واپس بھی اسی مٹی میں جانا ہے اور قیامت تک اسی کی آغوش میں وقت کاٹنا ہے، پھر اسی کے آغوش سے باہر نکل کر عالم آخرت تک پہنچنا ہے، پیدائش سے موت اور موت سے پھر

دوسری زندگی تک یہی مٹی غم جاناں اورغم دوراں میں ساتھ دیتی ہے۔

غرض زمین اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ایک شاہکار ہے، اسی لئے زمین کی محبت اور حرص بھی انسان کے اندر نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے، کبھی یہ محبت حب الوطنی سے بڑھ کر وطن پرستی تک جا پہنچتی ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا ہے :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

اور اسی وطن پرستی نے عالم اسلام کو پارہ پارہ اور بے اثر کر کے رکھ دیا ہے، کبھی سماج میں زمین کی یہ محبت حرص وہوس کی طرف لے جاتی ہے اور زمین پر ناجائز قبضہ اور ناجائز خرید و فروخت تک منتج ہوتی ہے، چنانچہ آج کل اخبارات میں آئے دن قتل وخون کی جو خبریں آتی ہیں، وہ زیادہ تر زمین ہی کے مسئلہ سے جڑی ہوتی ہیں، ہندوستان میں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تمام بڑے شہروں میں زمین کی ناجائز خرید وفروخت کا بازار گرم ہے، بعض بھولے بھالے خریدار تو اپنی زمین کا منھ بھی نہیں دیکھ پاتے ہیں، بعض لوگ زمین خرید کر پلاٹ چھوڑ دیتے ہیں اور جب سال دوسال کے بعد آتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ ان کی زمین پر مکان بنا ہوا ہے، مگر یہ مکان کسی مخلص و ہمدرد کی طرف سے ان کے لئے ''تحفۂ غیر مترقبہ'' نہیں ہوتا، بلکہ اس شخص کا مکان ہوتا ہے جس کے ہاتھوں دوبارہ زمین فروخت کی جاتی ہے، پہلے اور دوسرے خریدار کے درمیان نزاع چھڑ جاتی ہے اور اصل فروخت کرنے والا منظر سے غائب ہو جاتا ہے، بعض جگہ تو تعمیر شدہ مکان پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا ہے، زمین بھی گئی، پیسے بھی اور محنت بھی۔

یہ صورتِ حال ہر شریف انسان کے لئے تکلیف دہ ہے اور یہ رجحان بغیر محنت کے بیٹھ کر کھانے اور کم سے کم وقت زیادہ سے زیادہ کمانے کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے، آخر یہ سینہ زوری کبھی قتل وقتال کا باعث بن جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ زمین پر قبضہ ہو، زمین خود اس کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ ظلم وزیادتی کے اس کاروبار میں مذہب وملت اور عقیدہ ومسلک کا بھی کوئی فرق نہیں ہے، اور یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ غنڈوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ اس پیشہ میں گھسے ہوئے خدا ناترس افراد پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

غصب اور ظلماً کسی کی چیز پر قبضہ کر لینے کی قرآن وحدیث میں جو مذمت آئی ہے، وہ محتاج اظہار نہیں، جو شخص حرام کھاتا ہے، بارگاہِ ربانی میں اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی، نہ اس کی دعاء مقبول ہوتی ہے، لیکن زمین کے غصب کرنے کی آپ ﷺ نے خاص طور پر مذمت فرمائی ہے، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من ظلم من الأرض شيئا طوّقه من سبع أرضين .

(بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۵۲)

جس نے زمین کا کوئی حصہ ظلماً لے لیا، ساتوں زمینیں اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈالی جائیں گے۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اگر ایک بالشت زمین بھی ظلماً حاصل کی تو زمین کی سات تہیں اس کے گلے کا طوق بنادی جائیں گی، (مسلم، حدیث نمبر: ۱۶۱۲) اس مضمون کی روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں منقول ہے۔

(دیکھئے: ترمذی، حدیث نمبر: ۱۴۱۸، دارمی، حدیث نمبر: ۲۶۰۹)

ایک روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے ایک بالشت زمین بھی کسی کی ہڑپ کر لی اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مکلّف کریں گے کہ وہ اس زمین کو حاضر کرے، یہاں تک کہ اس کی سات تہیں قیامت کے دن اس کے گلے کا طوق بنادی جائیں گی، تا آں کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۵۳۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من أخذ من الأرض شيئا بغير حقه خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين . (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۵۴)

جس نے کچھ بھی زمین ناحق لے لی، وہ قیامت کے دن سات تہوں تک اس میں دھنسایا جائے گا۔

ان احادیث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زمین پر ناجائز قبضہ کتنا شدید گناہ ہے اور کسی بھی طرح ایک مسلمان بلکہ شریف انسان کے شایانِ شان نہیں، یہ رویہ نہ مسلمانوں کے ساتھ

درست ہے اور نہ غیر مسلموں کے ساتھ، افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ ظاہری دین داری کے ساتھ اس طرح کا تکلیف دہ رویہ اختیار کرتے ہیں، شکل وصورت، وضع قطع اور بات چیت سے پکے دیندار ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور لوگ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، چاہے وہ لوگوں کو دھوکہ دے دیں، لیکن یقیناً خدا کو اور اپنے ضمیر کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

ہندوستان میں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے، زمینیں ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں، زیورِ تعلیم سے وہ خالی و عاری ہیں، تجارت کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے، اس فاقہ مستی کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست عناصر کا پھیلایا ہوا زہراب معصوم دیہاتیوں کے ذہن کو بھی متاثر کر رہا ہے اور کوئی حساس موقع ہو تو جان اور عزت و آبرو کو بھی خطرہ دامن گیر ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض دیہاتوں میں ایسا بھی ہوا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم عبادت گاہوں میں جانے اور پوجا کرنے پر مجبور کیا گیا، ان دشواریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے دیہات کے غریب، افسردہ حال مسلمان اس بات پر مجبور ہیں کہ شہر کا رخ کریں اور شہر کے مضافات میں فروکش ہوں۔

عام طور پر یہ شہر کے کنارے ایسی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں جو بلدی سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں، تنگ اور کچے راستے، نہ برقی نہ ڈرینج اور کہیں کہیں پانی بھی نہیں، گاڑھا پسینہ بہا کر اور تھوڑے تھوڑے کر کے کتنی قسطوں میں قیمت ادا ہو پاتی ہے، لیکن افسوس کہ بہت سے خدا ناترس لوگ ایسے غریب بھائیوں کی بھی جاں بخشنے کو تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ آخری قطرۂ خون بھی ان سے نچوڑ لیں، گویا انھوں نے زمین کے ساتھ ساتھ اپنا ضمیر بھی فروخت کر دیا ہو، کاش! ہمارے یہ بھائی انصارِ مدینہ کے اسوہ کو سامنے رکھتے، جنھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے خود اپنی زمین کے دو حصے کر دیئے تھے، آدھا خود رکھا تھا اور آدھا مہاجر بھائی کو دے دیا تھا، اگر ہم ایسی قربانی پیش نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کے ساتھ ظلم و زیادتی اور لوٹ و غارت گری کا رویہ تو اختیار نہیں کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس تجارت میں سارے لوگ ایسے نہیں ہیں اور ایماندار اور دیانت

دار لوگوں سے یہ پیشہ خالی نہیں ہوا ہے، اگر ایمانداری اور دیانت کے ساتھ غریبوں کو راحت پہنچانے اور بے گھروں کو سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنے کی نیت سے پلاٹنگ کی جائے اور مناسب قیمت پر دیانت داری کے ساتھ فروخت کیا جائے، تو ان شاء اللہ یہی تجارت آخرت کے لئے بھی نفع خیز تجارت ہو جائے گی اور اپنے غریب مسلمان بھائیوں کو بسانے اور مفلوک الحال انسانوں کے کام آنے کا اجر بھی ان کے حصہ میں آئے گا۔

کسی سماج میں برائی کو اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا جب تک برائی پر ٹوکنے والی زبانیں، اس کو روکنے والے ہاتھ اور اس کو برا سمجھنے والے دل موجود نہ ہوں، جیسے ایک چور (جس کی چوری کا راز کھل گیا ہو) شرمندگی کا احساس کرتا ہے اور سماج کے دامن کو اپنے لئے تنگ محسوس کرنے لگتا ہے، اسی طرح زمین کے ناجائز قابضین کو روکنے والے ہاتھ ہوں، انھیں ٹوکنے والی زبان ہو، انھیں لوگ برا سمجھتے ہوں، اور وہ محسوس کرتا ہو کہ اس حرکت سے میں سماج کی تحقیر و ناپسندیدگی کا خریدار بن جاؤں گا، تو یہ خوف اسے گناہ سے باز رکھ سکتا ہے، ورنہ اس کے جرم میں بالواسطہ پورا سماج شریک ہے، ضرورت ہے کہ مسجد کے منبروں سے، جلسوں کے شہ نشینوں سے، جماعتوں اور تحریکوں کے اجتماعات سے اور اخبارات و جرائد کے صفحات سے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھے اور اسے روکنے کی کوشش کی جائے اور اس تجارت کو صحیح طریقہ پر اور جائز حدود میں کرنے کی ترغیب دی جائے، تو یقیناً یہ قوم کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

۲۷/محرم الحرام ۱۴۲۴ھ، ۱۹/ مارچ ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

ماہ صفر اور اوہام پرستی — اسلامی نقطۂ نظر

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''توحید'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے، خدا کا کوئی کنبہ اور خاندان نہیں اور نہ اس کے لئے اولاد اور اعزہ واقارب ہیں، اور خدا اپنی صفات اور اختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا و بے مثال ہے، حیات وموت کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، رزق میں وسعت اور تنگی بڑھاتا ہے اور رزق سے محروم کرتا ہے، وہی نفع پہنچاتا ہے اور وہی نقصان سے دوچار کرتا ہے، کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست اسی کے حکم سے وابستہ ہے، توحید کا یہ تصور در در سر جھکانے سے انسان کو بچاتا ہے، اور بہت سی غلامیوں سے نجات عطا کرتا ہے، ان ہی میں ایک توہمات کی غلامی ہے۔

اوہام پرستی بھی ایک طرح کی غلامی ہے کہ آدمی اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والی چیزوں سے بھی ڈرنے اور خوف کھانے لگے اور اس سے اپنے نفع ونقصان کو وابستہ کرلے، اگر سامنے سے کوئی جانور نکل جائے تو آدمی سمجھے کہ یہ سفر ناکام ہوگا، گھر پر کوئی پرندہ بیٹھ جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ سمجھنے لگے، کسی خاص پتھر کی انگوٹھی سے کامیابی اور نفع کی امید رکھے، کسی مہینہ، دن اور گھڑی کو نامبارک، منحوس اور ''اشبہ'' تصور کرنے لگے، یہ سب توہمات کی غلامی ہے، جو شخص عقیدۂ توحید سے محروم ہو اور خدا پر اس کا یقین کامل نہ ہو، مشکل ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے، یہی وجہ ہے ایسے ترقی یافتہ ممالک جہاں صد فیصد تعلیم یافتہ لوگ پائے جاتے ہیں وہاں بھی لوگ بعض اعداد کو منحوس سمجھتے ہیں، ہوٹلوں میں اس نمبر کے روم نہیں رکھے جاتے۔

جو شخص توحید پر جتنا یقین رکھتا ہے اور اللہ پر جس کا جتنا زیادہ ایمان ہو، وہ اوہام پرستی کی اس مصیبت سے آزاد اور توہمات کا اسیر بننے سے محفوظ رہے گا، اسلام کی آمد سے پہلے عربوں میں اس طرح کے توہمات پائے جاتے تھے، لوگ سفر کے لئے نکلتے، پرندے کو اڑایا جاتا، اگر وہ دائیں

جانب اڑتا، تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے ، اور اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بد فالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے ، اسی طرح اُلو کو منحوس پرندہ خیال کرتے ، کسی کے گھر پر بیٹھ جاتا تو سمجھتے کہ یہ گھر اجڑ جائے گا ، صفر کے مہینہ کو نامبارک سمجھتے ، سمجھتے کہ اس ماہ میں جو کاروبار ہوگا نقصان سے دوچار ہوگا ، جو سفر ہوگا وہ نامراد ہوگا ، جو شادی ہوگی وہ ناکام ہوگی ، رسول اللہ ﷺ نے ان تصورات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا: ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں ۔ (بخاری: باب الجذام)

دوسرے کو بیماری لگنے ، پرندہ سے بدفالی ، الو اور ماہ صفر کو منحوس سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں ، عربوں میں اور ایک خیال یہ تھا کہ صحراء میں کچھ شیاطین ہوتے ہیں ، جو رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور راہ گیروں کو راستہ سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں ، عرب انھیں ''غول'' کہا کرتے تھے ، رسول اللہ ﷺ نے اس تصور کی بھی نفی فرمائی (فتح الباری: ۱/ ۱۶۷) ——— عرب شوال کے مہینے کو بھی نامبارک اور شادی بیاہ کے لئے ناموزں تصور کرتے تھے ، رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شوال میں نکاح فرمایا اور شوال ہی میں رخصتی بھی ہوئی ، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس خام خیالی کی تردید کرتے ہوئے فرمائی تھیں کہ میرے نکاح سے زیادہ بابرکت نکاح کون سا ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر جس قدر ایمان ہوگا ، اوہام پرستی سے انسان اسی قدر دور رہے گا ، اسلام نے توحید کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں ایسا راسخ کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کے تصور کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے ، حضرت زنیرۃ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں ، ایمان لائیں ، لوگوں نے اتنا ظلم کیا کہ آنکھ کی بینائی جاتی رہی ، لوگ کہنے لگے کہ دیویوں ، دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے اور ان کا انکار کرنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئی ہے ، ہمارے زمانہ میں عورتیں تو کیا مرد بھی اور جاہل واَن پڑھ تو کیا پڑھے لکھے بھی ایسے موقعوں پر گرفتار اوہام ہو جاتے ہیں ، لیکن حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا کی فکر میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا کہ ان کی صرف بصارت اللہ نے لی تھی ، وہ ایمان اور ایمانی بصیرت سے محروم نہیں ہوئی تھیں ، حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ یہ سب اللہ کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہے ، رسول اللہ ﷺ ان کی استقامت اور ثابت

قدمی سے بہت خوش ہوئے اوران کے لئے دعا فرمائی، چنانچہ پھران کی بصارت لوٹ آئی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر کی معیشت کا مدار دریائے نیل پر تھا، یہاں معمول تھا کہ یہ دریا جب خشک ہوجاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی بلاخیز موجیں اُٹھتیں اوراسے موت کی نیند سلانے کے بعد جاری ہوجاتیں، جب مصر کے خلافت اسلامیہ کے زیرنگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنر مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے اولاً تو انکار کیا، پھر لوگوں کے اصرار پر مشورہ کے لئے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کو خط لکھا، حضرت عمرؓ نے اپنے جواب کے ساتھ ایک اور تحریر دریائے نیل کے نام لکھا اور ہدایت دی کہ اس تحریر کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، حضرت عمرؓ نے اپنی اس تحریر میں دریا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ تو جاری ہوجائے اور اگر اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں، حسب ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی اور دریائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو ہفتہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہوگیا، (البدایہ والنہایہ: ۷/۱۰۰) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں پیش آیا، جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے کہ یہاں کے لوگ کافر تھے، یہاں ہر ماہ ایک شیطان سمندر کے کنارے ظاہر ہوتا، لوگوں نے سمندر کے کنارے ایک بت خانہ بنادیا تھا، جو ''بدخانہ'' کہلاتا تھا، جو دن شیطان کی آمد کا ہوتا، لوگ اس دن ایک کنواری لڑکی کو سنوار کر اس بدخانہ میں بیٹھا دیتے، رات میں وہیں چھوڑ دیتے، جب صبح کو آتے تو اسے اس حال میں پاتے کہ وہ مردہ ہوتی اور کنواری نہ ہوتی، اتفاق سے یہاں ایک مغربی تاجر ابوالبرکات بربری جو حافظ قرآن تھے، آئے ہوئے تھے، وہ ایک بوڑھی خاتون کے مہمان تھے، ایک دن جب اپنے میزبان کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ خلافِ معمول وہ بوڑھی خاتون بہت سی عورتوں کے ساتھ مصروفِ گریۂ وبکا ہے، ایک ترجمان کے واسطہ سے صورتِ حال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ شیطان سے بچاؤ کے لئے اس کی اکلوتی بیٹی کے نام قرعۂ فال نکلا ہے۔

شیخ ابوالبرکات کو داڑھی نہ تھی ، انھوں نے پیشکش کی کہ آج اس لڑکی کی جگہ وہ جائیں گے ، چنانچہ وہ بدخانہ میں بیٹھ گئے اور قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا ، اسی طرح پوری رات گذری ، جب معمول کے مطابق لوگ صبح میں تحقیق حال کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ وہ زندہ و سلامت ہیں ، اور تلاوت میں مصروف ہیں ، یہ خبر شدہ شدہ پورے علاقہ میں پھیل گئی اور علاقے کے راجہ تک اطلاع پہنچی ، ابن بطوطہ نے اس کا نام '' شنوازہ '' لکھا ہے ، عجب نہیں کہ یہ '' وشنوراجہ '' کی بدلی ہوئی صورت ہو ، شیخ نے راجہ پر بھی اسلام پیش کیا ، اس نے کہا کہ آئندہ ماہ تک میرے پاس رہو ، اگر آئندہ مہینہ میں بھی تم یہی عمل کر کے دکھاؤ اور ہم لوگوں کو اس شیطان کی ابتلاء سے بچا سکو ، تب ہم ایمان لے آئیں گے ۔

اگلے ماہ بھی یہی واقعہ پیش آیا ، چنانچہ راجہ مسلمان ہو گیا اور راجہ کے ساتھ رعایا کے اکثر لوگ بھی مسلمان ہو گئے ۔ (رحلۃ ابن بطوطہ: ۱/ ۹۰-۵۸۹)

اگر ایمان قوی ہو اور اللہ سے نفع و نقصان کا سچا یقین ہو تو ایک جاہل اور اَن پڑھ شخص بھی ایسے اوہام و خرافات میں مبتلا نہیں ہو سکتا ، تیمور لنگ کوئی عالم و فاضل حکمراں نہیں تھا ، لیکن جب اس نے دریائے جمنا کو عبور کرنا چاہا تو جیوتشیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ منحوس گھڑی ہے ، تیمور نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہم ارباب تنزیہ و توحید ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے ، یہ تو مشرکین اور تثلیث پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے اور اگر ایمان میں ناپختگی اور یقین میں کمزوری ہو تو اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی ایسی چیزوں کا شکار ہو سکتے ہیں ۔

اس ملک میں رہتے ہوئے جہاں ہم نے برادرانِ وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسوم و روایات میں ہندو معاشرت کا اثر قبول کیا ، وہیں فکر و عقیدہ کے باب میں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ، ان ہی میں سے ایک اوہام پرستی کا مزاج و مذاق ہے ، آج مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ بلی راستہ کاٹ دے تو سفر ملتوی کر دینا چاہئے ، الو کا بیٹھنا نحس کی علامت ہے ، اگر کسی بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کو منحوس تصور کیا جاتا ہے ، گھر کی تعمیر شروع ہو تو ناریل پھوڑے جاتے ہیں ، گاڑی خریدی جائے

تو چند لیموں لٹکائے جاتے ہیں، اور اب ایک نئی بات گھر کی تعمیر میں ''واستو'' کی شروع ہوئی ہے، پنڈت بتاتا ہے کہ گھر کو کس ڈیزائن کا ہونا چاہئے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی میں بے برکتی ہوگی اور نقصان اٹھانا پڑے گا، حالاں کہ شرعاً ایک مسلمان کے لئے صرف یہ رعایت ضروری ہے کہ بیت الخلاء کی نشست میں اس کے علاوہ انجینئر سے مشورہ کرنا چاہئے کہ مکان کس طرح کا ہو، کہ ہوا اور روشنی پوری طرح بہم پہنچے، لیکن اس کا مشورہ بھی پنڈتوں سے کیا جاتا ہے، جو محض چند پیسوں کے لئے لوگوں کو اوہام میں گرفتار رکھنا چاہتے ہیں، یہ تمام باتیں محض ایمان کی کمزوری اور ضعفِ عقیدہ کا نتیجہ ہیں، حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقدِ نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑ کے سلسلہ میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں، گویا جس غلامی سے اسلام نے اسے آزاد کیا تھا، خود ہی اپنے آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ آپ ﷺ نے کھلے الفاظ میں ''صفر'' کے منحوس ہونے کی تردید فرمائی، یہ تردید نہایت ہی صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہے، اس کے باوجود صفر کی ۱۳/ تاریخ اور آخری چہارشنبہ کو منحوس دن تصور کیا جاتا ہے، کچھ لوگ چھلے فروخت کرنے اور اپنے روزگار کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے باور کراتے ہیں کہ اس دن ڈھیر ساری بلائیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ان کا علاج کر سکتے ہیں، حالاں کہ اسلام کی نگاہ میں کوئی وقت منحوس نہیں، آپ ﷺ نے بعض مہینوں، راتوں اور گھڑیوں کو مبارک ضرور قرار دیا، لیکن کوئی وقت اور گھڑی نامبارک نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نحس ہوتا تو تین چیزوں میں ہوتا: عورت، گھر اور سواری، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز میں نحس ہے ہی نہیں، یہ مشرکانہ تصور ہے کہ انسان اللہ کے بجائے ایسی چیزوں سے نفع ونقصان کو متعلق سمجھے، اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کچھ اور ہو سکتی ہے کہ کوئی قوم علم رکھنے کے باوجود انجانوں جیسا کام کرے اور خدا نے جس کی پیشانی چوکھٹوں کے داغِ مذلت سے آزاد کیا ہو وہ خود ہی جبینِ شرافت کو داغ دار اور رسوا و خوار کرے۔

۱۲/ اپریل ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!

انتخاب کا معرکہ ٹھنڈا ہو چکا ہے اور محترمہ سونیا گاندھی کی قیادت میں سیکولر محاذ نے شاندار فتح حاصل کر کے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کی اکثریت فرقہ پرستی اور نفرت کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتی، بلکہ وہ اتحاد، بھائی چارہ، جمہوریت اور کثرت میں وحدت پر یقین رکھتے ہے، سیکولر محاذ نے یہ الیکشن سونیا گاندھی کی قیادت میں لڑا تھا، الیکشن کے بعد حسب توقع کانگریس پارٹی اور اس کی معاون سیاسی پارٹیوں نے باتفاقِ رائے سونیا جی کو پارلیمنٹ میں اپنا قائد منتخب کیا، اس لئے وزارتِ عظمیٰ یقیناً ان کا حق تھا، لیکن فرقہ پرست جماعتوں نے اپنی شکست کا بدلہ اور ملک میں فساد پھیلانے کے لئے ایک نئی مہم شروع کر دی، کہ سونیا جی اٹلی نژاد خاتون ہیں، اس لئے وزیر اعظم جیسے اہم عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتیں، حالاں کہ یہ نہایت ہی نا معقول بات ہے، کیوں کہ ملک کا دستور ان شہریوں کے درمیان جو ہندوستان نژاد ہوں اور ان شہریوں کے درمیان جو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے اور انھوں نے اس ملک کی شہریت حاصل کی ہے، کوئی فرق نہیں کرتا۔

پھر اس طرح کی مہم جوئی سے باہر کی دنیا میں ملک کی تصویر بھی خراب ہوئی ہے، ہندوستان عالمی سطح پر نسلی تفریق کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے، جنوبی افریقہ اور بعض دوسرے ملکوں میں نسل پرستانہ پالیسی کی اس نے ہمیشہ مخالفت کی ہے، اب اگر اپنے ہی ملک میں وہ اس طرح کا امتیاز روا رکھے اور کچھ شہریوں کے ساتھ دوسرے درجہ کے شہریوں کا معاملہ کرے، تو عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ کتنی خراب ہوکر رہ جائے گی؟ ہندوستان کے لئے مایۂ افتخار ہے کہ کئی ہندوستان نژاد شخصیتیں دوسرے ملکوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئی ہیں، جنوبی افریقہ، فیجی اور ماریشش وغیرہ اس کی مثالیں ہیں، اگر ان ملکوں میں بھی ہندوستان نژاد لوگوں کے خلاف اسی طرح کی تحریک شروع ہوجائے تو غور کیجئے ہم ہندوستانیوں کے کیا جذبات ہوں گے؟

صلاحیتوں کے بجائے رنگ ونسل، زبان، اور علاقہ کو کسی عہدہ اور ذمہ داری کے لئے معیار بنانا نہایت ہی بدبختانہ عمل ہے، یہ ملک کے لئے تو نقصاندہ ہے ہی، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے بھی نہایت مذموم اور ناپسندیدہ طرزِ فکر ہے، مسلمانوں کو یوں خاندانی تعصّبات نے بڑا نقصان پہنچایا ہے، اور افسوس کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی پوری تاریخ اسی تعصب اور تنگ نظری سے داغدار رہے، اور بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اس تصور سے آزاد ہو کر مسلمان فرمانرواؤں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سوچا ہو، بنوامیہ اور بنوعباس کی آویزشوں نے اور برصغیر میں مغلوں اور پٹھانوں کی باہمی بے اعتمادی نے امت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا نقصان شاید انھیں اپنے دشمنوں سے بھی نہیں پہنچا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان خاندانی تعصّبات کے باوجود مسلمانوں میں ایک طرح کی سیاسی وحدت باقی رہی اور آخر دور میں خلافتِ عثمانیہ کے زیر سایہ مسلمان ایک متحدہ امت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر موجود تھے، اور انھیں بڑی عالمی طاقتوں میں شمار کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی خطباء اپنے خطبہ میں خلیفہ کا نام لیا کرتے تھے۔

جب مغرب نے دیکھا کہ شاہی خاندانی حکومتوں کے باوجود یہ امت اس طرح بکھر نہیں پارہی ہے، جو ان کو بے اثر کرنے کے لئے ضروری ہے، تو انھوں نے عالمِ اسلام اور عالم عرب میں علاقائی تعصب کا صور پھونکا، وطن پرستی کے جنون کو ہوا دی، اور ان تعصّبات نے عالم اسلام کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، اب ان کی مثال کٹی ہوئی پتنگوں کی ہوگئی ہے، نہ ان کی کوئی طاقت ہے اور نہ کوئی وقار، یہ بادشاہ ہو کر غلام اور حاکم ہو کر محکوم ہیں، دولت کا خزانہ ان کے ہاتھوں میں ہے، لیکن ان کی مثال اس چوکیدار کی ہے جو اپنی خواہش سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتا، انھیں عشرت کدوں میں بسایا گیا، لیکن ان کی مثال سونے کے قفس کی ہے، جس میں بلا اجازت پھڑ پھڑانے کی بھی گنجائش نہیں۔

اسلام جس انقلابی پیغام کو لے کر دنیا میں آیا، اس کی بنیاد دو باتوں پر ہے: وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسان، یعنی کائنات کا خالق و مالک اور لائق پرستش صرف ایک ہی ہے، اور وہ ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات، اور تمام انسان بھی بحیثیت انسان برابر ہیں، نہ کوئی شخص پیدائشی طور پر بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا، نہ کوئی اونچا اور نہ کوئی نیچا، نہ کوئی شریف اور نہ کوئی رذیل، یہ وحدت تمام دوریوں کو مٹا دیتی ہے اور بلندی و پستی کی مصنوعی دیواروں کو ڈھا دیتی ہے، انسان کالا ہو یا گورا، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، کسی علاقہ میں پیدا ہوا ہو، اور کوئی زبان بولتا ہو، بحیثیت انسان وہ سب برابر ہے، کیوں کہ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، یہ سب ایک درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں۔

قرآن وحدیث میں انسانی وحدت کے اس تصور کو بار بار بیان کیا گیا ہے، پھر جو لوگ مسلمان ہوں، انسانی وحدت کے علاوہ اسلامی اخوت کا رشتہ بھی انھیں آپس میں جوڑتا ہے، پوری امتِ مسلمہ ایک اکائی ہے، ان کی حیثیت ایک دیوار کی اینٹوں اور ایک جسم کے اعضاء کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے یہی مثال دی ہے کہ ان کے مجموعہ کی حیثیت ایک عمارت کی ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت پہنچاتا ہے اور باندھ کر رکھتا ہے ''یشد بعضہ بعضاً ''صرف کردار اور تقویٰ ہی ایسا جوہر ہے جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے مقابلہ وجہ امتیاز ہے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ .

اسی وحدت و اخوت نے امتِ مسلمہ کو کم وقت میں دنیا کے بڑے حصہ کی فرمانروائی سے سرفراز کیا، اس لئے مخالفین اسلام نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کی صفوں میں بکھراؤ اور انتشار پیدا کر دیا جائے، تاکہ ان کی طاقت ٹوٹ جائے اور پھر ان کو نشانہ بنانا آسان ہو، اسی نامسعود کوشش کا سب سے بدترین اظہار —— جیسا کہ ذکر کیا گیا —— تقریباً ایک صدی پہلے ترکوں کے خلاف عرب قومیت کے تصور سے ہوا اور بالآخر خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کا سقوط ہوا، یہ اسلامی تاریخ کا اتنا بڑا حادثہ تھا کہ کم حادثات کو اس کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے، اس واقعہ نے عالم اسلام کو ''مرد بیمار'' ہی نہیں بلکہ ''مردہ بہ دست زندہ'' بنا کر رکھ دیا اور سقوطِ خلافت کے ساتھ ہی عالم اسلام کی شہ رگ پر اسرائیل کا خنجر گھونپ دیا گیا۔

بدقسمتی سے مسلمان اب تک اس فسوں سے باہر نہیں آسکے، عراق میں اس وقت بھی

عربوں اور کردوں کی مخاصمت اور ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی اور بے اعتمادی رویہ مغربی طاقتوں کے لئے مددگار ثابت ہورہا ہے اور عالم اسلام کے قلب میں مغربی افواج اتری ہوئی ہے، مذہبی، نسلی اور لسانی وحدت کے باوجود اسی جغرافیائی تقسیم نے صدام حسین کو کویت پر حملہ آور ہونے لئے اکسایا، اور اس طرح جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ کو آنے کا موقع ملا، اور اس وقت بھی عرب ممالک کی باہمی آویزشیں، کدورتیں اور ایک دوسرے کے خلاف امریکہ و یورپ سے بلکہ خفیہ طور پر اسرائیل سے بھی مدد لینے کا سلسلہ جاری ہے۔

برصغیر میں علاقائی تعصب کی بنیاد پر بنگلہ دیش کا سقوط اور اس موقع سے اردو اور بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی باہمی برادر کشی ایسے رونگٹے کھڑے کردینے والے واقعات ہیں کہ جن کے تصور سے بھی کلیجہ منھ کو آتا ہے اور آج بھی پڑوسی مسلمان ملک میں صوبائی عصبیتوں نے دلوں کے بٹوارے کر رکھے ہیں اور اس جذبۂ جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی وحدت کا تصور عاجز و ناتواں بنا ہوا ہے، مسلمانوں میں علاقائیت کے تصور کو راسخ کرنے اور جغرافیائی قومیت کے عقیدہ کو مستحکم کرنے کی غرض سے بعض لوگوں نے روایتیں بھی وضع کی ہیں، جیسے ''**حب الوطن من الإيمان**'' (وطن کی محبت ایمان کا جزء ہے) حالانکہ یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے اور محدثین متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اسی صدی میں علاقائی تعصب اور قومیت کے نعروں نے امت کو جو نقصان پہنچایا ہے، کسی اور وجہ سے اس درجہ نقصان نہیں پہنچا، اسی لئے علامہ اقبالؒ نے خوب کہا کہ :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے ، وہ مذہب کا کفن ہے

افسوس کہ مذہب کا یہ کفن بعض دفعہ مذہبی جماعتیں، تنظیمیں، ادارے اور مذہب سے وابستہ افراد بھی بیچنے لگتے ہیں، ''**فيا أسفاه و يا عجباه!**'' حالاں کہ معلوم ہے کہ علاقوں کی تقسیم اور جغرافیائی بٹوارے اللہ اور کے رسول کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ یہ انسانی تقسیم ہے،

خدا کے یہاں ایک ہی تقسیم ہے، وہ ہے مؤمن اور کافر کی، نیک اور بد کی، صالح اور غیر صالح کی، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو اس فتنہ سے باہر نکالا جائے اور ان میں اسلامی اخوت کے احساس کو اس درجہ بڑھایا جائے کہ 'میں' اور 'تو' کی تفریق ختم ہو جائے اور یہ امت ''بنیان مرصوص'' بن کر اپنے اصل مقصد کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔

وطن اور اہل وطن کی محبت انسانی فطرت ہے، رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کئے گئے تو آپ ﷺ باہر نکلنے کے بعد نگاہ حسرت ڈالتے ہوئے کہنے لگے کہ: اگر تیرے باشندوں نے نکلنے پر مجبور نہ کیا ہوتا، تو ہم اس شہر کو داغِ فراق نہیں دیتے، پھر جب آپ ﷺ نے مدینہ کو اپنا وطن بنایا، تو اس شہر سے ایسی محبت فرمائی کہ جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے اور احد کی چوٹیاں نظر آتیں تو آپ ﷺ کی سواری کی رفتار بڑھ جاتی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وطن کی محبت دین کے خلاف نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان جہاں بود و باش اختیار کر لیں وہی اس کا وطن ہے، اس لئے جس کو تارکِ وطن کیا جاتا ہے، وہ اصل میں بانی وطن ہے۔

لیکن وطن کو محبوب کے بجائے معبود بنا لینا، اسلامی اخوت کے مقابلہ علاقائی رشتہ کو ترجیح دینا، صلاحیت، استعداد، لیاقت اور اہلیت کے بجائے جغرافیائی تعلق کی بنیاد پر ترجیحات قائم کرنا یہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمیشہ اسلام اور امتِ مسلمہ کے لئے نقصان اور خسران ہی کا باعث بنے گی، ملک کے اس سیاسی واقعہ میں امتِ مسلمہ کے لئے سبق ہے، کہ مختلف قسم کی گروہی عصبیت اور تنگ نظری کی بیماری جو ہمارے اندر آئی ہے، وہ دوسری قوموں سے متاثر ہونے کا اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کا نتیجہ ہے، اسی فلسفہ کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو اونچی اور نیچی ذاتوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، مسلمانوں کو ایسے فتنوں سے متنبہ رہنے اور ہر قیمت پر اپنی صفوں کو انتشار سے بچائے رکھنے کی ضرورت ہے، اور ملکی سیاست میں اس طرح کے جو نعرے لگائے جاتے ہیں، پوری قوت کے ساتھ ان کی مخالفت کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ آج ہندوستان نژاد ہونے اور نہ ہونے کے تصور کو قبول کر لیا

جائے ، تو کل ہو کر یہ بات بھی اٹھ سکتی ہے کہ وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے اقلیتوں یا سنگھ پریوار کے مطابق باہر سے آنے والی اقلیتوں مسلمانوں اور عیسائیوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے بعض نام نہاد مسلمان قائدین کا سنگھ پریوار کی اس ناروا تحریک کی حمایت و تائید کرنا محض نا عاقبت اندیشی اور بے بصیرتی ہے!

۲۸/مئی ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

مقابلہ عمل وکردار کا یا درہم ودینار کا؟

ہمارا یہ ملک موسموں کے اعتبار سے بھی مالا مال ملک ہے، اس ملک میں رہنے والوں کو ٹھنڈ کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے، برسات اور ساون کی رِم جھم بھی شاد کام کرتی ہے اور آتش فشاں کی سی گرمی اور پھر دن بھر کی تپش اور اجلی دوپہر کے بعد سرمئی شام ایک نئے لطف سے آشنا کرتی ہے، لوگ موسم کے اعتبار سے ایک سے ایک ملبوسات پہنتے ہیں، اور ایک سے ایک لذت انگیز غذاؤں سے حظ اٹھاتے ہیں، لیکن یہ موسم تو ہر جگہ آتے ہیں —— ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے، ہمیں اس میں آپ اپنے حکمرانوں اور حکومت میں اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ آزادی بھی اس مبالغہ کے ساتھ ہے کہ اگر ہم قاتل، رہزن اور چوراچکے کو بھی منتخب کرلیں تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اپنی زبان پر حرفِ شکایت لا سکے، چنانچہ ''ہماری اعلیٰ ظرفی اور کشادہ قلبی کے صدقہ'' آج مجرمین کی ایک بڑی تعداد پوری تمکنت اور وقار کے ساتھ ایوانِ حکومت میں متمکن ہے، چاہے آپ اسے سماج کی بے شعوری اور ناسمجھی قرار دیں یا اس کی وسیع القلبی اور جذبۂ عفو ودرگذر، بہر حال یہ ہے جمہوریت ہی کا کرشمہ!

جمہوری نظام میں چند سالوں پر ایک اور موسم آتا ہے، جس کی بہار تمام موسموں سے بڑھ کر اور اس کی رنگینیاں اور رعنائیاں تمام موسموں سے سوا ہوتی ہیں، جاڑے، گرمی اور برسات میں لوگوں کو ملبوسات اور حسبِ حال غذائیں خرید کرنی ہوتی ہیں، لیکن اس موسم میں سماج کے ہوشیار اور موقع شناس لوگوں کو ایک پیسہ خرچ کئے بغیر یہ اور ان سے بڑھ کر اسبابِ لذت وعیش میسر آجاتی ہیں، یہ ہے ''الیکشن کا موسم''، جس میں ووٹ کی منھ مانگی قیمت دی جاتی ہے، اور پھر بھی اس کوچہ کے اہل معرفت ''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز'' کا نعرہ لگاتے ہیں۔

الیکشن ایک بہت بڑی نعمت بھی ہے، الیکشن ہی کے ذریعہ ہمیں پرامن طریقہ پر صالح قیادت کو اقتدار پر لانے کا موقع بہم پہنچتا ہے اور ہم حزب اقتدار کے کاموں کا محاسبہ کر سکتے

ہیں،لیکن کسی بھی نعمت کا غلط استعمال اس کو رحمت کے بجائے زحمت اور امرت کے بجائے زہر بنا کر رکھ دیتا ہے، یہی معاملہ الیکشن کا بھی ہے، الیکشن میں امیدوار دراصل اس لئے کھڑے ہوتے ہیں کہ انھیں آئندہ قوم کی خدمت کا موقع دیا جائے، وہ سماج کو فائدہ پہنچائیں، وہ ملک کو امن وآشتی کا گہوارہ بنائیں، گھر گھر محبت اور سکون کا چراغ جلائیں،لیکن وہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ الیکشن کی لڑائی کردار اور عمل کے ہتھیار سے لڑی جائے، امیدوار لوگوں کے سامنے اپنا عملی ریکارڈ رکھے اور آئندہ عوامی خدمت کے سلسلہ میں اپنے منصوبے پیش کرے، عوام ان کے ریکارڈ اور عزائم کو سامنے رکھ کر اپنا رجحان متعین کریں اور ایسے اشخاص کا انتخاب کریں جو واقعی قوم وملک کی خدمت کرنے میں مخلص ہوں، اگر الیکشن عمل کے بجائے پیسوں اور کردار کے بجائے درہم و دینار کی بنیاد پر لڑے جائیں، تو شریف جذبۂ خدمت کے حامل اور حقیقت معنوں میں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار لوگ کم ہی میدان میں اتر سکیں گے اور اخلاق وکردار کے بجائے دولت وثروت کی اساس پر افراد منتخب کئے جائیں گے اور پھر وہی صورتِ حال پیش آئے گی جو اس وقت ہم سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت الیکشن کے خفیہ اخراجات کو چھوڑ کر علانیہ اخراجات (جو قانون کے دائرہ میں آتے ہیں) خود اتنے زیادہ ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کے لئے کسی طور بجا نہیں کہے جاسکتے، اس وقت میرے سامنے مشہور انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کا ۵/ اپریل کا شمارہ ہے، جس میں محترم جناب شنکر آئیر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں الیکشنی اخراجات پر قلم اٹھایا ہے، ان کے تجزیہ کے مطابق بہت سے اخراجات کو چھوڑ کر بھی ۱۱/ ہزار پانچ سو باسٹھ کروڑ روپے مختلف پارٹیاں الیکشن کی علانیہ مہم (پرچم، پوسٹر، بینر، الیکشن آفس، ریلی، ہیلی کاپٹرس، آڈیو، ویڈیو ٹیپ، ٹوپی، ساڑی، دھوتی وغیرہ) پر خرچ کرتے ہیں، اس کے علاوہ خفیہ طور پر بلا اعلان واظہار جو خرچ کیا جاتا ہے اور عوام کو رجھانے، مقامی نیتاؤں کی وفاداریاں تبدیل کرنے اور ووٹ بذریعہ نوٹ کی پالیسی کے تحت جو اخراجات کئے جاتے ہیں، وہ اس سے سوا ہیں اور وہ یقیناً حقیقی اخراجات سے بہت زیادہ ہیں۔

الیکشن کی یہ علانیہ رقم اس رقم سے کہیں زیادہ ہے جو ہمارے ملک کے سالانہ بجٹ میں دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے مخصوص کی جاتی ہے، حالاں کہ ہمارے ملک کے اسّی فیصد لوگ ان ہی دیہاتوں میں رہتے ہیں، گویا ایک انتخاب کا وہ خرچ جو سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کے ہاتھ ہوتا ہے، اسّی فیصد ہندوستانیوں کو ترقی کے مواقع بہم پہنچانے کے اخراجات سے زیادہ ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ صحت اور تعلیم جیسے اہم شعبوں پر بہت ہی معمولی رقم خرچ کی جاتی ہے، جو بجٹ کے چند فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی، حکومت کے اکثر شعبوں میں روزگار کے مواقع منجمد ہو کر رہ گئیں ہیں اور جو ملازم ریٹائر ہوتا ہے، اس کی جگہ نئی تقرری نہیں ہوتی، بعض اسکول ہائی اسکول کی حیثیت سے منظور ہیں، لیکن وہاں ٹیچروں کی تعداد صرف دو تین رہ گئی ہے، گورنمنٹ کی طرف سے نئے تسلط نے مقامی صنعت کے بعد اب زراعت کو بھی کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے، ان حالات میں الیکشن کے ان شاہانہ اخراجات کا کیا کوئی جواز ہو سکتا ہے جس پر تمام چھوٹی بڑی جماعتوں نے اتفاق کیا ہوا ہے؟

یہ موضوع ملک کے دانشوروں اور حقیقی بہی خواہوں کے لئے بہت ہی قابل غور ہے، اس شاہ خرچی کے معاشی نقصانات تو ہیں ہی، اخلاقی نقصانات بھی بہت زیادہ ہیں، اس سے بحیثیتِ مجموعی قوم میں ناجائز راستہ میں خرچ کرنے اور زائد از ضرورت خرچ کرنے کا مزاج بن جاتا ہے، قرآن مجید کی زبان میں یہ اسراف ہے، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو خرچ کرنے میں نہ اسراف سے کام لیں اور نہ تنگی سے ''وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً '' (الفرقان: ٦٧) اور ایک موقع پر قرآن مجید نے فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا ہم نشیں قرار دیا ہے (الاسراء: ٢٧) ناجائز اور ناروا کام میں خرچ کرنا تو بری بات ہے ہی، جائز کام میں بھی زائد از ضرورت خرچ کرنا بری بات ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر ہوا، جو وضو کر رہے تھے، آپ ﷺ نے آواز دی: اے سعد! یہ اسراف کیا ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! گو تم بہتی ہوئی نہر پر کیوں نہ ہو، (تفسیر

کبیر: ۱۰/ ۶۷) —— جب کسی قوم میں حکومت اور سیاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ بے جا خرچ کے عادی ہو جائیں اور اپنی شخصیت کی تشہیر میں پانی کی طرح پیسے بہائیں تو عوام کو اس سے کیا سبق ملے گا اور ان کا کیا مزاج بنے گا؟ وہ بھی اپنی تقریبات میں اس طرح پیسے بہانے کے خوگر ہو جائیں گے اور اپنے وقار واعتبار کے اظہار کے لئے یہی جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔

پہلے کرپشن حکومت کے عہدیداروں تک محدود تھا، لیکن ہر قیمت پر الیکشن جیتنے کی خواہش نے پورے عوام کے مزاج میں کرپشن کو داخل کر دیا ہے، کیوں کہ انھیں سیاسی لیڈروں اور جماعتوں نے نوٹ لے کر ووٹ دینے کا سبق پڑھایا ہے، اب تو اہم کارکنوں کو گاڑیاں بھی دی جاتی ہیں، موبائیل تقسیم کئے جاتے ہیں، بلاضرورت بھی الیکشن آفس قائم کیا جاتا ہے اور کرایہ کے عنوان سے خطیر رقم دی جاتی ہے، اس طرح پیسوں سے ووٹ کی خریداری عمل میں آتی ہے، یقیناً یہ ایک بڑی سماجی برائی ہے، کہ لوگ ضمیر کی آواز پر اور لوگوں کے اخلاق وکردار کی اساس پر ووٹ دینے کے بجائے سیم وزر اور درہم ودینار کی بنیاد پر اپنی رائے دہی کے مقدس حق کو استعمال کریں۔

جب دولت کے ذریعہ الیکشن میں فتح حاصل کی جاتی ہے، تو فطری بات ہے کہ امیدوار اپنے پیسے واپس وصول کرنے کے لئے اول دن سے تگ ودو میں لگ جاتے ہیں، اور اس طرح ''نوٹ کے ذریعہ ووٹ اور ووٹ کے ذریعہ نوٹ'' کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا ہے، پچھلے ایک دہے میں بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے جو اسکینڈل سامنے آئے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے قائدین نے بے جان مردوں کے کفن اور بے زبان جانوروں کے چارہ تک کو نہیں بخشا ہے، اس کا سبب صرف ان کی بوالہوسی اور نہ ختم ہونے والی حرص ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک فطری سبب وہ کثیر اخراجات بھی ہیں، جو انھوں نے الیکشن میں خرچ کئے ہیں اور پھر انھیں آئندہ الیکشن میں خرچ کرنا ہے، گویا ہم سیاسی قائدین میں کرپشن کو بڑھانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

اگر قومی سطح پر اس الیکشن فضول خرچی کو روکنے کی سعی نہ کی گئی تو وہ دن دور نہیں کہ آہستہ

آہستہ ویلفیر اور چیرٹیبل اداروں میں بھی انتخاب کے لئے مہم جوئیاں ہونے لگیں گی اور لوگ پیسوں سے عہدہ خریدنے کو کوشاں ہوں گے، اسلامی تصور الیکشن کے سلسلہ میں بہت واضح ہے، افراد کا انتخاب اخلاق و کردار کی بنیاد پر کیا جائے ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ''ہر امیدوار کو یکساں طور پر اظہار خیال کا موقعہ دیا جائے، الیکشن میں تشہیری مہم پر غیر معمولی اخراجات کو روکا جائے، کہ یہ پیسے قوم کی امانت ہیں اور ان کا استعمال قومی مفاد میں ہونا چاہئے، غریب اور جذبۂ خدمت کے حامل لوگوں کے لئے معرکۂ انتخاب کو آسان بنایا جائے اور ان اسباب کا سد باب کیا جائے جو ہماری قیادت اور عوام دونوں کو بدترین قسم کے کرپشن کا عادی بنا رہے ہیں، اور بحیثیتِ مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان مفاسد کو روکنے اور صاف ستھرا جمہوری سماج تعمیر کرنے میں اپنا حصہ ادا کریں۔

۲/ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ، ۲۳/ اپریل ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

لباسِ زندگی کا انتخاب

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، اس کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارے، یہ بھی اس کی ایک ضرورت ہے، اگر انسان کے لئے یہ بات کافی ہوتی کہ اسے پیٹ بھرنے کے لئے غذا، پہننے کے لئے کپڑے اور سر چھپانے کے لئے کوئی چھت میسر ہو تو جیل سے بڑھ کر اس کے لئے آرام وسکون کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، قیدی قید کو انعام سمجھتے نہ کہ سزا، کہ یہاں کسی دوڑ دھوپ اور کدو کاوش کے بغیر اسے یہ ساری نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔

لیکن جیل انسان کے لئے سزا کیوں ہے؟ اسی لئے نا، کہ وہ قید خانہ میں اپنے اہل تعلق سے کاٹ دیا جاتا ہے اور اپنے دوستوں سے بے تعلق رکھا جاتا ہے، یہی چیز اسے ہر لمحہ بے چین و بے قرار رکھتی ہے، انسان کے تعلق کا دائرہ بہت وسیع ہے، خاندان، پڑوس، ہم پیشہ لوگ، دوست احباب، اپنے پیشہ کی نسبت سے متعلقین، اساتذہ، شاگرد، شیخ، مرید، سارے اہل تعلق ہیں، جن کی جدائی آدمی کو تڑپاتی اور بے قرار رکھتی ہے، یہاں تک کہ وہ در و دیوار اور فضائیں بھی، جس میں اس نے اپنا بچپن اور جوانی گذاری ہے اور جس سے اس کی بھولی بسری یادیں متعلق ہیں، لیکن ان تمام رشتوں اور علائق میں ماں باپ، بال بچے اور بیوی کی یاد انسان کو سب سے زیادہ بے قرار کرنے والی ہوتی ہے، ماں باپ کا سہارا بچپن میں حاصل رہتا ہے، کبھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد، کبھی اس سے پہلے ہی یہ سہارا ٹوٹ جاتا ہے، بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنے کام دھام میں لگ جاتے ہیں، اور ایسا کم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل ماں باپ کے پاس مقیم رہیں، گاہے گاہے ہی ملاقات کی نوبت آتی ہے، لیکن میاں بیوی ایک دوسرے کے ہمہ وقتی رفیق ہیں، خوشی ہو یا غم، مسرت کے شادیانے بجیں، یا رنج والم کے تازیانے برسیں، ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ، اسی لئے قرآن مجید نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے

لباس قرار دیا ہے، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ، (البقرۃ:۱۸۷) یہ ایک ایسی اچھوتی، البیلی، خوب صورت اور معنی خیز تعبیر ہے کہ ازدواجی زندگی کے تعلق کو اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

لباس میں یوں تو مختلف چیزیں دیکھی جاتی ہیں، رنگ، ڈیزائن، بناوٹ، لیکن سب سے زیادہ موسموں کے لحاظ سے انسانی جسم کے ساتھ اس کی موافقت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، گرمی کا موسم ہو تو سوتی اور اس میں بھی ململ وغیرہ کا کپڑا پہنایا جاتا ہے، حالاں کہ پالسٹر میں اس سے زیادہ خوب صورت کپڑے مل سکتے ہیں، جاڑے کے موسم میں اونی ملبوسات کا استعمال ہوتا ہے، حالاں کہ بعض اوقات ان کی رنگت کچھ بہت اچھی نہیں ہوتی، اسی طرح ٹیری کارٹ اور پالسٹر کا بھی استعمال ہوتا ہے، برسات میں برساتی کی ضرورت پڑتی ہے، جو دیکھنے میں خوب صورتی سے خالی ہوتی ہے، اب تو ایسے کپڑے بھی چل پڑے ہیں، جنھیں برساتی کے بغیر بارش میں پہنا جاتا ہے، کوئی خطرہ کا موقع ہو تو آج کل شاک پروف (آگ کا محافظ) لباس استعمال کیا جاتا ہے، ان ملبوسات میں بنیادی طور پر جو چیز پیش نظر ہوتی ہے، وہ یہی کہ یہ انسان کو موسمی نشیب و فراز سے بچانے والی اور اس کے جسم سے مناسبت رکھنے والی پوشاک ہو۔

لباسِ زندگی یعنی شوہر و بیوی کے انتخاب میں بھی یہی معیار مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عام طور پر نکاح چار اسباب کے تحت کیا جاتا ہے: دولت و ثروت کو دیکھ کر، خاندانی وجاہت سے متاثر ہو کر، حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر اور دین داری اور اخلاق کو معیار بنا کر، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ دین دار لڑکی کا انتخاب کر کے کامیابی حاصل کرو، ''**فاظفر بذات الدین**'' (بخاری، حدیث نمبر:۵۰۹۰) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مزید وضاحت کی اور فرمایا کہ اگر تم نے حسن و جمال کو دیکھ کر شادی کیا تو ممکن ہے کہ ان کا حسن انھیں ہلاک کر دے اور اگر دولت کی وجہ سے نکاح کیا تو ممکن ہے کہ ان کی دولت انھیں مغرور کر دے، اس لئے دین کی بنیاد پر شادی کرو، کہ ایک کالی، کلوٹی دین دار باندی زیادہ بہتر ہے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۱۸۹)

بعض روایتوں میں یہ مضمون آیا ہے کہ مال آنی جانی چیز ہے اور حسن ڈھل جانے والی شئ ہے، اس لئے ان پر فریفتہ نہ ہو، ایک روایت میں ارشاد ہے کہ دنیا کا سب سے بہترین سامان نیک عورت ہے: ''خیر متاع الدینا المرأة الصالحة ''(مسلم، حدیث نمبر:۱۴۶۷) دین دار اور شریف عورت کی مثال موزوں اور موسم کے نشیب وفراز میں کام آنے والے لباس کی سی ہے، کیوں کہ تمام نیکوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور تمام برائیوں کی اساس خدا سے بے خوفی ہے، جس شخص کے دل میں دین راسخ نہ ہو اور جس کا سینہ خدا کے خوف سے لبریز نہ ہو، اس کا معاملہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ بھی بہتر نہیں ہوسکتا، اس لئے ایک دین دار شوہر اور دین دار بیوی ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کر سکتے ہیں، بے دین شخص سے اس کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دین کی بنیاد پر رشتہ کے انتخاب کو ظفر مندی اور کامیابی کا باعث قرار دیا، کامیابی کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی، پس دنیا میں بھی کامیاب ازدواجی زندگی کا مدار دین دار اور خوش اخلاق رفیق حیات کے انتخاب پر ہے، میاں بیوی کی صالحیت اولاد پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اور اس کے خاندان میں بھی علم اور دین داری کا سلسلہ جاری رہتا ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک بار شب میں مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے، تاکہ لوگوں کی ضروریات اور احوال سے واقف ہوسکیں، گذرتے ہوئے ایک گھر کے سامنے آپ رضی اللہ عنہ کے قدم رک گئے، جہاں سے ایک ماں بیٹی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ وہ دودھ میں پانی ملادے، تاکہ دودھ کی مقدار بڑھ جائے، بیٹی نے کہا: ماں! امیر المؤمنین نے اعلان کرایا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، ماں نے کہا: امیر المومنین تھوڑا ہی دیکھ رہے ہیں؟ بیٹی نے کہا: امیر المومنین نہیں دیکھ رہے تو کیا ہوا، اللہ تو دیکھ رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مکان پر نشان لگادیا اور اس لڑکی سے اپنے صاحبزادہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا پیامِ نکاح بھیجا، بظاہر یہ ایک غریب گھرانہ تھا اور دودھ بیچنے پر گذراوقات تھی، خاندان کے بارے میں بھی تحقیق نہیں کی اور صورت وشباہت بھی نہیں دیکھی، صرف اس کے اخلاق وکردار

اور دین داری وخدا ترسی کو معیار بنا کر اپنے صاحبزادے کا نکاح فرمادیا، آگے چل کر نانہالی رشتہ کے لحاظ سے اسی سلسلہ سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پیدا ہوئے، (دیکھئے: سیرت عمر بن عبد العزیز:۱۷،۱۸) جن کو ان کے عدل وانصاف، رعایت پروری اور مساویانہ سلوک کی وجہ سے ''عمر ثانی'' کہا جاتا ہے، بنوامیہ میں ایسے انصاف پرور فرمانروا کا پیدا ہونا غالباً اسی حسن انتخاب کا نتیجہ تھا!

سعید بن المسیّب (متوفی: ۱۰۰ھ) ایک بڑے محدث اور فقیہ گذرے ہیں، ان کے علم وتفقہ پر پوری امت کا اجماع واتفاق ہے، اگر تابعی یا تبع تابعی (صحابی کو دیکھنے والا، یا صحابی کو جس نے دیکھا ہو، اسے دیکھنے والا) براہِ راست نسبت کرتے ہوئے کوئی بات نقل کرے تو اسے علم حدیث کی اصطلاح میں ''حدیث مرسل'' کہتے ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ حدیث معتبر ہوگی یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس کا اعتبار کرتے ہیں، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اس کا اعتبار نہیں کرتے، لیکن امام شافعیؒ سعید بن المسیّب کی مرسل کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں اور معتبر مانتے ہیں، اس سے ان کے علمی پایہ ومرتبت اور درجہ ومقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سعید بن المسیّب کی ایک صاحبزادی بڑی ہی فہیم، صاحبِ علم اور باکمال خاتون تھیں، بادشاہِ وقت نے اپنے ولی عہد شہزادہ کے لئے اس لڑکی سے پیغام بھیجا، انھوں نے معذرت فرمادی، خوف تھا کہ کہیں دربارِ شاہی سے اس کے لئے اصرار ہو، انھیں دنوں ایک واقعہ پیش آیا، کہ ان کے ایک ہونہار، لائق اور درس کے پابند شاگرد چند دنوں درس سے غیر حاضر رہ کر پھر ایک دن حاضر ہوئے، استاذ نے غیر حاضری کا سبب پوچھا، شاگرد نے عرض یا کہ ان کی بیوی کی وفات ہوگئی ہے، استاذ نے پوچھا: کہ تم نکاح کے لئے تیار ہو؟ شاگرد نے عرض کیا مجھ جیسے محتاج شخص کو کون اپنی لڑکی دینا گوارا کرے گا؟ استاذ نے پوچھا کہ تم اس کے لئے تیار ہو یا نہیں؟ شاگرد نے رضامندی ظاہر کی، انھیں نادار اور محتاج، لیکن لائق، ہونہار اور دین دار شاگرد سے سعیدؒ نے اسی مجلس میں نکاح پڑھادیا، جب شام ہوئی تو اپنی لڑکی کا ہاتھ تھاما اور خود

ہی ساتھ لے کر شاگرد کے مکان پہنچ گئے، دروازہ پر دستک دی، اندر سے سوال ہوا تو جواب دیا، شاگرد گھبرا گئے کہ خلافِ معمول اس وقت استاذ کیوں آئے؟ دروازہ کھولا تو حیرت زدہ رہ گئے، استاذ اپنی صاحبزادی کا ہاتھ تھام کر اور انھیں ساتھ لے کر پہنچے تھے، فرمانے لگے: میں نے سوچا کہ جب تمہارا میری اس لڑکی سے نکاح ہو گیا ہے، تو تم تنہا رات کیوں گزارو، اسی لئے تمہاری بیوی کو ساتھ لے کر آیا ہوں اور پھر واپس چلے گئے۔

یہ دین و اخلاق کی بنیاد پر بہو اور داماد کا انتخاب ہے، اگر گھر میں دین دار بہو آئے گی، اسلامی اخلاق کا حامل داماد آئے گا تو گھر میں دین کا چلن پیدا ہوگا، محبت کی فضاء قائم ہوگی، نماز روزہ کا معمول بنے گا، ٹی وی کے گانوں کے بجائے تلاوتِ قرآن کی آواز میں گونجیں گی اور ان شاءاللہ پورا گھر جنت نشاں بن جائے گا، ورنہ یہ تو ممکن ہے کہ ظاہری اسباب آرائش گھر میں آجائیں، لیکن دین رخصت ہو جائے گا، زندگی ایثار و محبت کے بجائے باہمی کدورت اور خودغرضی پر مبنی ہوگی اور بوڑھے ماں باپ ایک بوجھ بن جائیں گے، اس کی مثالیں آج سماج میں کسی تلاش کے بغیر مل سکتی ہیں۔

آج کل اخبارات میں شادی کے اشتہارات پر نظر دوڑایئے اور رشتوں کے سلسلہ میں خواہشات کو دیکھئے، لڑکی فیر کلر اور بہت خوب صورت اور گوری ہونی چاہئے، قد و قامت اتنے سے سے کم نہ ہو، لڑکا اسمارٹ ہو، امریکہ، یو کے یا خلیج میں کام کرتا ہو، یا گورنمنٹ ملازم ہو، یا یہ کہ لڑکے کو باہر بھیجنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے، غرض مال و دولت اور حسن و جمال یہی معیار ہیں، باقی دین داری اور دین آگہی تو اس پر کسی کی توجہ نہیں، یہ نہایت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور دین کے بجائے دنیا کو نگاہِ انتخاب بنانے کا خمیازہ خود انھیں ہی بھگتنا پڑتا ہے، اس کے نتیجہ میں مسلم سماج بے راہ روی کا شکار بنتا جا رہا ہے، اور ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ بعض مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں کے ساتھ راہِ فرار اختیار کرتی ہیں، چند ماہ پہلے ایک مقامی اخبار میں سروے آیا تھا کہ عدالت کے ذریعہ نکاح کرنے کے ستر فیصد واقعات مسلمان لڑکیوں کے پیش آئے ہیں، ظاہر ہیں کہ ان میں ایک اچھی خاصی تعداد بین مذہبی شادی کی ہوتی ہے، ایسے

واقعات کا محرک جہاں اور بہت سی باتیں ہوتی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب غریب سے غریب لڑکا بھی صاحبِ ثروت کی تلاش کرنے لگتا ہے اور جب یہ چاہت کروٹ لینے لگتی ہے کہ ہماری بیوی پری اور حور سے کم نہ ہو، چاہے خود بندر اور لنگور کیوں نہ ہو، تو آخر امت کی یہ لڑکیاں جو غریب اور کم خوب صورت ہوں، کہاں جائیں گی؟؟

۱۳/ جمادی الاولی ۱۴۲۴ھ ۲/ جولائی ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

نکاح پڑھانے والوں میں مطلوبہ صلاحیت اور ذمہ داریاں

انسان اپنی زندگی میں جن معاملات کو انجام دیتا ہے، ان میں نکاح سب سے اہم اور دور رس اثر کا حامل ہے، یہ زندگی کا ایک سنجیدہ فیصلہ ہے اور اسی سے اس کی آنے والی نسل کی اصلاح و تربیت متعلق ہے، اسی لئے اسلام میں نکاح کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ نکاح کے لئے ایجاب وقبول اور طرفین کی رضامندی کو ضروری قرار دیا گیا، نکاح میں اولیاء کی رائے کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے، مجلس نکاح میں خطبہ بھی رکھا گیا ہے، دعوتِ ولیمہ بھی رکھی گئی ہے، تا کہ دونوں خاندانوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھیں اور ان میں ذہنی قربت پیدا ہو، نیز اس طرح اس رشتے کا اچھی طرح اعلان واظہار ہو۔

نکاح کے منعقد ہونے کے لئے نکاح کی تفصیلات کو تحریری طور پر ریکارڈ کرنا ضروری قرار نہیں دیا گیا، اس لئے کہ ہر جگہ اس کی سہولت میسر نہیں ہے اور دور دراز کے دیہاتوں اور قریہ جات میں اس صلاحیت کے لوگ بھی نہیں ہیں جو دستاویز نکاح کو مرتب کرسکیں، اس لئے نکاح کے رجسٹریشن کو لازم قرار دینا مسلمانوں کے لئے نا قابل قبول ہے، کیوں کہ یہ نکاح میں ایک ایسی شرط کا اضافہ کرنا ہے جس کو شریعت نے لازم قرار نہیں دیا ہے، لیکن تحریری طور پر اگر نکاح کے مضمون کو ریکارڈ کرنے کا کوئی انتظام ہو تو اس کے مستحب اور مطلوب ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیوں کہ نکاح سے ایک مرد وعورت کی حلال اور پاکیزہ زندگی کا تعلق ہے، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ چھپا کر دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا گیا، رشتہ کا اظہار نہیں کیا گیا اور بعد میں نانہجار شوہر نکاح سے مکر گیا، نکاح سے عورت کا حق میراث بھی متعلق ہے، ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ مرد یا عورت کی موت کے بعد دوسرا فریق میراث کا طلب

گاربن کر کھڑا ہو گیا اور خاندان میں ایک نئی نزاع پیدا ہوگئی۔

نکاح سے بیوی کے نفقہ و میراث کے علاوہ بچوں کے نسب اور ان سے متعلق ذمہ داریاں بھی مربوط ہیں، جب تک مرد و عورت کا نکاح ثابت نہ ہو اس عورت کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش اور کفالت پر اس مرد کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، وہ اس کے مال میں اپنا حق میراث ثابت نہیں کر سکتے، مرد ان کے نسب کا انکار کر جائے تو اس کی حیثیتِ عرفی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچتا ہے اور یہ اس کی عزت و آبرو کے قتل کے مترادف ہے، نکاح کا تحریری ریکارڈ ایسے واقعات کو روکنے اور سچائی کو محفوظ کرنے میں بہت ہی ممد و معاون ثابت ہوتا ہے، پھر نکاح سے ایک مالی ذمہ داری مہر کی بھی متعلق ہے، مہر نقد ادا کیا گیا یا ادھار ہے؟ اگر مہر بعد میں ادا کیا جائے گا تو فریقین کے درمیان اس کی کیا مدت مقرر ہوئی ہے؟ پھر مہر کی مقدار کیا ہے؟ سونا، چاندی ہے یا سامان ہے یا کرنسی ہے؟ کرنسی ہے تو کس ملک کی ہے؟ یہ ساری باتیں مہر سے متعلق ہیں، جن کے سلسلہ میں آپسی اختلاف کے وقت نزاع سی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس لئے ہندوستان کے بعض علاقوں میں ''نکاح نامہ'' کا رواج بہت خوب ہے، اور شریعت کے مزاج اور منشا کے موافق ہے، یوں تو مختلف شہروں میں نکاح نامے مروّج ہیں، لیکن دکن اور بھوپال کے علاقہ میں قریب ترین عہد تک مسلم حکومت کے موجود ہونے کی وجہ سے نکاح خوانی کا نسبتاً بہتر رواج پایا جاتا ہے، بھوپال کا نکاح نامہ تو دیکھنے کا موقع نہیں ملا، لیکن دکن میں مروّج نکاح نامہ بہت جامع، منضبط اور شرعی قیود و تنقیحات کی روشنی میں مرتب کردہ ہے، جسے مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی جامعہ نظامیہ) نے اپنی نگرانی میں مرتب کرایا تھا۔

نکاح نامہ یا نکاح کے تحریری ریکارڈ کے بارے میں قرآن مجید کی ایک اصولی ہدایت سے روشنی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! کسی مقررہ مدت کے لئے تم آپس میں دَین کے لین دین کا معاملہ کرو، تو اسے لکھ لیا کرو، تمہارے درمیان ایک لکھنے والا انصاف کے ساتھ دستاویز تحریر کرے، جسے

اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے ، لہٰذا وہ لکھے اور جس شخص پر حق باقی ہو وہ املاء کرائے ، اور اسے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتے رہنا چاہئے ، او جو بات طے ہوئی ہے، اس میں کوئی کمی نہ کرے، جس پر حق ہے اگر وہ نا سمجھ یا ضعیف ہو، یا املاء کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو تو اس کے ولی کو انصاف کے ساتھ املاء کرانا چاہئے ، اور اپنے مردوں میں دو کو گواہ بھی بنا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ، یہ ایسے لوگ ہوں جن کی گواہی تمہارے درمیان قابل قبول ہو، (دو عورتیں اس لئے کہ) ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اور جب گواہوں کو گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو وہ اس سے انکار نہیں کریں ، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، مدت کی تعیین کے ساتھ اس کو لکھ لینے میں سستی سے کام نہ لیں ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ صورت زیادہ منصفانہ اور گواہی کے لئے مدد و معاون ہے اور امید ہے کہ اس سے تم شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوگے......۔ (البقرۃ:۲۸۲)

اس آیت کا تعلق اصل میں مالی معاملات سے ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا نکاح زندگی کا اتنا اہم اور سنجیدہ معاملہ ہے کہ اس کی اہمیت مال سے کہیں بڑھ کر ہے، کیوں کہ اس سے انسانی عزت وشرافت ، نسل کی حفاظت اور بہت سے حقوق متعلق ہیں ، اس لئے جب مالی معاملات کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا حکم دیا ہے تو نکاح کا لکھا جانا بہ درجۂ اولی مطلوب ہوگا، اسی لئے فقہاء نے اس آیت کو ان تمام معاملات سے متعلق رکھا ہے جس میں کسی چیز کی مدت متعین کی گئی ہو" ینتظم سائر عقود المداینات التي یصح فیھا الآجال "(احکام القرآن للجصاص:۲/۳۷۹) بلکہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے خاص طور پر ایسے نکاح کا ذکر کیا ہے، جس میں مہر بعد میں ادا کئے جانے والا ہو، اور خلع کو بھی تحریری طور پر منضبط کرنے کی تلقین کی ہے...." والمھر إذا کان

مؤجلا ، و کذلک الخلع الخ ''(حوالہ سابق:۲/ ۲۰۸)قرآن مجید کی اس سب سے طویل آیت میں ہمیں ایسی دستاویزات کے لئے واضح اشارات اور اُصول بھی ملتے ہیں :

☆ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ صحیح طور پر اندراجات کی صلاحیت رکھتا ہو۔

☆ وہ عادل اور معتبر ہو، سچائی کے ساتھ تمام باتوں کو تحریر میں لاتا ہو، اس میں دھوکہ دہی اور حقائق کو چھپانے کا مزاج نہ ہو۔

☆ چوں کہ نکاح کی وجہ سے مرد پر حقوق عائد ہوتے ہیں، اس لئے مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے طے شدہ امور کو تحریر کرائے، اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے اور چالبازی سے کام نہ لے۔

☆ اگر ہونے والے شوہر میں خود اس کی صلاحیت نہیں ہو تو اس کے گھر کے ذمہ دار لوگ اسی طرح عدل وانصاف کے ساتھ نکاح نامہ کی خانہ پری کریں۔

☆ نکاح نامہ میں دو مرد یا کم سے کم ایک مرد اور دو عورتوں کا بھی بہ حیثیت گواہان اندراج ہو۔

☆ یہ گواہان سچے اور معتبر لوگ ہونے چاہئیں ''مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ ''اور بہتر ہے کہ عاقدین کے لوگوں میں سے گواہان بنائے جائیں، شَهِيْدَيْنِ مَنْ رِّجَالِكُمْ ۔

☆ جن اچھے اور بھلے لوگوں کو نکاح کا گواہ بننے کے لئے کہا جائے، وہ گواہ بننے سے انکار نہیں کریں۔

☆ مہر کی مقدار کی کمی اور زیادتی کو 'نکاح نامہ' کی تکمیل میں ملحوظ نہ رکھا جائے، اگر مہر کی مقدار کم بھی ہو تب بھی نکاح کا ریکارڈ محفوظ کر دیا جائے۔ وَ لَا تَسْئَمُوْا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا إِلٰى أَجَلِهٖ ۔

☆ یہ تحریری ریکارڈ انصاف اور سچائی کو قائم کرنے میں مدد ومعاون ہوگا اور لوگوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے سے بچائے گا۔

اس آیت (بقرہ:۲۸۲) سے معلوم ہوا کہ نکاح نامہ میں نکاح سے متعلق تمام ضروری تفصیلات کا ریکارڈ ہونا چاہئے ، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ نکاح پڑھانے والے ہوں وہ ضروری حد تک علم اور صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔

کم علمی پر مبنی بعض واقعات نکاح کی مجلسوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں ، بعض دفعہ ہونے والے داماد اور سسر کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ڈال کر اسے رومال میں لپیٹ دیا جاتا ہے ، حالانکہ یہ ایک غیر ضروری عمل ہے ، اور ایک حد تک تہذیب کے بھی خلاف ہے ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالنا یا تو مصافحہ کے لئے ہے یا بیعت کے لئے ، محض عہد کے لئے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ، لیکن بعض قاضیانِ نکاح زبان سے ایجاب وقبول کو کافی نہیں سمجھتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں ، بعض حضرات کو اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا اور وہ دونوں ہاتھوں کے درمیان مصری اور بادام رکھ کر ایجاب وقبول کراتے ہیں ، راقم الحروف نے خود ایک قاضیٔ نکاح سے اس سلسلہ میں دریافت کیا تو کہنے لگے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کی زندگی میں مصری کی مٹھاس پیدا ہو ، اور جیسے بادام کے چھلکے میں بادام چھپا ہوا ہے ، اسی طرح دونوں ایک دوسرے کے لئے ستر کا باعث بنیں ، یہ عجیب نکتہ ہے ، شاید ہی محدثین اور فقہاء کی یہاں تک رسائی ہوئی ہو۔

ایجاب وقبول کے وقت یہ بات بھی دیکھی گئی کہ اردو میں قبول کرانے کے بعد عربی میں ''زوجت'' اور'' قبلت'' کے الفاظ کہلائے جاتے ہیں ، جس کی ضرورت نہیں ، اور اکثر تو ان الفاظ کو کہنے والا شخص اس کے معنی سے بھی واقف نہیں ہوتا ، پھر بھی اس کی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک نکاح کے لئے صریح الفاظ کا ہونا ضروری ہے ، تو جو الفاظ قرآن و حدیث میں نکاح کے لئے استعمال ہوئے ہیں ، ان ہی کو صریح سمجھا جائے ، اور وہ کہلوائے جائیں ، لیکن بہت سی دفعہ ''نکحت'' اور ''قبلت'' کے لفظ کو تین بار کہلایا جاتا ہے ، شاید ان قاریانِ نکاح کے ذہن میں یہ ہے کہ جیسے تین بار طلاق دینے سے طلاق اپنی انتہاء اور انجام کو پہنچ جاتی ہے ، اسی طرح تین بار قبول کرانے سے نکاح مکمل اور تام ہوتا ہے۔

پھر ایجاب وقبول کے وقت ایک بات جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے اور تہذیب و شرافت کے خلاف محسوس ہوتی، وہ یہ ہے کہ مرد سے کہلایا جاتا ہے کہ فلاں لڑکی کو میں نے اپنی ذات اور اپنے نفس کے لئے قبول کیا، حالاں کہ جب لڑکی کے ولی نے کہا کہ میں نے فلاں لڑکی کو آپ کے نکاح میں دیا تو اس کا یہ کہنا کافی ہے کہ میں نے قبول کیا، نفس اور ذات کی صراحت کی چنداں ضرورت نہیں، اسی لئے فقہاء نے بھی قبول کے لئے ''قبلت'' (میں نے قبول کیا) کے لفظ کو کافی سمجھا ہے۔

ایک مرحلہ لڑکی سے اجازت لینے کا بھی ہے، ولی دو محرم رشتہ داروں کے سامنے لڑکی سے اجازت حاصل کرسکتا ہے، عین نکاح کے وقت ہی یہ اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں، اگر پہلے ہی سے اجازت لے لیں تو یہ بھی کافی ہے، لیکن بعض اوقات نکاح کے وقت ہی اجازت لینے کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور قاریٔ نکاح کو بھی ساتھ لے جایا جاتا ہے، اس سے بدنگاہی کی نوبت آتی ہے، اور خاص کر ایسے وقت میں جب کہ خود عاقدہ اور اس کے گرد عورتیں آراستہ اور پیراستہ حالت میں ہوتی ہیں، اگر قاریانِ نکاح علماء ہوں، شریعت کے احکام اور حدود سے واقف ہوں، ایجاب وقبول اور اجازت کے مسائل پر ان کی نظر ہو، تو ایسی غلطیاں پیش نہ آئیں، بلکہ وہ عربی خطبہ کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں خطبہ کی تفہیم بھی کر سکتے ہیں، نکاح کے مقاصد اور نکاح کی بنیاد پر عائد ہونے والے حقوق و واجبات اور عاقدین کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں پر روشنی بھی ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح سماج کی بہت سی برائیاں دور ہوسکتی ہیں۔

قرآن مجید کی ان ہدایات سے معلوم ہوا کہ معاملات کی دستاویز لکھنے والوں کو خشیت الٰہی اور تقوی کا حامل بھی ہونا چاہئے، اسی کو قرآن نے ''عدل'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، تاکہ اس کی تحریر میں سچائی اور ناطرفداری ہو، وہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں لکھ دے جو طے شدہ امور کے برخلاف کسی فریق کے حق میں اور کسی کے خلاف جاتی ہو، اس نے اپنے دل میں کوئی چور نہ چھپا رکھا ہو، ابھی گذشتہ دنوں حیدرآباد اور پھر ممبئی میں 'کنٹراکٹ میریج' کے جو واقعات پیش آئے ہیں اور ان واقعات میں بعض قاریانِ نکاح کا جو کردار منظر عام پر آیا ہے، اس

سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس قدر خدا کے خوف سے عاری ہوکر اور مادّی ہوس میں مبتلا ہوکر نکاح کے نام پر بدکاری کا راستہ کھولا گیا ہے، اور چند اشخاص نے پورے طبقہ کو بدنام کیا ہے۔

ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ نکاح نامہ پر عاقدین کے پتے صحیح طور پر درج نہیں ہوتے، ایسی بے توجہی اس وقت پریشانی اور دشواری کا باعث بن جاتی ہے جب عاقد کا تعلق بیرونِ ملک یا بیرونِ ریاست سے ہو، اگر لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، تو وہ اپنے شوہر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے میں بہت دقت محسوس کرتی ہے اور چاروناچار اسے اپنی مظلومیت پر صبر کرلینا پڑتا ہے۔

ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ بعض خواتین جن کے شوہر لاپتہ ہوگئے ہیں یا بیرونِ ملک کے ہیں اور انھوں نے بیوی سے کوئی ربط نہیں رکھا ہے، نکاح پڑھانے والے قاضی حضرات نے انھیں اپنی طرف سے فسخ نکاح کی ڈگری لکھ کر دے دی، اور ان کا نکاح پڑھادیا، نیز یہ بات محتاجِ اظہار نہیں کہ ایسی بے کس اور مجبور خواتین سے ایسے کاموں کی اجرت بھی وصول کی جاسکتی ہے، یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ اور ناروا عمل ہے، نکاح تین ہی صورتوں میں ختم ہوسکتا ہے، یا تو شوہر کی وفات ہوجائے، یا شوہر طلاق دے دے، خواہ عورت کے مطالبہ پر اور معاوضہ ادا کرنے پر، جس کو فقہ اسلامی میں ''خلع'' کہتے ہیں، یا بطورِ خود، تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا سبب پایا جائے جس کی وجہ سے بیوی کو مطالبۂ تفریق کا حق حاصل ہوتا ہے اور قاضی شریعت معاملہ کی تحقیق کے بعد اصولِ شرع کی روشنی میں نکاح فسخ کردے، قاضی شریعت سے مراد یا تو مسلم حکومت کا وہ قاضی ہے جسے سلطان نے قضا کی ذمہ داری سونپی ہو، یا غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں نے کسی شخصیت کی امارت پر اتفاق کیا ہو، اور وہ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو حل کرنے کے لئے قاضی مقرر کرے، اور اگر کسی کی امارت پر تمام لوگوں کا یا جمہور کا اتفاق نہ ہوسکے تو کسی شخص پر بحیثیتِ قاضی ہی مسلمان مجتمع ہوجائیں، اب اس کو مسلمانوں کے ایسے معاملات کو فیصل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

علامہ ابن ہمامؒ، ابن قاضی سماوۃؒ، علامہ ابن نجیم، شامیؒ کے یہاں اس سلسلہ میں قرطبہ

وغیرہ کی مسلمان اقلیت سے متعلق صراحتیں موجود ہیں، یہ اس لئے ضروری ہے کہ قاضی کو فسخ وتفریق کا فیصلہ کرنے کا حق امیر کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، جس کو پوری امت پر ولایتِ عامہ حاصل ہوتی ہے، اور اسی بنیاد پر وہ قاضی کو ایسے معاملات میں فیصل کرنے کا حق دیتا ہے، اگر امیر نہ ہو اور مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد باہمی رضامندی سے کسی کو قاضی مقرر کرلیں، تو اس اتفاقِ رائے کی وجہ سے اسے ولایت حاصل ہوجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو حضرات نکاح پڑھانے پر مامور ہیں، ان کو مجازاً عرفِ عام میں 'قاضی' کہہ دیا جاتا ہے، ورنہ حقیقت میں فقہی اصطلاح کے مطابق وہ قاضی نہیں ہیں اور عام طور پر ان میں اتنی استعداد بھی نہیں ہوتی کہ قضاء جیسی نازک ذمہ داری کو ادا کرسکیں اور اصولِ شرع کی روشنی میں مقدمات کو سمجھیں اور فیصل کریں، ان کا بطورِ خاص کسی عورت کو فسخ نکاح کی تحریر لکھ کر دے دینا اور دوسرا نکاح کردینا بہت بڑی جسارت ہے، اس لئے یہ نہایت ہی زیادتی کی بات ہے، ایسی باتوں سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، نہ اس کے دوسرے نکاح کا جواز پیدا ہوتا ہے اور اس طرح وہ نادانستہ گناہ میں مبتلا رہتی ہے، اس طرح کے واقعات کا پیش آنا ظاہر ہے کہ کم علمی اور دیانت کی کمی کے باعث ہے، اور ایسے واقعات کی روک تھام ضروری ہے۔

موجودہ حالات کے تناظر میں مہر کے سلسلہ میں بھی بعض امور قابل توجہ ہیں، عام طور پر مہر روپیہ کے ذریعہ مقرر کیا جاتا ہے اور روپیہ کی قدر آئے دن گھٹتی رہتی ہے، اگر کسی عورت کا مہر تیس سال پہلے دس ہزار روپیہ تھا، تو اس وقت تو وہ دس تولہ سونے کے مساوی تھا، لیکن آج اگر اسے دس ہزار روپئے دیئے جائیں تو اس میں ڈیڑھ تولہ سونا بھی حاصل نہیں ہوسکے گا، پھر بھی دکن کے نکاح نامہ میں دینارِ سرخ اور دینارِ شرعی کی شق رکھنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مہر کا کچھ حصہ اکثر لوگ سونے میں مقرر کردیتے ہیں، لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ پورا مہر ہی سونا میں مقرر کرنے کی ترغیب دی جائے، اور اس سلسلہ میں نکاح پڑھانے والے حضرات بہت اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

جو مہر فوری ادا طلب نہ ہو، بلکہ دیر سے ادا طلب ہو، ان کو مہر مؤجل کے خانہ میں لکھ دیا

جاتا ہے، سماجی بگاڑ کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا مہر لوگ اپنے ذمہ واجب الادا ہی نہیں سمجھتے اور مہر کی ادائیگی کا مسئلہ یا تو اس وقت سامنے آتا ہے جب خدانخواستہ طلاق اور علاحدگی کی نوبت آئے، یا شوہر کی موت ہوجائے، بلکہ اب تو شوہر کی وفات کے بعد ورثہ اس کے ترکہ میں سے بھی مہر ادا نہیں کرتے اور اسے دین ہی نہیں سمجھتے ہیں، اس لئے بہتر صورت یہ ہے، بلکہ اصل شرعی اصول بھی یہی ہے کہ مہر مؤجل میں ''اجل'' یعنی تاریخ ادائیگی درج کرائی جائے، تا کہ شوہر کو استحضار رہے کہ اسے مہر ادا کرنا ہے، اور عورت بھی اس سے تقاضہ کر سکے، ورنہ مہر جیسی اہم ذمہ داری جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی شخص نکاح میں مہر مقرر بھی کرے، لیکن دل میں ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو ایسا شخص بدکار ہے'' کی طرف سے غفلت و بے توجہی عام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نکاح کا رکارڈ محفوظ کرنا ایک مفید عمل ہے، لیکن یہ ایک اہم ترین ذمہ داری ہے، اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے علم بھی ضروری ہے اور دیانت وتقویٰ بھی، اور یقیناً نکاح پڑھانے والے بہت سے لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں، لیکن اس شعبہ میں بڑے اصلاح کی اور اس کو زیادہ معیاری بنانے کی ضرورت ہے، ورنہ نفع کے ساتھ بڑی مضرت اور مصالح کے ساتھ بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے۔

۲۷/ جمادی الاولی ۱۴۲۴ھ ۱۶/ جولائی ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

خواندگی — اہمیت اور طریقۂ کار

۸/ستمبر کی تاریخ گذر چکی ہے، اس تاریخ کو عالمی سطح پر یومِ خواندگی (LitraryDay) منایا جاتا ہے، اس کا مقصد لوگوں کو خواندگی کی طرف متوجہ کرنا ہے، خواندگی کے معنی لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے ہیں، عام طور پر اقل ترین تعلیمی صلاحیت کے لئے یہ الفاظ بولا جاتا ہے، خواہ کوئی سند نہ ہو اور سند کے درجہ کی تعلیم نہ ہو، لیکن اسے لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا آتا ہو، تو اسے خواندہ شمار کیا جاتا ہے، ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح پڑوسی ملک سے گو زیادہ ہے، لیکن ترقی یافتہ ممالک اور بہت سے ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں بھی ملک خواندگی میں بہت پیچھے ہے، ۱۹۹۶ء میں اقوامِ متحدہ کا Human Devlopment Index جو شائع ہوا ہے، اس میں ۱۷۴ ترقی پذیر ممالک میں ہندوستان کا نمبر ۱۳۵واں ہے اور پوری دنیا میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد ڈیڑھ ارب ہے، جن میں چالیس فیصد لوگ ہندوستان میں ہیں، گویا پوری دنیا کے ناخواندہ لوگوں میں سے قریب قریب نصف آبادی ہندوستان میں بستی ہے، اس لئے ہمیں خواندگی پر خصوصی توجہ دینے اور جنگی سطح پر مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے مقابلہ انسان کو جو امتیازی صلاحیت عطا فرمائی ہے، ان میں سب سے اہم پڑھنے کی صلاحیت ہے، پڑھنے کا تعلق دماغ سے بھی ہے، زبان و بیان سے بھی، لکھنے سے بھی اور ہاتھ سے بھی، حروف ونقوش کی ایجاد کا سہرا دماغ کے سر ہے، کس آواز کو کیا نام دیا جائے؟ کس کو ''ب'' کہا جائے اور کس کو ''ت''؟ کس آواز کو ''F'' اور کس کو ''S'' سے؟ پھر دماغ جو کچھ سوچتا ہے، زبان اس کو بیان کرتی ہے، ہاتھ کے ذریعہ خیالات اور گفتگو الفاظ کے پیکر میں ڈھلتے ہیں، پھر آنکھ ان کو پڑھنے میں مددگار ہوتی ہے، انسان کے جسم میں تعلیم وتعلّم کا جو نظام قائم ہے، وہ اس کا امتیاز ہے، دنیا کی بہت سی مخلوقات وہ ہیں جو تکلم اور آواز کی نعمت سے محروم ہیں، بعض کے پاس آواز تو ہے، لیکن نہ اس میں تنوع ہے اور نہ اس سے

اس طرح کے حروف پیدا ہوتے ہیں، جو اپنے الفاظ کو کاغذ اور پتھر کی زینت بنا سکے اور انھیں نقوش اور نگارش کے دائرہ میں لا سکے، نہ کسی مخلوق کو قلم اور دوات سے کوئی تعلق ہے، غور کیجئے تو یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عظیم الشان نعمتیں ہیں، جو انسان کو اشرف المخلوقات اور فرشتوں کا مسجود بنانے کا سبب ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہ نعمتیں عطا ہوں، اور وہ ان کا صحیح استعمال نہیں کرے، یا انھیں کام میں نہ لائے، یہ نعمت کی ناقدری اور اللہ تعالیٰ کی ناشکری میں داخل ہے، اس لئے ضرورت کے لحاظ سے تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض قرار دیا گیا اور لکھنے پڑھنے اور اس سے متعلق امور کی حوصلہ افزائی کی گئی، قرآن مجید کی نگاہ میں علم کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علم کی ترغیب، لاعلمی کی مذمت، اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان اور مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید میں ۷۸۵/ دفعہ علم کا ذکر آیا ہے، اور مختلف انداز پر ۱۹/ جگہ قرأت یعنی پڑھنے کا تذکرہ ہے، ۴/ جگہ قلم کا ذکر آیا ہے، جو تعلیم و تعلّم کا سب سے قوی ذریعہ و وسیلہ ہے، بلکہ قرآن مجید میں قلم کی قسم کھائی گئی ہے اور ایک سورت کا نام ہی قلم رکھا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اسلام میں قلم اور لکھنے کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ رسول اللہ ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں دو دفعہ پڑھنے کا حکم ہے، تین دفعہ علم کا تذکرہ ہے اور ایک بار اس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ قلم علم کا ذریعہ ہے، پیغمبر اسلام ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو کتابِ ہدایت کا نام بھی دیا جا سکتا تھا، دوسرے نام بھی ہو سکتے تھے، چنانچہ مختلف صفاتی ناموں سے اس کا ذکر آیا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس کتاب کو جس نام سے موسوم کیا گیا وہ قرآن ہے، جس کے معنی بار بار پڑھی جانے والی کتاب کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کتاب کو وہی لوگ پڑھ سکتے ہیں، جو خواندہ ہوں، ناخواندہ شخص کیسے قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے؟ اس لئے اس کتاب کو قرآن کہنا ہر مسلمان کو خواندگی کی طرف متوجہ کرنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے، کہ حسبِ سہولت قرآن کو پڑھا کرو ''فَاقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ '' یہ حکم خواندگی کے حکم کو بھی شامل ہے، کیوں کہ جو شخص پڑھا ہوا نہ ہو وہ کیسے قرآن مجید پڑھ سکتا ہے؟

پیغمبر اسلام ﷺ پر جب اللہ کا کلام نازل ہوا، تو اس وقت جزیرۃ العرب میں کون سی برائی موجود نہیں تھی؟ ظلم تھا، لاقانونیت تھی، شرک تھا، بدامنی تھی، خود فراموشی اور خدا فراموشی تھی، لیکن قرآن وحدیث میں اس عہد کو جو نام دیا گیا ہے، وہ ہے جاہلیت، یعنی یہ دورِ جہالت اور علم ومعرفت سے محرومی کا دور تھا، کیوں کہ جہالت تمام برائیوں کی جڑ اور علم تمام برائیوں کے تدارک کا ذریعہ ہے، اس لئے قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ علم رکھنے والے اور علم سے محروم لوگ برابر نہیں ہوسکتے، لاَ یَسْتَوِي الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لاَیَعْلَمُوْنَ، (زمر:۳۹) یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے، بلکہ تمام ہی مذاہب میں تعلیم اور علم کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور جہالت و نا آگہی کو انسان کے لئے ایک لائق شرم بات سمجھی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب نبی بنائے گئے تو مکہ میں صرف ۱۳ اور مدینہ میں ۱۱ آدمیوں کو لکھنا آتا تھا، لیکن آپ ﷺ کی برکت سے نوشت وخواند کا ایسا رواج ہوا ہے کہ صرف کاتبین وحی کی تعداد ۴۳ تک ذکر کی جاتی ہے، دوسرے لکھنے والے لوگ اس کے علاوہ ہیں، آپ ﷺ نے خواندگی کو عام کرنے کے لئے غیر مسلم حضرات سے بھی تعاون حاصل کیا، اور غزوۂ بدر کے قیدیوں میں جن لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، ان کے لئے یہی فدیہ مقرر ہوا کہ وہ دس افراد کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اس کوشش کو ''خواندگی مہم'' سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حکومت اپنے طور پر خواندگی کا تناسب بڑھانے کے لئے کوشاں ہے اور ہندوستان کی بعض ریاستوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں خواندگی کا تناسب صد فیصد ہے، لیکن ملک میں صد فیصد خواندگی کا نشانہ حاصل کرنے کے لئے صرف حکومت کی کوششیں کافی نہیں، بلکہ عوامی سطح پر جد وجہد کرنا بھی ضروری ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی طرف خصوصی توجہ کرنا ضروری بھی ہے اور آسان بھی، ضروری اس لئے کہ مسلمانوں کی شرحِ خواندگی ملک کی عام شرحِ خواندگی کے مقابلہ بہت پیچھے ہے، ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق خصوصی سطح پر مردوں میں خواندگی کا تناسب ۱۳ء۶۴ فیصد اور خواتین میں ۲۹ء۳۹ فیصد ہے، سرکاری سطح پر مسلمانوں کی الگ شرح خواندگی کا کوئی رکارڈ ظاہر نہیں کیا گیا ہے، لیکن پرائیوٹ سروے رپورٹس سے

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان شرحِ خواندگی میں کافی پیچھے ہیں اور مسلم خواتین میں شرحِ خواندگی اور بھی کم ہے۔

یہ نہایت ہی افسوس ناک حقیقت ہے کہ جس امت کے پیغمبر پر پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم آیا اور جس کی مذہبی کتاب علم وقلم کے تذکرہ سے معمور ہے، وہی امت خواندگی میں سب سے پیچھے، اس صورتِ حال پر مسلمانوں کے زیر انتظام دینی اور عصری درس گاہوں، جماعتوں اور تنظیموں کو غور کرنے کی ضرورت ہے، اگر دوسرے دینی اور ملی کاموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ناخواندہ آبادیوں میں خواندگی مہم چلانے کا اہتمام کیا جائے اور منظّم اور مربوط طور پر اس کام کو انجام دیا جائے تو چند سالوں میں اس کے گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اپنی قوم سے صد فیصد ناخواندگی کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مسلمانوں کے لئے خواندگی مہم اس لئے آسان ہے کہ ہر مسلمان آبادی میں ایک مسجد اور مسجد کے ساتھ امام ومؤذن موجود ہے، یہ مسجد عبادت گاہ بھی ہے اور تعلیم وتربیت کا اجتماعی مرکز بھی، اور امام ومؤذن نماز کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مقتدیٰ اور رہنما بھی ہیں اور مسلمان بچوں اور بڑوں کے لئے معلم ومدرس بھی، اس طرح اگر ہر مسجد کے تحت خواندگی کی مہم چلائی جائے اور اس پوری آبادی کو اس مرکز سے مربوط کر دیا جائے، تو بہت ہی کم اخراجات میں اور نہایت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ مسلمانوں کو صد فیصد خواندہ بنایا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر اگر ایک مسجد کے تحت مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی مجموعی آبادی ۵۰۰ ہوتی ہے، تو اوّلاً یہ دیکھا جائے کہ اس میں کتنے لوگ تعلیم یافتہ ہیں، کتنے بچے باضابطہ تعلیم میں مشغول ہیں، اور کتنے لوگ کو الیفائڈ تو نہیں ہیں، لیکن خواندہ ہیں، ان تینوں طرح کے لوگوں کا نکاح کے بعد اگر ۲۵ فیصد، یعنی سوا سو مرد وعورت ناخواندہ قرار پاتے ہیں، تو ہر ۲۵ افراد کو ۳ ماہ میں خواندگی سکھائی جائے، اس طرح سوا سال کے عرصہ میں پوری مسلم آبادی خواندہ ہو سکتی ہے، اس تفصیل کے مطابق جماعتیں، تنظیمیں، دینی مدارس مسلمانوں کے زیر انتظام عصری درس گاہیں، اپنے اپنے حلقہ اور محلّہ کو ہدف بنا کر خواندگی کی مؤثر مہم چلا سکتے ہیں، اور اپنے معمول کے پروگرام میں خلل پیدا کئے بغیر امت کو

ناخواندگی کی رسوائی سے بچا سکتے ہیں۔

ضرورت توجہ، تنظیم اور منصوبہ بندی کی ہے یہ خواندگی مہم نہ صرف ہمیں جاہل مطلق ہونے سے بچائے گی، بلکہ اس کو اردو زبان کی ترویج واشاعت اور اپنی زبان کو زندہ اور باقی رکھنے کا ذریعہ بھی بنایا جاسکتا ہے، اور اس وقت اردو کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اس کو ہم ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رکھیں۔

۲۴/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ/ا/ستمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

بے برداشت نہ ہوں!

گذشتہ پارلیمنٹ الیکشن میں فرقہ پرست،فسطائی طاقتوں کی شکست نے ان کو بوکھلا کر رکھ دیا، اور وہ نفرت کی آگ سلگانے کے لئے نئے ایندھن کی تلاش میں ہیں ،بعض پڑوسی ریاستوں میں اسمبلی الیکشن کی آمد آمد ہے،اس لئے خاص طور پر ایسے موضوعات کی تلاش ہے، جو ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے،اور عوام کو دھوکہ دے کر اور بے وقوف بنا کر ووٹ حاصل کیا جائے، چنانچہ پچھلے دنوں مرہٹوارہ کے علاقہ میں مسجد میں بم اندازی کا بہت ہی تکلیف دہ واقعہ پیش آیا، اسی طرح کا واقعہ پارلیمنٹ الیکشن کے قریب بھی سامنے آیا تھا، اور فرقہ پرست طاقتوں نے اسی کا خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا تھا، اب دوبارہ یہی کوشش کی جارہی ہے ،لیکن مرہٹوارہ کے علماء، قائدین اور مسلمانوں کو داد دینی چاہئے کہ انھوں نے جوش پر ہوش کو ترجیح دی، جذبات پر حالات کو مقدم رکھا اور اس پر بند منانے اور سڑک پر احتجاج کرنے سے پوری طرح گریز کیا، یہ بہت ہی قابل تقلید اقدام ہے، اور ملک کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کو بھی اس سے سبق لینے کی ضرورت ہے ......اصل یہ ہے کہ بعض اوقات صبر اور برداشت خود ایک تدبیر ہوتی ہے، بظاہر اس میں جذبات مجروح ہوتے ہیں،لیکن درحقیقت اسی میں کامیابی مضمر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے، ایک یہود، دوسرے منافقین، یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی، اور منافقین بغلی دشمن تھے،عبداللہ ابن ابی ان کا سردار تھا، ابتداء اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا، بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے،مگر اسلام کے بعد عبداللہ بن ابی کا خواب پورا نہ ہوسکا، غالباً اس لئے بھی عبداللہ بن

ابی کے سینہ میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتش غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ ﷺ اپنے رفقاء ''مہاجرین اور انصار'' کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبداللہ ابن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا، اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اور انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخص کا نہ رہا، بلکہ دو جماعتوں — انصار و مہاجرین — کا اختلاف بن گیا، آپ ﷺ نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن عبداللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین و انصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد ﷺ اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری مثال عربی زبان کے اس محاورہ کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں کو کھا جائے ''سمن کلبک یأکلک'' پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی، ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبۂ ایمان کے تحت رسول اللہ ﷺ سے صحیح صورتِ حال عرض کر دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا، اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا، انھوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرا رہے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے براہ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی، اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی، انصار میں سے اکابر اور سر برآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار ہے؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی، بہر حال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہو گیا اور

بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ ﷺ نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، آپ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے، لیکن خلافِ معمول آپ ﷺ پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے، چلچلاتی ہوئی دھوپ، گرم ریت، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر بھی جاتا رہا، دراصل یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر آپ ﷺ نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا، تاکہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں۔

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبداللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آگیا، حضراتِ انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہوگیا، تو عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے —— جو مخلص مسلمان تھے —— اور ان کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، آپ ﷺ کی خدمت حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں، اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں، لیکن مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاید میں ان کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آپ ﷺ مجھے حکم فرمائیے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کردوں، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر صورتِ حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو سکتے تھے، اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور در پردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں، اور خود ان کا لڑکا اس کے قتل کے لئے تیار ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی اس دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی رائے میں برکت رکھی ہے ''بارک اللّٰہ في رأي رسوله''۔

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن

مجید نے ''صبر'' سے تعبیر کیا ہے، صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں، صبر یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے، اس لئے کہ اشتعال اور غیظ و غضب کی حالت میں انسان کی قوتِ فیصلہ کم یا ختم ہو جاتی ہے، اور فراست و دوانش مندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے ''لايقضي القاضي و هو غضبان'' کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دوررس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ ﷺ نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا، صلح حدیبیہ ہی کو دیکھئے: بظاہر صلح الف سے یا تک مسلمانوں کی امنگوں کے خلاف تھی، صلح نامہ لکھتے ہوئے ''بسم الله الرحمن الرحيم'' لکھا گیا، اہل مکہ کے نمائندہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ پر ''باسمک اللهم'' لکھنا پڑے گا، اسے قبول کرلیا گیا، آپ ﷺ کا اسم گرامی ''محمد رسول اللہ ﷺ'' لکھا گیا، دوسرے فریق نے ''رسول اللہ'' کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ ﷺ اس پر بھی تیار ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برداشت نہ ہو سکا، اور وہ کلمۂ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے خود محو فرما دیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے، یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام

کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں، یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار رکھنا یہ بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا، اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جارہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ ﷺ نے منظور فرمایا، اکثر صحابہ ؓ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمر ؓ سے تو برداشت نہ ہوسکا اور انھوں نے آپ ﷺ سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لئے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے، جب آپ ﷺ نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی ''فتح مبین'' قرار دیا، (فتح:۱) دراصل آپ ﷺ کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح وشام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کو معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف ودہشت کی فضاء میں کھل کر دعوتِ اسلام کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا، آپ ﷺ کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی، اور جن لوگوں کو میدانِ جنگ میں فتح نہیں کیا جاسکا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب واذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کے رفقاء کم وبیش چودہ سو تھے، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ ﷺ نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغازِ نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سوا ڈیڑھ

لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوا لاکھ کے قریب تو خود آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دی تھی۔

آپ ﷺ کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالت سے گزر رہے ہوں، وہ سیاسی اور افرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصاً، اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں، جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ وغضب پر صبر اور خوش تدبیری اور مناسب موقع ومحل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک کر اٹھائیں، ایسا ردِعمل نہ کریں جو خودکشی کے مترادف ہو، اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے، یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہو جانا فرقہ پرستوں کی بڑی کامیابی، اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت ہے اور حقیقت میں فتح مبین!!

یکم شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ ۱۷/ستمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

یہ آپ کے محسن ہیں!

رمضان المبارک کی اصل عبادت تو روزہ ہے، لیکن چوں کہ یہ کتابِ الٰہی کے نزول کا مبارک جشن ہے، اس لئے خالق کائنات کا دریائے لطف وکرم اس ماہ میں خاص طور پر موجزن ہوتا ہے اور ہر عبادت اور نیک عمل کی پذیرائی اور اس کے اجر وثواب میں اضافہ ہوجاتا ہے، فرض ہو یا نفل اور بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت، نماز کے بارے میں حدیث میں صراحت موجود ہے، انفاق کی بھی خصوصی فضیلت آپ ﷺ نے فرمائی، عمرہ کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان المبارک کا عمرہ حج کرنے کے برابر ہے، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے عمومی بات بھی ارشاد فرمائی کہ رمضان میں نفل عبادتوں کا اجر فرض کے برابر اور فرض عبادتوں کا اجر دوسرے مہینوں کے مقابلہ ستر گناہ زیادہ ہے۔

اسی نسبت سے عام طور پر لوگ اپنی زکوۃ بھی ماہِ رمضان المبارک میں ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور یہ اہتمام بعض صحابہ ؓ سے بھی ثابت ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جب کوئی عمل انسان کے ذمہ فرض ہوجائے تو اس کو کسی مخصوص زمانے کے لئے روک رکھنا مناسب نہیں، کیا یقین ہے کہ اس وقت تک وہ زندہ ہی رہے اور کیوں کر اطمینان کیا جاسکتا ہے کہ آئندہ وہ زندہ بھی رہے تو اس پر فریضہ کو ادا کرنے کے لائق بھی باقی رہے، اس لئے اگر رمضان المبارک سے پہلے فرض ہوجائے اور زکوۃ کی ادائیگی کا وقت آجائے تو بر وقت زکوۃ ادا کردینی چاہئے، رمضان کا انتظار کرنے کے مقابلہ اس میں زیادہ اجر وثواب ہے، کیوں کہ عبادت کے فرض ہونے کے بعد اس میں عجلت اور سبقت مطلوب ہے، البتہ اگر رمضان ہی میں زکوۃ کی ادائیگی فرض ہوئی یا پہلے ادا نہیں کر پایا اور ماہِ مبارک آگیا تو اس مہینہ میں ادا کرلینا بہتر ہے، اسی طرح زکوۃ میں ایک خصوصی سہولت قبل از وقت ادا کرنے کی بھی ہے، لہٰذا آنے والے دنوں کی زکوۃ پیشگی ادا کرلی جائے تو یہ بہتر اور باعثِ اجر وثواب ہے۔

چوں کہ عام طور پر زکوۃ رمضان میں ادا کی جاتی ہے، اس لئے اس مہینہ میں مستحقین اور ضرورت مندوں کا ہجوم بلکہ بعض اوقات ''یلغار'' کی نوبت بھی آتی ہے، ان میں کچھ تو پیشہ ور سڑک چھاپ بھکاری ہوتے ہیں، انھیں دستِ سوال پھیلانے میں کوئی عار نہیں، بلکہ ان کے لئے یہ ایک خوشگوار کام اور آسان ذریعۂ معاش ہے، ایسے بھلے چنگے، صحت مند، جوان اور نوعمر بھکاریوں اور بھکارنوں کو زکوٰۃ دینا زیادہ مفید نہیں، کیوں کہ اس سے ان کی گداگری کی خو کو تقویت پہنچتی ہے اور غیرت مند و خوددار محتاج و مستحقین لوگ محروم رہ جاتے ہے، اس لئے اگر شخصی طور پر کسی کو زکوۃ دینی ہو تو ان لوگوں کا انتخاب کرنا چاہئے جنھیں ان کی غیرت ہر جگہ ہاتھ پھیلانے اور ہر شخص کے سامنے زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتی، دوسری شکل اداروں کو زکوۃ ادا کرنے کی ہے، ان کو اور خاص کر دینی مدارس کو زکوۃ دینا افضل ہے، کیوں کہ اس طرح زکوۃ سے ضرورت مندوں کی حاجت برآئی ہی نہیں ہوتی بلکہ اسلامی کاز کو بھی تقویت پہنچتی ہے اور دین کی حفاظت واشاعت کی خدمت سرانجام پاتی ہے، دوسرے زکوۃ میں بھی افضل طریقہ یہی ہے کہ اس کا کوئی اجتماعی نظام قائم ہو، ادارے اجتماعی نظام کی ضرورت کو مکمل طور پر تو پورا نہیں کرتے، لیکن ایک حد تک یہ نظم قائم ہوتا ہے، کیوں کہ زکوۃ وصول کر کے افراد واشخاص کے ایک مجموعہ پر ادارہ کی طرف سے خرچ کیا جاتا ہے، اور اجتماعی نظام کا جو مقصود ہے کہ ضرورت مندوں کو ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے اور باعزت طریقہ پر ان کی ضروریات پوری ہو جائیں، بڑی حد تک اس مقصد کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں تحریکِ مدارس کی بنیاد یہ بنائی گئی کہ قوم سے پیسہ لے کر قوم ہی پر ان کو خرچ کیا جائے اور انھیں دینی تعلیم کے سلسلہ میں خود مکتفی رکھا جائے، مدارس کی مالی ضروریات کے سلسلہ میں اس اصول کے بہت سے فوائد ہیں، لیکن دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: اول یہ ہے کہ اس سے قوم میں اپنی دینی ضروریات کو آپ پوری کرنے کا مزاج پیدا ہوگا اور کسی باعزت قوم کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اس کا دوسروں پر انحصار نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا اپنا تعلیمی نظام نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو دینی تعلیم کے نظام ہی کو ختم کر دیا

جائے اوراس کا نقصاندہ ہونا ظاہر ہے، یا اسے حکومت کے تعاون سے پورا کیا جائے، بظاہر یہ صورت بہتر نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ طریقۂ کار پہلی صورت سے کم نقصاندہ نہیں، کیوں کہ حکومت جب کسی چیز میں تعاون کرتی ہے تو بتدریج اس کے فکری اور عملی نہج پر اثر انداز بھی ہوتی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص یا ادارہ تعاون تو دے لیکن اس کا عوض وصول نہیں کرے؟

ہندوستان تو سیکولر ملک ہے اور یہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، لیکن خود مسلم ممالک میں گورنمنٹ کے زیر اہتمام دینی مدارس کا جو حشر ہوا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک اور آنکھیں کھول دینے والا ہے، مصر وشام، عراق اور لیبیا، تیونس اور الجزائر میں بھی اسلامی جامعات موجود ہیں، حکومت نے ان کے نصاب اور نظام کو ایسی صورت دے دی ہے کہ باصلاحیت اور ذی استعداد علماء تو آپ کو یہاں مل جائیں گے لیکن ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کی متاعِ گرانمایہ آپ کو یہاں کم ہی ہاتھ آئے گی، اسلام کے خلاف کیسے بھی فتنے اٹھیں، مغرب کی طرف سے جتنی بھی تہذیبی یلغار ہو، ان درسگاہوں کے فضلاء کو اس سے کوئی خاص غرض نہیں، وہ سرکار کا کھاتے ہیں، سرکار سے پاتے ہیں، سرکار سے ملازمتیں حاصل کرتے ہیں اور سرکار کے لئے جیتے ہیں، حکومت کے چشم وابرو کے اشاروں کو نظر انداز کرنا ان کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے اور حکومت ہر طرح کا فتاویٰ اس سے صادر کراتی ہے اور اپنے ہر بجا و بے جا عمل پر ان کی مہر تصدیق ثبت کراتی چلی جاتی ہے۔

اس کے برخلاف آپ ہندوستان کے مدارس اور دینی جامعات کو دیکھئے، کیسی کیسی ابتلائیں اور آزمائشیں آئیں؟ امتحان کی بھٹیاں سلگائی گئیں، الزامات کے طوفان برپا کئے گئے، لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ علماء کے پائے استقامت میں زلزلہ آیا ہو، انھوں نے دار ورسن کو آباد کیا، قید وبند کی صعوبتیں گوارہ کیں، جھوٹی بدنامی اور بہتان طرازی کو برداشت کیا، مالی دقتیں اٹھائیں، لیکن شریعت کے احکام اور امت کے مفاد پر کسی قیمت پر کسی سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں ہوئے اور حکومت کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہوسکی کہ وہ ان کے منہ میں اپنے الفاظ ڈال سکیں، جب بھی

اسلام کے خلاف کوئی فتنہ اٹھا، مدارس کے فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے اس طرح کود پڑے جیسے کوئی شخص اپنے گھر اور جان کے بچاؤ کے لئے حرکت میں آجاتا ہے۔

یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ یہ اسی آزاد نظامِ تعلیم کا ثمرہ ہے، کیوں کہ جب مدارس حکومت سے مال حاصل نہیں کریں گے تو ان کے دباؤ کو بھی قبول نہیں کریں گے، جب وہ پانچ پانچ اور دس دس روپیوں کے لئے قوم کے پاس جائیں گے اور ان سے تعاون وصول کریں گے تو ان میں امت کے سامنے جواب دہی کا احساس رہے گا اور وہ حفاظتِ اسلام اور اشاعتِ اسلام کے فریضہ کو حق شناسی کے ساتھ ادا کریں گے، کوئی حکومت یا ایجنسی ان کا سودا نہیں کر سکے گی، اس لئے مدارس کے نظام کو اسی طریقہ پر قائم رکھنا ضروری ہے۔

رمضان المبارک کے مہینہ میں مدارس کے سفراء کی بڑی تعداد بڑے شہروں اور تجارتی مراکز کا رخ کرتی ہے، اس سلسلہ میں ایک ذمہ داری تو امت کے ان اہم شخصیتوں کی ہے جو ان مدارس کی تصدیق وتوثیق کرتے ہیں، اداروں کے لئے تصدیق نامہ جاری کرنا شہادت اور گواہی ہے، اس لئے محض تعلقات اور مروّت میں خلافِ واقعہ تصدیق گناہِ کبیرہ ہے، ہونا یہ چاہئے کہ اداروں کو دیکھ کر یا اپنے نمائندہ کے ذریعہ معائنہ کرا کر یا ایسے لوگوں یا اداروں کے تصدیق ناموں کے حوالہ سے تصدیق جاری کی جائے جن کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ مناسب تحقیق کے بعد ہی اداروں کی تصدیق کرتے ہیں، اسی طرح خود مدارس کا بھی فریضہ ہے کہ وہ اعداد وشمار کے سلسلہ میں راست گوئی اور سچائی سے کام لیں، اساتذہ وطلبہ کی تعداد، یہاں تک کہ شعبہ جات اور شاخوں کی تعداد میں بھی بعض اوقات ایسے مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے کہ سچائی کو شرمسار ہونا پڑتا ہے، یقیناً تمام ادارے ایسا نہیں کرتے، لیکن جو ادارے یہ روش اختیار کرتے ہیں انھیں سمجھنا چاہئے کہ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد اٹھ جاتی ہے۔

مسلمان اہل خیر کو چاہئے کہ وہ ایسے اداروں کو ترجیح دیں جن سے یا تو براہِ راست واقف ہوں یا ان کے بارے میں مصدقہ اطلاعات فراہم ہوں، اور پھر ان اداروں کے

نمائندوں کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کریں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تمہارے پاس جو زکوٰۃ وصول کرنے والا آئے، وہ تمہارے پاس سے اس طرح واپس جائے کہ وہ تم سے راضی ہو، (مسلم، حدیث نمبر: ۹۸۹) ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اگر زکوٰۃ وصول کرنے والے زیادتی کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم انھیں راضی رکھو گو ان کی طرف سے زیادتی ہو'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۵۸۹) حضرت جبیر بن عدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے آئیں تو ان کو خوش آمدید کہو......اور انھیں خوش رکھو، اس لئے کہ تمہاری زکوٰۃ کی تکمیل ہی یہ ہے کہ وہ تم سے خوش رہیں ''فإن تمام زكاتكم رضاهم''۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۵۸۸)

زکوۃ وصول کرنے والے کا درجہ ومقام واضح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ صحیح طریقہ پر زکوۃ وصول کرنے والا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے، تا آنکہ وہ اپنے گھر واپس آجائے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۹۳۶) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو وصولی زکوۃ کی خدمت پر مامور فرمایا، انہی عاملین میں سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ہیں، زکوۃ وصول کرنے والوں کے لئے یہ اجر بتایا گیا کہ وہ اس عمل میں بہت سی خلافِ طبیعت باتوں کو برداشت کرتے اور لوگوں کی تحقیر اور اعراض کو گوارہ کرتے ہیں اور دوسری طرف غربا اور مستحقین کی ضروریات کی تکمیل کا باعث بھی بنتے ہیں، اس لئے ان کو راضی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ سفراء اور نمائندے ہمارے محسن ہیں، ہماری ذمہ داری تھی کہ جہاں ضرورت مند اور مستحق ادارے ہوں وہاں اپنی مدد پہنچائیں، پورے ملک میں بلکہ اپنی ریاست اور اپنے شہر میں بھی مستحق اداروں تک پہنچنا کوئی معمولی اور آسان بات نہیں ہے، ان حضرات کی آمد اس دشواری کو آسان بناتی ہے اور گھر بیٹھے آپ کی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے، اس لئے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہئے اور ان کی قدر کرنی چاہئے۔

انھیں جھڑکیاں دینا، ان سے ڈانٹ ڈپٹ کر گفتگو کرنا، خواہ مخواہ بار بار بلانا، دینے کی

نیت نہیں ہو؛ لیکن محض ٹالنے کے لئے دوبارہ اور سہ بارہ آنے کے لئے کہنا قطعاً نامناسب بات ہے، اور عین ممکن ہے کہ اس سے آپ کا اجر ضائع ہو کر رہ جائے، آپ خود سوچیں کہ یہ کتنا بڑا نقصان ہے، آپ نے پیسے بھی خرچ کئے اور اجر سے بھی محروم رہے، سہی طریقہ یہ ہے کہ آپ ان آنے والوں کا استقبال کریں، ان کے ساتھ بہتر گفتگو کریں، ان کی بات توجہ سے سنیں ، اگر آپ کو ان کی بات پر بھروسہ ہو اور تعاون کرنے کا ارادہ ہو تو فوری طور پر تعاون کریں یا کسی مناسب وقت میں بلالیں اور ٹال مٹول سے کام نہیں لیں اور اگر تعاون کرنے کے موقف میں نہیں ہوں یا اس ادارہ کے بارے میں اطمینان نہ ہو تو معذرت کردیں، اور سفراء کو بھی چاہئے کہ الحاح سے کام نہ لیں، جب آپ اپنی ذات کے لئے چندہ جمع نہیں کرتے، خدمتِ دین کے جذبہ سے کرتے ہیں تو پھر الحاح کرنے اور عزت کھونے کا کیا فائدہ ہے؟ نہ اللہ اپنے دین کے لئے اس کا محتاج ہے اور نہ آپ پر اپنی تحقیر گوارہ کرتے ہوئے کسی طرح رقم وصول کر لینا واجب ہے!

۷/ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

جرائم — مسئلہ اور حل

حقیقت یہ ہے اس وقت ہمارے ملک میں دو چیزیں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں: ایک گرانی اور دوسرے جرائم، حد یہ ہے کہ جو لوگ نفرت کی آگ لگانے اور شعلہ بھڑکانے میں قیادت کے منصب پر فائز ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ان کا خصوصی سایۂ عاطفت حاصل ہے، ان کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے، چنانچہ بی جے پی قائد اور ملک کے سابق وزیر داخلہ نے بھی جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان پر سخت تشویش ظاہر کی ہے، انھوں نے اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ جبری عصمت ریزی کے مجرم کو پھانسی کی سزا دی جانی چاہئے، اسکولوں اور مخلوط تعلیم گاہوں میں لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پس منظر میں دہلی کی سابق بی جے پی گورنمنٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسکرٹ کے بجائے یونیفارم میں شرٹ، شلوار اور دوپٹہ کو لازم قرار دیا جانا چاہئے، ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب مذہبی شخصیتوں کا بھی جرائم کی دنیا میں نام آرہا ہے، دراصل گزشتہ چند سالوں سے ملک اور ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جرائم کے اعداد و شمار کی جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں کہ کس طرح جرائم کی روک تھام کی جائے؟ اور ان حضرات نے اس روک تھام کے لئے جن تدابیر کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل اسلام کے تصور جرم و سزا اور طریقۂ اصلاح کا خاموش اعتراف ہے!

پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے، وہ نہایت جرائم پیشہ سماج تھا، چوری، ڈاکہ زنی، قتل ناحق، دختر کشی، اخلاقی اور سماجی برائیاں، کون سے جرائم تھے جو وہاں بکثرت نہ ہوتے تھے؟ شراب جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، وہ لوگوں کی گھٹی میں پڑی تھی، زمانۂ جاہلیت میں شراب کے قریب سو نام ملتے ہیں، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کم سے کم سو قسم کی شراب اس زمانے میں پائی جاتی تھی، قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کا حال یہ تھا کہ لوگ قافلہ کے بغیر تنہا ایک دو آدمی سفر کے لئے نہیں نکلتے تھے، کہ اس کے بغیر بہ سلامت واپس آنے کی امید ہی

نہیں رہتی تھی، بدکاری کا حال یہ تھا کہ لوگ اس بات کو بھی درست سمجھتے تھے کہ اچھی نسل حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پاس بھیجا جائے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک عورت سے کئی مرد ہم آغوش ہوتے اور جب بچہ ہوتا تو قیافہ شناس سے نسب کی شناخت کرواتے، اس کو ''نکاح رھط'' کہا جاتا تھا، (بخاری:۲/۷۶۹) بے حیائی اور فحاشی اس عروج پر تھی کہ لوگ اپنی بدکرداریوں کو لکھ کر غلافِ کعبہ سے آویزاں کر دیتے تھے اور بے تکلف اپنے اشعار میں اس کا ذکر کرتے تھے، جنگ وجدال تو گویا ان کی طبیعتِ ثانیہ تھی اور معمولی واقعات پر مدتوں، بلکہ نسلوں معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے جرم وگناہ کے اس جنگل کو صدق وصفا اور محبت و وفا کی بستی بنا دیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے : اوّل دلوں کا تزکیہ اور لوگوں کی فکر اور سوچ میں انقلاب، دوسرے ان اسباب و محرکات کا سدّ باب جو جرم میں معاون ہوتے ہیں، تیسرے سنگین جرائم پر سخت سزائیں، یہی طریق کار تھا جس نے جرائم کے خوگر عرب سماج کی حالت بدلی اور انسانیت کے قاتلوں کو انسانیت کا محافظ اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ دلوں کی دنیا میں انقلاب لایا جائے، دل میں خدا کا ایسا خوف بٹھایا جائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس جاگزیں کیا جائے کہ انسان جیتے جی موت کے بعد کی زندگی کو دیکھنے لگے، آخرت سے پہلے ہی آخرت اس کے سامنے آجائے، وہ محسوس کرلے کہ گویا وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، یہی انقلاب تھا جس کے نتیجہ میں صحابہ ؓ معمولی سے معمولی گناہوں پر تڑپ اٹھتے تھے اور بے چین ہوجاتے تھے۔

کتبِ احادیث میں ایک صحابی حضرت ماعز ؓ اور ایک صحابیہ حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر آتا ہے، ازراہِ بشریت ان سے برائی کا صدور ہوگیا، ان کی غلطی کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ اس پر کسی زبان نے ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف بارگاہِ نبوی ﷺ میں دعویٰ کیا، لیکن احساسِ گناہ نے ان کے زندہ اور صاحبِ ایمان ضمیر کو ایسا تڑپا دیا کہ ازخود دربارِ نبوی

میں حاضر ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم کی سزا نہایت ہی سخت اور عبرت انگیز ہے، اعترافِ جرم فرمایا، یہ احساس اتنا شدید تھا کہ یہ بھی نہیں فرمایا کہ مجھ سے فلاں برائی ہوئی ہے، بلکہ عرض کیا: ''إنـي هـلـكـت يـا رسـول الله !'' (اللہ کے رسول! میں تو لٹ گیا، میں ہلاک و برباد ہو گیا) گویا کسی گناہ کے صدور کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی ہلاکت اور بربادی کی بات سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے بار بار چہرہ پھیرا اور ایسا عنوان اختیار فرمایا کہ ان کو اپنے اعتراف کی تعبیر و توجیہ اور انکار کا موقع میسر آجائے، لیکن وہ بار بار یہی کہتے کہ مجھے پاک فرما دیجئے، یہاں تک کہ ان پر شرعی حد نافذ کی گئی، یہی وجہ تھی کہ پورے عہد نبوت میں ایسے جرائم جن پر حد شرعی مقرر ہے، کے صرف چھ سات واقعات ملتے ہیں۔

انسانی ضمیر کے بیدار کرنے اور جرم کی شناعت کو ذہن میں بیٹھانے کے لئے آپ ﷺ لوگوں کی نفسیات کے مطابق ان کی تفہیم فرمایا کرتے تھے، ایک صاحب نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اور گناہوں سے تو باز آسکتا ہے، لیکن زنا سے باز نہیں آسکتا، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری ماں سے بدکاری کرے تو کیا تم اس کو پسند کرو گے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا، آپ ﷺ اسی طرح بہن، بیوی، بیٹی کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور وہ کہتے گئے کہ میں ایسا بالکل پسند نہیں کروں گا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جس عورت کے ساتھ بدکاری کرو گے وہ بھی تو کسی کی ماں، بیوی، بہن، بیٹی ہوگی، ان کی سمجھ میں بات آگئی اور وہ تائب ہو گئے، ایک دفعہ فرمایا کہ جب کسی اجنبی عورت پر نگاہ پڑ جائے اور طبیعت کا میلان ہو جائے تو اپنے گھر آجاؤ، اس لئے کہ تمہاری بیوی بھی تمہاری خواہش کی تکمیل کا وہی سامان رکھتی ہے جو وہ عورت۔

عام طور پر مجرمانہ واقعات مال و زَر کے حصول کے لئے پیش آتے ہیں، مال کی بے وقعتی اور دنیا کی بے ثباتی آپ ﷺ نے لوگوں کے ذہن میں اس درجہ بٹھادی تھی کہ وہ دوسروں کا مال لینے سے خوب اجتناب کرتے تھے، جب کبھی آپ ﷺ ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں آسائش و آرائش کے اسباب نظر آتے اور عیش و مستی کا سروسامان ہوتا، تو فرماتے کہ عیش تو

آخرت ہی کا عیش ہے، جو بے پناہ اور لا فانی ہے ''لا عیش إلا عیش الآخرۃ '' اس طرح آپ ﷺ اپنے رفقاء کو تعلیم دیتے کہ جب اسبابِ دنیا پر دل ریجھنے اور طبیعت مچلنے لگے تو آخرت کے سامانِ عیش کو یاد کرلیں، اس سے نفس کی حرص وطمع کا علاج ہو جائے گا۔

ایک صاحب کا مقدمہ خدمتِ اقدس ﷺ میں آیا، گواہان نہیں تھے، اس لئے فریقین کا بیان سن کر آپ ﷺ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہو کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہو، حالاں کہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہو، تو اگر ایسا ہو تو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے، آپ ﷺ کی یہ بات سُنی تھی کہ وہ صاحب زمین سے دستبردار ہو گئے، اور دوسرے فریق نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، بالآخر آپ ﷺ نے وہ زمین دونوں میں نصف نصف تقسیم فرما دی، اس لئے جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر اور سوچ میں انقلاب نہ آئے، سماج کو جرائم سے پاک کرنا ممکن نہیں۔

دوسرے آپ ﷺ نے ان راستوں کو بند کر دیا جو آدمی کو گناہ تک لے جاتے ہیں، مثلاً: اسلام میں زنا حرام ہے تو شریعت نے اس جرم کو روکنے کے لئے ممکنہ تدبیریں بھی اختیار کی ہیں، پردہ کا نظام قائم کیا گیا، غیر محرم خواتین کے ساتھ تنہائی کو منع فرمایا گیا، مخلوط تعلیم اور عبادت کی ممانعت کی گئی، شراب اور نشہ جو ایسی برائیوں کا سب سے بڑا محرک ہے، اس کو سنگین جرم قرار دیا گیا، نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی، نکاح میں تاخیر اور تجرد کی زندگی کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا، فحش لٹریچر اور پوسٹرس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، غرض وہ تمام راہیں بند کر دی گئیں، جو انسان کو اس گناہ تک لے جاتی ہوں، اس کے ساتھ جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو نہ جرم سے بچنا لوگوں کو دشوار ہوا اور نہ جرم سے روکنے کے لئے کوئی مہم جوئی کرنی پڑی۔

یہی حال شراب کا ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف شراب پینے کو حرام قرار دیا، بلکہ شراب کی خرید وفروخت اور اس کی صنعت، نیز اس کے حمل ونقل کو بھی، اس طرح شراب کا حاصل کرنا ہی کارِ دشوار ہو گیا، اگر ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے تو جو لوگ منشیات کا رجحان رکھتے ہیں، پہلے

مجبوراً منشیات سے باز آئیں گے اور پھر یہی ان کی عادت ہو جائے گی۔

جرم کو روکنے کے لئے تیسرا طریقہ قانون کا ہے، بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور نصح و ہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر دستک دیں، قانون کی تلوار کے سوا کوئی چیز ان کو سرِخمیدہ نہیں کرپاتی، ایسے لوگوں کے لئے سخت قانون بھی ایک ضرورت ہے، اس وقت ایک رجحان یہ پیدا ہو گیا ہے کہ مجرم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رحم دلی اور عفو و درگزار سے کام لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ثبوتِ جرم کے قانون کو سخت اور سزا کے قانون کو ہلکا بنایا جائے، گویا مجرم کو دوہرا فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام کا تصورِ جرم و سزا یہ ہے کہ ثبوتِ جرم کے لئے تو مناسب شواہد کا فراہم ہونا ضروری ہے؛ تاکہ بے قصور، قصوروار نہ ٹھہرے اور کسی کو جرمِ بے گناہی کی سزا ملنے نہ پائے، لیکن جب جرم ثابت ہو جائے تو سزا عبرتناک ہو اور سزا کے نفاذ میں نرم روی اختیار نہ کی جائے، الا یہ کہ جرم کا تعلق کسی خاص انسان کے حق سے متعلق ہو اور وہ خود مجرم کو بہ خوشی معاف کردے، سزاؤں کے سخت ہونے کا فائدہ ماحول کی تطہیر اور عبرت انگیزی ہے، سزائیں اگر سخت نہ ہوں تو اس سے مجرم کو شہ ملتی ہے اور جرائم پسند طبیعتوں کا حوصلہ بڑھتا ہے، آج کل بڑے بڑے جرائم پر چند ہزار کے جرمانے عائد کئے جاتے ہیں، چند ماہ یا سال سزائے قید ہوتی ہے، یہ جرائم کو روکنے اور مجرمین کے حوصلے پست کرنے کے لئے بالکل ناکافی اور غیر تشفی بخش ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجرم سزا پانے کے بعد جرم سے بچنے کے بجائے اور بھی مہارت کے ساتھ جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس اسٹیشنوں میں ایک مجرم پر بیسوں بار مقدمات دائر ہوتے ہیں اور وہ تھانہ اور جیل کو ’’مہمان خانہ‘‘ باور کرنے لگتا ہے۔

سزاؤں کے نفاذ میں سختی کی وجہ سے ردّ عمل کے طور پر پیدا ہونے والے جرائم کا سدِ باب ہوتا ہے، کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوئی ہو اور مجرم کو کما حقہ سزا مل جائے تو مظلوم کی تشفی ہو جاتی ہے اور آتش انتقام بجھ جاتی ہے، اگر اسے یہ احساس ہو کہ ان کے مجرم کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور اسے اس کے جرم کی نسبت سے سزا نہیں مل پائی تو اندر ہی اندر شعلۂ انتقام بھڑکتا اور

موقع کی تاک میں رہتا ہے اور جب بھی کوئی موقعہ ملتا ہے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال جڑ پکڑتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قصاص یعنی مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنے میں تمہارے لئے زندگی اور حیات مضمر ہے: ''و لکم في القصاص حیاۃ''۔(البقرۃ:۱۷۹)

یہ حقیقت تجربات کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی اور مہر نیم روز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اگر انسان کو جرائم سے پاک، محفوظ اور پرسکون سماج مطلوب ہو، تو اسے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا اور اسی سماج اور سماج کے طریقۂ اصلاح کو اپنے لئے اسوہ و نمونہ بنانا پڑے گا جسے صحراءِ عراب کے بدوؤں پر پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ نے اختیار کیا تھا، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ لوگوں کے مردہ ضمیر کو زندہ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی جاتی، تربیت اور ذہن سازی سرکار کا فریضہ ہے، وہ سر تک کرپشن میں ڈوبی ہوئی ہے اور ظلم و جور اور بد اخلاقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، جرائم کے اسباب و عوامل پر تو کیا روک لگے گی، ایسے راستے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا رہے ہیں جو نوجوانوں کو جرم پر اکسائیں اور تشدد کے طریقے بتائیں، بد اخلاقی سکھانے اور مجرم بنانے کے لئے فلمیں ہی کیا کم تھیں کہ ٹی وی کا سیل رَواں بھی گھر گھر داخل ہوا، پھر اسٹار ٹی وی کی لعنت آئی، جو لوگوں کو دنیا کے کونے کونے میں پائے جانے والے مجرمانہ طریقے اور حیا سوزی کے نت نئے انداز سے روشناس کرتی ہے، سنا ہے کہ انٹرنیٹ کا جادو اور اس کا مفسدانہ استعمال ان فتنوں سے بھی ماسوا ہے، پرنٹ میڈیا میں جو اخلاق سوز مواد آیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، اب تو جرائم کی زندہ کہانیاں بھی چھپ رہی ہیں اور منہ مانگے دام بک رہی ہیں؛ تاکہ لوگ جرم اور بد اخلاقی کے نت نئے انداز سیکھ لیں اور حسبِ ''توفیق'' ان کا تجربہ کریں۔

تو کیا جرائم کی اتنی اثر انگیز اور وسیع الاثر تعلیم، نیز ان کے لئے ممکنہ اسباب و وسائل کی فراہمی کے ساتھ پُر امن اور جرائم سے پاک سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے، اور کیا رات کی تہہ در تہہ تاریکی میں سورج کی کرنیں ہاتھ آسکتی ہیں؟؟

۱۲/شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ ۲۶/نومبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

مذہبی قائدین اور مجرمانہ رویہ

کھانے کا ذائقہ خراب ہو تو نمک کے ذریعہ اسے درست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اگر خود نمک کا مزا خراب ہو جائے، تو اسے کیوں کر درست کیا جائے؟ یہی مسئلہ سماجی زندگی میں مذہب اور مذہبی پیشواؤں کا ہے، سماج میں جو برائیاں آج پھیلی ہوئی ہیں، ان کا علاج مذہب سے بڑھ کر کسی اور دوا سے نہیں کیا جاسکتا، مذہب انسان میں خدا کا خوف پیدا کرتا ہے، خدا کا یقین، جوابدہی کا احساس بیدار کرتا ہے، مذہب کا سب سے اہم عنصر آخرت کی جوابدہی کا یقین ہے، یہ یقین اسے برائیوں سے روکتا ہے اور نیکیوں پر آمادہ کرتا ہے، یہ بات کہ وہ پولیس اور قانون کی پکڑ سے بچ سکتا ہے، لیکن اس کے عمل کا ایک ایک حرف محفوظ ہو رہا ہے اور وہ خدا کی نگاہ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا، اسے رات کے اندھیرے میں اور جرم پر پوری قدرت کے باوجود جرم کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے۔

اس وقت دنیا میں صورتِ حال یہ ہے کہ پیشۂ سیاست سے وابستہ مؤثر شخصیتیں بھی اخلاقی حدود کو توڑ چکی ہیں اور سیاست نے زبانِ حال سے اعلان کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز نفع ونقصان ہے، نہ کہ کسی بات کا قانون اور اخلاقی تقاضوں کے موافق یا اس کے مخالف ہونا، امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن نے برسر عام اپنی بدکاری کا اعتراف کیا، لیکن اس کی وجہ سے انھوں نے استعفیٰ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، موجودہ صدر بش کو پوری دنیا قاتل اور راہزن اور ظالم و غاصب قرار دے رہی ہے اور آج تک وہ اپنی جنگ جوئی کے لئے کوئی جواز فراہم نہیں کر سکے، لیکن وہ دوبارہ امریکہ کے صدر منتخب ہو چکے ہیں، ہمارے ملک کی قیادت ایسے نامی گرامی قائدین کے ہاتھوں میں ہے جو جانوروں کے چارہ سے لے کر مردوں کا کفن تک بیچ کھانے میں حجاب نہیں محسوس کرتے۔

تعلیم انسان کو بداخلاقی سے باز رکھتی ہے، لیکن یہ سارے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں،

ہمارے ملک کے ایک سابق وزیر اعظم ایک اعلی درجہ کے دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے تھےاور دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھے،لیکن اخلاقی صورتِ حال یہ ہےان سے اتنے زیادہ اسکینڈلس متعلق ہیں کہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا مقام دانشوری میں اونچا تھا یا مجرمانہ اسکامس کو وجود میں لانے میں؟ بلکہ آج کل بہت سی غیر قانونی سرگرمیاں تعلیم یافتہ دماغوں کے ذریعہ وجود میں آرہی ہیں،ان حالات میں لوگ بجاطور پر سمجھتے ہیں کہ جو طبقہ مذہب سے وابستہ ہے وہ مقدس، پاکیزہ کردار، اخلاقی قدروں کا حامل اور انسانی شرافت کا نمائندہ طبقہ ہے،اس طبقہ میں بےغرضی،خوش اخلاقی، بلند کرداری اور قانونی تقاضوں کی رعایت کا جذبہ اور مزاج ومذاق نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے،اس لئے مذہب بیزاری کے باوجود عام لوگ آج بھی مذہبی پیشواؤں کو احترام واعتبار کی نظر سے دیکھتے ہیں اوران کے ساتھ توقیر وتکریم کا معاملہ کرتے ہیں،اگراس طبقہ کی نمائندہ شخصیتوں کی طرف سے کوئی مجرمانہ واقعہ پیش آتا ہےتو یہ دکھ کا باعث ہوتا ہے،اور اعتماد کا آبگینہ چور چور ہوکر رہ جاتا ہے،پچھلے دنوں کانچی پورم کے شنکراچاریہ محترم جناب سوامی کے واقعہ نے ان کے عقیدت مندوں پر جواثر ڈالا ہوگا، وہ تو ڈالا ہی ہوگا،اور یقیناً انھیں اس سے ناقابل بیان تکلیف پہنچی ہوگی ،لیکن بلالحاظِ مذہب وملت ملک کے تمام ہی باضمیر لوگوں کو اس واقعہ سے ایک چوٹ سی لگی ہے،،ہم جیسے لوگ جو ہندومذہب کی آئیڈیالوجی پر یقین نہیں رکھتے ، وہ بھی مذہبی قیادت کی اتنی اونچی سطح پر متمکن لوگوں کے بارے یہ ضرور گمان رکھتے ہیں کہ وہ اخلاق وکردار کےاعتبار سے اتنی نیچی سطح پرنہیں اترسکتے۔

کہا جاتا ہے کہ شنکراچاریہ کے اس منصب کی بنیاد آدی شنکراچاریہ (مولود ۷۸۸ء، متوفی ۸۲۰ء) نے رکھی تھی،اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے متاثر تھے،آدی شنکر اچاریہ ایک انقلابی شخص تھے،جنھوں نے صرف ۳۲ سال کی عمر پائی،لیکن سناتن دھرم کونئی زندگی بخشنے میں انھوں نے حیرت انگیز کردار ادا کیا ، یہ وہ وقت تھا کہ پورے مشرقی ایشیاء پر بودھ مذہب کا جھنڈا لہرا رہا تھا،اور چین سے لے کر ایران کی سرحدوں تک اور جنوب کی طرف ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کرکے سری لنکا تک یہ پورا خطہ بودھ خانقاہوں اور عبادت گاہوں

سے بھرا پڑا تھا، ان حالات میں مٹھوں کے بانی آدی شنکراچاریہ نے ایک ایسی انقلابی تحریک چلائی کہ موجودہ برصغیر سے اس مذہب کا صفایا ہوگیا اور انھوں نے برہمنی نظام کے بقاء اور تحفظ کے لئے چاروں سمتوں میں ایک ایک مٹھ کی بنیاد رکھی، اور اس کے پیشوا کو شنکراچاریہ کا لقب دیا، حالاں کہ ان چار مٹھوں میں کانچی پورم شامل نہیں تھا، لیکن بعد کے ادوار میں کچھ مذہبی قائدین کی تائید سے اس پانچویں مٹھ کو بھی ایک اہمیت حاصل ہوگئی اور موجودہ شنکراچاریہ کو چوں کہ سیاسی امور سے بھی بڑی دلچسپی تھی، اور ان کے سیاسی تعلقات کا دائرہ وسیع اور سنگھ پریوار سے ان کے روابط بہت گہرے تھے، اس لئے اس گمنام مٹھ کو بھی شہرت وعروج حاصل ہوا، بلکہ یہ مٹھ اور اس کے شنکراچاریہ جس قدر اخبار کی شاہ سرخیوں میں آیا کرتے تھے، دوسرے مٹھوں کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

اس لئے حالاں کہ جناب سرسوتی جی سناتن دھرم کی روایات کے اعتبار سے متفقہ اور مسلمہ شنکراچاریہ نہیں تھے، لیکن ادھر چند سالوں میں انھوں نے دوسرے شنکراچاریوں سے بڑھ کر شہرت وناموری اور وقار واعتماد حاصل کرلیا تھا، اب جب شنکراچاریہ اپنے پرانے معتقد اور بعد کو ان سے بغاوت کرنے والے شنکر رمن کو قتل کرنے کے سلسلہ میں گرفتار کئے گئے تو یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ گویا پہاڑ کی چوٹی گہری کھائی کے اندر گر پڑی ہو۔

اس طرح کے واقعات میں دو پہلو ہمارے لئے قابل توجہ ہیں، اوّل تو ان لوگوں کے لئے جو مذہبی ذمہ داریوں پر فائز ہوں، مذہبی پیشواؤں اور مذہبی امور کے ذمہ داروں کا کردار بلند اور ان کی زندگی صاف وشفاف ہونی چاہئے، اگر معاندین بھی چاہیں تو ان کی زندگی پر انگلی نہ اٹھا سکیں، رسول اللہ ﷺ کے مخالفین کیا کچھ نہیں کہتے تھے، لیکن ہزار عناد واختلاف کے باوجود وہ کبھی آپ ﷺ پر جھوٹ وخیانت کی تہمت نہیں لگائے، انگریزوں کے عہد میں مغربی یوپی میں ایک مقام پر ایک جگہ کے بارے میں اختلاف ہوگیا، ہندو اسے مندر کہتے تھے اور مسلمان اسے مسجد کی جگہ قرار دیتے تھے، اور کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں تھی، آخر ہندو اور مسلمان قصبہ کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں متفق ہوگئے کہ یہ جھوٹ نہیں بول سکتے،

یہ جو کہیں گے، ہم دونوں اسے قبول کریں گے، جج انگریز تھے، اور انگریزوں نے مسلمانوں پر جو جور و ستم ڈھائے تھے، ابھی اس کا زخم تازہ تھا اور حساس و باضمیر لوگوں کے اصرار پر شہادت دینے پر آمادگی ظاہر کی، لیکن کہا کہ میں انگریز کی صورت نہیں دیکھ سکتا، جج نے اس بات کو قبول کرلیا، کہ وہ پردہ کے اندر رہے، اور مولوی صاحب آکر گواہی دے دیں، وہ آئے اور انھوں نے ہندوؤں کے حق میں شہادت دی، بعض ناسمجھ مسلمانوں نے انھیں تلقین کی کہ وہ اس میں سچ اور جھوٹ کو نہ دیکھیں، اسلام اور کفر کو ملحوظ رکھیں، لیکن مولوی صاحب نے سچائی کا دامن نہیں چھوڑا، مذہبی شخصیتیں ایسی کردار کی حامل ہوتی تھیں۔

ایسا کردار یوں ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ دل خدا کے یقین اور اس کے خوف سے لبریز ہو، خلق خدا کے ساتھ اس کا معاملہ بے غرضی کا ہو اور اس کی اپنی نجی زندگی سادگی پر مبنی ہو، خدا سے بے خوفی انسان کو گناہ پر جری کر دیتی ہے اور تکلفات اور جمالیاتی ذوق کی بہتات ضرورت اور خواہش کے درمیان فاصلہ باقی نہیں رہنے دیتی اور جب خواہشات ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں، تو انسان ان کو حاصل کرنے کے لئے ناگفتی کہنے اور ناکردنی کرنے لگتا ہے، اس لئے علماء اور مذہبی پیشواؤں اور ملت کے زعماء کو اپنی نجی زندگی میں اس کو برتنا چاہئے، کیا اللہ تعالی کے لئے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ اپنے رسول کو قیصر و کسری کا سا محل عطا فرما دیتا؟ کیا صحابہ ﷺ سے بڑھ کر جاں نثاروں کو بھی دنیا نے دیکھا ہے جو آپ ﷺ کے ایک اشارۂ چشم پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار تھے؟ کیا آپ ﷺ ان کے ذریعہ اپنے مخالفین کو ٹھکانہ نہیں لگا سکتے تھے؟ لیکن آپ ﷺ نے اپنی زندگی کو تعیّشات سے دور رکھا اور اپنے مخالفین کے بارے میں اصولی موقف اختیار کیا، جب بعض رفقاء نے عبداللہ ابن ابی (جو منافقین کا سردار تھا اور درونِ خانہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف سازشوں کا جال بنتا رہتا تھا) کے قتل کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک کوئی شخص اپنی زبان سے ایمان و اسلام کا اظہار کرتا رہے گا، ہم اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کریں گے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ مذہبی قیادت ایسے جرائم میں کیوں کر مبتلا ہوتی ہے؟ شنکر

اچاریہ جی کے واقعہ کی گونج تو پورے ملک میں ہے، لیکن بعض کم تر سطح کے ہندو مذہبی قائدین بھی مختلف غیر اخلاقی جرائم میں ماخوذ ہوتے رہتے ہیں اور اخبار میں اس سے متعلق خبریں بھی آتی رہتی ہیں، ابھی ایک دو روز پہلے ہی ایک تانترک چندرا سوامی جی کا نام بھی آیا ہے، جو سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی سے قریب تھے اور تحقیقاتی ایجنسیوں کو شبہ ہے کہ راجیو جی کے قتل میں ان کا بھی اہم رول رہا ہے، عیسائی پادریوں کے گناہوں پر تو مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کلیسا کے عہدِ اقتدار میں مغفرت نامے فروخت کئے جاتے تھے اور گرجا گھر رشوت کا سب سے بڑا مرکز بنے ہوئے تھے، ڈنمارک میں مرد کی مرد سے شادی کا جو پہلا واقعہ پیش آیا، وہ ایک پادری اور ماہر نفسیات کے درمیان ہوئی تھی، کتنے ہی بڑے بڑے پادریوں نے اپنے جرم کے مشتہر ہو جانے کے بعد اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے، اس سلسلہ میں مشہور عیسائی مبلغ ''جی سواگرٹ'' (جن کا مناظرہ ۱۹۸۶ء احمد دیدات سے بھی ہوا تھا اور جس میں انھوں نے شکستِ فاش کھائی تھی) خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جنھوں نے امریکی ٹیلی ویژن پر اپنے بے شمار جنسی گناہوں کا اعتراف کیا اور عیسائی دنیا میں ان کی عظمت و تقدس کی جو دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس پس منظر میں ہزاروں براہِ راست اور بالواسطہ ناظرین دَم بخود رہ گئے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان مذہبی رہنما معصوم و بے گناہ ہوتے ہیں، یا ان سے کوتاہیاں سرزد نہیں ہوتی ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اتنی اعلیٰ سطح کے حامل مذہبی قائدین سے شاذ و نادر اس طرح کے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہوگا، اس کی ایک بنیادی وجہ اسلام کی یہ انقلابی فکر ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی طبقہ واسطہ اور وسیلہ کی حیثیت نہیں رکھتا، ہر انسان سے گناہ کا ارتکاب ہو سکتا ہے، ہر شخص اپنے گناہ کے بارے میں جواب دہ ہے اور شریعت میں گناہ کی جو سزا مقرر کی گئی ہے، اس کا اطلاق سبھوں پر مساویانہ طریقے سے ہوتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں خالق و مخلوق کے درمیان کچھ واسطے تلاش لئے گئے ہیں، ہندوؤں کے یہاں برہمن بمقابلہ عام انسان کے بالاتر انسان سمجھے جاتے ہیں، جو ان کے بقول خدا کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں، ایک ہی جرم پر وہ کم سزاؤں کے مستحق ہوتے ہیں، اسی

طرح عیسائیوں کے یہاں پادری ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کے بیٹے کا نائب ہوتا ہے، جو لوگوں کے گناہ تک معاف کرسکتا ہے، اس مبالغہ آمیز عقیدہ اور خالق اور مخلوق کے درمیان ایک خود ساختہ واسطہ ایجاد کر لینے کی وجہ سے ان کے بارے میں ضرورت سے زیادہ تقدس پیدا ہو جاتا ہے، ان کو تحقیق و تفتیش سے ماوراء سمجھا جاتا ہے، اور یہ چیز ان کو متکبر، خود پسند، محاسبہ سے ماوراء بنا کر رکھ دیتی ہے، اور اس تقدس کی آڑ میں انھیں ارتکابِ جرم کی شہ ملتی ہے۔

اسلام نے انسانیت کو جو انقلابی افکار و تصورات دیئے ہیں، ان میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے انسان اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رکھا، خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی ایسی دیوار کھڑی نہیں کی، جس سے گزرے بغیر مخلوق اپنے خالق تک پہنچ نہیں سکتا ہے، اگر اسلام کے صرف اسی پہلو کو دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کیا جائے، اور انسان کی عملی زندگی میں اس کے اثرات و نتائج کا تجزیہ کیا جائے تو شاید یہی ایک نکتہ بہت سے متلاشیانِ حق اور سچائی کے طلب گاروں کے لئے کلیدِ معرفت بن جائے گا!

۱۱/ ذی القعدہ ۱۴۲۵ھ ۲۴/ دسمبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

سونامی کی قہر سامانی

۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء اب ایک ناقابل فراموش تاریخ بن چکی ہے، خوشی و مسرت اور کیف و سرور کے لئے نہیں، بلکہ جشن نشاط سے تھکے ماندے خوابیدہ سرمستوں پر موت و ہلاکت اور تباہی و بربادی کے ناقابل تصور قہر کے لئے، اسی واقعہ نے بہت سے لوگوں کو ''سونامی'' کے لفظ سے آشنا کیا، جو اس جاپانی تعبیر سے ناواقف اور نابلد تھے، اتھاہ سمندر کے قدموں میں بچھی ہوئی زمین کی تہوں میں زلزلہ آیا اور اس زلزلہ نے سمندر کی خاموش اور ساکت موجوں کو بے قرار کر کے رکھ دیا، اب یہ موجیں اپنا سر اٹھائے اور مہیب بازو پھیلائے پانچ سو کیلو میٹر کی رفتار سے قدم بڑھاتی ہوئی مشرقی ایشیاء کے گیارہ ملکوں کو نشانہ بنانے کے بعد خاموش ہوگئیں۔

زلزلہ کی ہلاکت خیزیوں کی تاریخ لکھنے والوں نے ماضی کی بڑی بڑی تباہ کاریوں کے اعداد و شمار جمع کئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۶ء میں چین اور جاپان میں ایسے بدترین زلزلے آئے جن میں آٹھ لاکھ، تیس ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے، ۱۹۷۲ء بیسویں صدی کا زلزلوں کا سال ہے، جس میں مشرق سے مغرب تک زلزلوں کی ہلاکت خیزیوں کا بازار گرم رہا اور صرف چین کے ایک شہر تانگ زانگ میں ساڑھے سات لاکھ انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔

(دیکھئے: روزنامہ منصف: ۴ جنوری ۲۰۰۵ء تحریر: پروفیسر یوسف کمال)

مشرقی ایشیاء جاپان، چین، انڈونیشیا وغیرہ کے لئے زلزلہ کے واقعات شاید غیر معمولی نہ ہوں، لیکن ہندوستان میں موجودہ نسل کے لئے جزیرۂ سماترا کا زلزلہ اور اس کے بعد پیدا ہونے والی سونامی لہریں ایک ایسا غیر معمولی غم انگیز واقعہ ہے کہ شاید ہی ایک حادثہ میں اتنے سارے افراد کی ہلاکت کا کوئی ایسا واقعہ ان کی زندگی میں پیش آیا ہو، یہ دیو ہیکل لہریں جو انڈونیشیا سے دوڑتی ہوئی اور فلپائن، سری لنکا اور تھائی لینڈ وغیرہ کو روندتی ہوئی جنوبی ہند کے ساحل پر آدھمکیں، چند گھنٹوں میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کو ہضم کر گئیں ہیں اور بے شمار لوگ ابھی

لا پتہ ہیں، اس لئے اندازہ ہے کہ انسانی ہلاکتوں کی یہ تعداد ۲ لاکھ سے بھی متجاوز ہو جائے گی، کہا جاتا ہے کہ بہ حیثیتِ مجموعی پچاس تا پچھتر لاکھ اس حادثہ سے متاثر ہوئے ہیں، اور متاثرین کی باز آبادکاری اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں آٹھ تا دس سال کا عرصہ لگے گا، اس زلزلہ اور سمندری تموج نے نہ جانے کتنی عورتوں سے ان کا سہاگ، کتنے بچوں سے باپ کا سایۂ شفقت اور ماں کی ممتا اور کتنے والدین سے ان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور آن کی آن میں چھین کر رکھ لیا!

اس میں شبہ نہیں کہ زلزلہ کا پیدا ہونا نہ عجیب ہے اور نہ غیر متوقع، اور جغرافیائی اسباب و عوامل کی بناء پر ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن ایک ایسے شخص کے لئے —— جو خدا پر یقین رکھتا ہو، جو اس بات کو مانتا ہو کہ ایک ہستیِ مطلق نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور پیدا کر کے اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ مسلسل نظم و تدبیر میں بھی لگا ہوا ہے، وہ خالق بھی ہے اور رب بھی، —— اس کا یہ یقین بتاتا ہے کہ فطرت کے اس واقعہ کے پیچھے بھی اسی ذات کا حکم کارفرما ہے، جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، اور اس کے لئے ایک نظام العمل مقرر کیا ہے، سمندر کی گہرائیوں سے اٹھنے والے زلزلے ہوں یا فلک بوس پہاڑ کی چوٹیوں سے پھوٹ پڑنے والے آتش فشاں، یہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ **أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَ الْأَمْرُ**

دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں، اس کے لئے خدا نے ایک قانون مقرر کیا ہے، اور وہ قانون یہ ہے کہ خشکی یا تری میں جو فساد رونما ہوتا ہے وہ خود انسان کی کارستانیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْ النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ** . (الروم:۴۱)
>
> خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے فساد رونما ہوتا ہے؛ تاکہ انھیں ان کی بعض بداعمالیوں کا مزہ چکھائیں، شاید وہ خدا کی طرف واپس آجائیں۔

خدانے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، اس نے انسانوں کے لئے اس خوب صورت بستی کو سجایا اور سنوارا ہے اور انسان کی راحت وآسائش کے لئے ایسے ایسے اسباب پیدا کئے ہیں کہ اگر خدانے ان نعمتوں سے محروم رکھا ہوتا تو انسان کے لئے ان تک رسائی تو کجا؟ ان کا تصور بھی آسان نہیں تھا، اسی خدا نے اس دنیا کے لئے اپنا قانون بھی مقرر کیا ہے اور اسے انبیاء کے ذریعہ انسانیت کے نام بھیجا ہے، جس نے اس کائنات کو بنایا ہے، پیدا کیا ہے، سنوارا اور سجایا ہے، آسانیاں اور سہولتیں پیدا کی ہیں، ظاہر ہے کہ اسی کا قانون اس لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، اور اسے اس کی بنائی ہوئی زمین پر نافذ کیا جائے، یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر آپ کا ہو، بال بچے آپ کے ہوں، ساری ضروریات آپ کے ذریعہ پوری ہوتی ہوں، لیکن حکم دوسروں کا چلے، کیا یہ بات کسی انسان کے لئے قابل قبول ہوسکتی ہے؟ جب انسان کو یہ بات گوارا نہیں ہے تو خدائے قدیر کو یہ بات کیوں کر گوارا ہوسکتی ہے؟

اس وقت دنیا میں غالب ترین اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو خدا پر یقین رکھتی ہیں، ایسے لوگوں کا تناسب شاید پچانوے فیصد سے بھی زیادہ ہوگا، ان میں بہت سی قومیں وہ ہیں جن کے پاس کسی نہ کسی صورت میں مذہبی کتاب بھی موجود ہے، جن کو وہ خدا کی بھیجی ہوئی کتاب اور انسانیت کے لئے خدا کی مرضی کا قانون تصور کرتی ہیں، ہندوؤں کے پاس ویدیں ہیں، وہ ان کو الہامی مانتے ہیں، ان ویدوں میں حلال وحرام کے بہت سے احکام موجود ہیں، یہودی اور عیسائی فی الجملہ بائبل پر یقین رکھتے ہیں اور تورات کے صحائف کو شریعتِ خداوندی باور کرتے ہیں، تورات میں بھی حلال وحرام، جرائم اور حدود سے متعلق بہت سے احکام موجود ہیں، لیکن ان قوموں کی جسارت دیکھئے کہ خدا پر یقین رکھنے اور اپنی مذہبی کتابوں کو خدا کے احکام وفرامین باور کرنے کے باوجود انھوں نے یہ بات طئے کرلی ہے کہ عبادت گاہوں میں خدا کی عبادت کی رسم تو انجام دی جائے گی، لیکن زندگی میں خدا کے احکام نافذ نہیں کئے جائیں گے، اور عجیب بات ہے کہ خدا سے اس بغاوت کو ''مذہب میں اصلاح'' کا نام دیا گیا ہے، گویا مخلوق نے خالق کی اصلاح کو اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

غالباً دنیا میں مسلمان ہی ایک ایسی امت ہیں جو نہ صرف ایک سچی، محفوظ آسمانی کتاب کی حامل ہیں، بلکہ آج بھی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد قرآن کے احکام پر پورا یقین رکھتی ہے اوراسے قابل عمل سمجھتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس کی چبھن ہر آن چشم مغرب کوتڑپاتی رہتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی مغرب کی طرح مذہب کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے، اس کے ماسوا مسلمان جو بھی کرلے، خواہ صدام حسین ہو یا پرویز مشرف اور یاسر عرفات ہو یا حسنی مبارک، مغرب کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوسکتا، وہ مسلمانوں کو بھی مذہب میں اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خود مسلمانوں کا بھی خدا کے احکام سے کتنا تعلق باقی رہ گیا ہے؟ مسلمان حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ پوری طرح اپنے آپ کو بے دینی کے حوالے کر چکے ہیں، یہاں تک کہ وہ نصابِ تعلیم سے بعض آیات کے نکالنے پر بھی آمادہ ہیں، خدا کی اس کائنات میں شاید ایک محلّہ بھی ایسا نہ ہوگا، جس میں مکمل طور پر خدا کا قانون اوراس کی شریعت نافذ ہو، اوراگر حکمرانوں کوغیرت مند مسلمان عوام کا خوف نہ ہوتو شاید انھیں کھلے عام اعلانِ کفر میں بھی تامل نہ ہو۔

علماء اور قائدین کا حال یہ ہے کہ وہ بہت سے موقعوں پر کھلی ہوئی بے ضمیری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، حکومتیں ان کے منہ میں اپنی بات ڈالتی ہیں اوراگلواتی ہیں، حرص وطمع، شخصی مفادات، سماج اورحکومت کا خوف، حقیقت اورسچائی کے اظہار میں دیوار بن کر حائل ہے، اور وہ معاندینِ اسلام کی سازشوں کے لئے امت کوتیار کرنے کی بجائے نادانستہ طور پر اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے یا مخالفینِ اسلام کا آلہ کار بن کر باہمی اختلافات کو ہوا دینے اور چنگاری کو شعلہ بنانے میں مصروف ہیں، عوام کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے شہر میں اسلام اور اسلامی شریعت اس ''اجنبی مسافر'' کی طرح ہے، جسے میزبان کی تلاش ہو، ہم اپنی عبادتوں سے لے کر اپنے معاملات، کاروبار، عائلی زندگی، لوگوں کے حقوق کی پامالی، باہم ظلم و جفا کیشی کا جائزہ لیں، اپنی اخلاقی سطح کو دیکھئے تو غیر مسلم بھی بعض اوقات ہم سے بہتر نظر آتے ہیں اور ہمارے

ایمان کا حال یہ ہے کہ دن رات غیر اللہ کے سامنے ہماری پیشانیاں جھکتی ہیں، الحاح والتجاء کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور خدا کے سوا ساری دنیا کے خوف نے ہمارے سینہ میں جگہ بنا رکھی ہے، بے حیائی بے لباسی تک پہنچ گئی ہے اور انسان ایسا بندۂ ہوس اور پرستارِ نفس بن چکا ہے کہ ان کی بے شرمی پر شاید جانوروں کو بھی شرم آتی ہوگی۔

انسان کی خدا کے خلاف ایسی عالمگیر اور زندگی کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر بغاوت کے نتیجہ میں اگر قدرت کے تازیانے برسیں اور قیامت سے پہلے قیامت کی جھلک انسانوں کو دکھائی جائے تو یہ کیوں کر باعثِ تعجب ہے!!

یہ ہولناک اور غیر متوقع واقعات دنیا کی بے ثباتی کو بھی ظاہر کرتا ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اس نے بحر و برّ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور اب فضائیں بھی اس کی عقل کے ہاتھوں اسیر ہیں، لیکن کیا اس نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جب خدا کا حکم نافذ ہوتا ہے تو یہ ساری تدبیریں تارِ عنکبوت بن جاتی ہیں، بچھا ہوا سمندر چالیس پچاس فٹ اونچائی کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے، پہاڑ آتش فشاں بن کر اس طرح آگ اُبلتے ہیں کہ گویا یہ پتھر نہ ہوں، سوکھے ہوئے پتے ہوں، ہوائیں اس طرح اپنا جشن طرب مناتی ہیں اور انسانی آبادیوں سے کھیلتی ہیں جیسے انسان ان کے کھلونے ہوں، زمین کی وسیع و عریض سطح جب اپنا سینہ پھلاتی ہے تو لمحوں میں آسمان کو چھوتی عمارتوں کے لئے زمین مدفن بن جاتی ہے، ایسی بے ثبات دنیا اگر انسان کو اس کے خالق و مالک سے غافل کر دے تو اس سے بڑھ کر نا سمجھ کون ہوگا؟

۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ / ۷/ جنوری ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

طلاق شدہ عورت کا نکاح

انسانی سماج کی تشکیل خاندان سے ہوتی ہے اور خاندان نکاح سے وجود میں آتا ہے، نکاح سے صرف میاں بیوی ہی کا رشتہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ دادیہالی، نانیہالی اور سسرالی خاندان بھی دراصل اسی رشتہ کا پھیلاؤ اور اس کی سایہ دار شاخیں ہیں، اسی لئے انسانی زندگی میں نکاح کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے اسلام میں نکاح کی بڑی ترغیب دی گئی ہے، اور تجرد کی زندگی کو اسی قدر ناپسند کیا گیا ہے۔

نکاح کے ذریعہ جو رشتے وجود میں آتے ہیں، جیسے والدین اور اولاد وہ قدرتی اور فطری ہوتے ہیں، ان رشتوں کا وجود میں آنا اور باقی رہنا انسان کی رضامندی اور خوشنودی پر موقوف نہیں ہے، یہاں تک کہ انسان ان رشتوں کو ختم کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا، لیکن خود نکاح ایسا رشتہ ہے جو انسان کی باہمی رضامندی اور اس کے اپنے ارادہ واختیار سے وجود میں آتا ہے، قاعدہ ہے کہ جو کسی رشتہ کو وجود میں لاسکتا ہے وہ اس رشتہ کو ختم بھی کرسکتا ہے، اس لئے نکاح کے ساتھ اس بات کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ اگر نکاح سکون کی چھاؤں بننے کے بجائے نفرت کا زہر گھولنے لگے، تو مرد وعورت ایک دوسرے سے مناسب طریقہ پر علاحدگی اختیار کرلیں، اسی کا نام ''طلاق'' ہے۔

جیسے نکاح ایک فطری ضرورت ہے، اسی طرح طلاق بھی بعض حالات میں ضرورت بن جاتی ہے، طلاق کی مثال بالکل آپریشن کی سی ہے، آپریشن ایک ناگوارِ خاطر عمل ہے، لیکن بعض اوقات انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہوجاتا ہے، ایسے وقت میں آپریشن سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی، اسی طرح ازدواجی رشتہ سکون اور طمانینت کی چھاؤں ہے، اور اس کا مقصد سفر زندگی کے سرد وگرم اور تلخ وشیریں حالات میں ایک دوسرے کی دل داری و غم خواری ہے، لیکن اگر زوجین کے درمیان ایسا بعد پیدا ہوجائے کہ یہ رشتہ دلداری کے بجائے

دل آزاری کا باعث بن جائے، تو اس رشتہ کو ختم کر دینے میں ہی شوہر اور بیوی دونوں کی بھلائی ہوتی ہے، اسی لئے اسلام نے ایک ناپسندیدہ ضرورت کی حیثیت سے طلاق کی گنجائش رکھی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں ہندو اور عیسائی مذہب میں طلاق کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، ہندو مذہب میں بیوی کی حیثیت ایک طرح سے مملوکہ جائیداد کی ہے، اس لئے ملکیت اور وفاداری کا تقاضہ سمجھا گیا کہ وہ خواہی نہ خواہی اپنے آپ کو شوہر کے ساتھ جوڑے رہے، یہاں تک کہ اس وفاداری کا کمال یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کے ساتھ اپنے آپ کو نذر آتش کر لے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زندگی بھر بیوہ رہے اور خاندان میں ایک منحوس وجود کی حیثیت سے اپنے آپ کو باقی رکھے۔

بائبل میں حضرت مسیح کا قول نقل کیا گیا ہے کہ: ''جسے خدا نے جوڑا ہے اسے کوئی نہ توڑے''، اس فقرہ سے عیسائی علماء نے یہ بات مستنبط کی کہ نکاح کے بعد پھر اس رشتے کو توڑا نہیں جا سکتا، حالانکہ اس کی حیثیت محض ایک اخلاقی ہدایت کی تھی نہ کہ مستقل قانون کی، چنانچہ عیسائی مذہب میں نکاح کے بعد طلاق کا کوئی تصور نہیں، بعد کو چل کر جب لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر عورت زنا کی مرتکب ہو تو میاں بیوی میں تفریق کر دی جائے گی، اور پھر زنا کی دو قسمیں کی گئیں، جسمانی زنا یعنی بدکاری اور روحانی زنا یعنی عیسائیت سے ارتداد، لیکن یہ تفریق بھی صرف اس حد تک ہوتی کہ زوجین ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں، لیکن عورت کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں ہوگی، گویا عیسائی مذہب میں بھی مطلّقہ کے نکاحِ ثانی کا کوئی تصور نہیں۔

اسی پس منظر میں چند دنوں پہلے ایک غیر معمولی خبر یہ آئی کہ برطانیہ کے شہزادہ چارلس نے اپنا دوسرا نکاح مطلّقہ خاتون سے کیا ہے، یہ شہزادہ کا ایسا جرم ہے کہ برطانیہ کے قصر شاہی میں ملکہ نے ان کی تقریبِ نکاح رکھنے سے انکار کر دیا، اور جب یہ جوڑا تفریح کے لئے امریکہ گیا تو صدرِ امریکہ جناب بش نے صاف طور پر کہا کہ ان کے استقبال کے لئے وہائٹ ہاؤس کا دروازہ بند ہے، گویا برائی اور بدکاری کوئی عیب نہیں ہے، لیکن قانونی رشتہ اتنا بڑا عیب ہے جس کو کسی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا، مغرب اپنے آپ کو ایک ترقی یافتہ معاشرہ قرار دیتا ہے،

لیکن دوسری طرف فکر وخیال کی پستی اور قانونِ فطرت سے بغاوت کا یہ حال ہے کہ آج بھی مطلّقہ سے نکاح کو عیسائی روایت کی بنیاد پر مذموم سمجھا جاتا ہے، کیا یہ عمل انصاف اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے کہ مطلّقہ عورت بے آبرو ہو اور اپنی عفت و پاکدامنی کا سودا کرے تو یہ تذلیل قابل قبول ہے؟ اور وہ اپنا نیا گھر بسائے تو اس کی اجازت نہ ہو؟

ہندو معاشرہ میں بھی مطلّقہ اور بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا ہے اس لئے جب کوئی عورت شوہر کی موت یا کسی اور وجہ سے تنہا ہو جاتی ہے، تو اسے ہمیشہ تنہائی اور کس مپرسی ہی کی زندگی گذار نی پڑتی ہے، یہ صورتِ حال عورتوں کے لئے سراسر نا منصفانہ ہے، اوّلاً تو یہ عورت کو مجبور اور غیر محفوظ بنا کر رکھنا ہے، شوہر بیوی کے لئے معاشی کفالت کا بھی ذمہ دار اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ بھی ہے، شوہر کی موجودگی خود اس کے لئے بہت بڑا حصار ہے، دوسرے قدرت کی طرف سے انسان میں جو صنفی جذبات رکھے گئے ہیں، عورت کے ان جذبات کا قتل بھی ہے، جب کہ نفسیاتی طور پر ایک ایسی عورت جو ازدواجی زندگی گذار چکی ہو، ان جذبات کا زیادہ احساس وادراک رکھتی ہے، تیسرے یہ غیر فطری زندگی عورت کو غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، اور اس سے نہ صرف اس عورت کی عزت پامال ہوتی ہے؛ بلکہ سماج میں بھی گندگی پھیلتی ہے، اور اخلاقی بگاڑ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

اسلام نے تجرد کی زندگی کو ناپسند کیا ہے، خواہ کنوارے مرد وعورت ہوں یا وہ پہلے شادی شدہ رہ چکے ہوں اور اب تجرد کی حالت میں ہوں، قرآن مجید نے خاص طور پر حکم دیا ہے کہ جو مرد بغیر بیوی کے ہوں یا عورتیں بغیر شوہر کے، ان کے نکاح کر دو، ''وأنکحوا الأیامیٰ منکم'' (نور: ۳۲) اس کے مخاطب سرپرست اور اہل خاندان بھی ہیں اور سماج کے لوگ بھی، بعض دفعہ کسی کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے یا شوہر کی وفات ہو جاتی ہے اور مرد وعورت اولاد کی وجہ سے دوسرا نکاح کرنے میں حیا محسوس کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس کے ضرورت مند اور خواہش مند ہوتے ہیں، ان حالات میں خاندان کے ذمہ دار لوگوں کا فریضہ ہے کہ وہ خود کھڑے ہوں اور اس فریضہ کو انجام دیں۔

رسول اللہ ﷺ نے تجرد کی زندگی کو بہت ہی ناپسند فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے، اور جس کو میری فطرت پسند ہو اسے چاہیے کہ وہ میری سنت اختیار کرے، (مجمع الزوائد:۴/۲۵۲) ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے جو لوگ تجرد کی زندگی گزار رہے ہوں وہ بد ترین لوگ ہیں، ''شرارکم عزابکم'' روایتوں میں انھیں شیطان کا بھائی قرار دیا گیا، (دیکھئے: حوالۂ سابق:۴/۲۵۰) ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو نکاح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے، وہ مجھ میں سے نہیں، ''**من كان موسرا لأن ينكح ثم لم ينكح فليس مني**''۔ (حوالۂ سابق:۴/۲۵۱)

یہ ہدایات جیسے کنوارے مردوں اور عورتوں کے لئے ہیں، اسی طرح ان مردوں اور عورتوں کے لئے بھی ہیں جو ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد کسی وجہ سے اپنے رفیقِ حیات سے محروم ہو گئے ہوں، پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت مجموعی گیارہ نکاح فرمائے ہیں، ان میں سوائے امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب کے سب بیوہ یا مطلّقہ تھیں، ان میں متعدد ازواج وہ تھیں جو ایک سے زیادہ ازواج سے گزر کر آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں تھیں، خود امّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایسی ہی ازواج میں سے تھیں، ان کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی تھے، اور دوسرے ابو ہالہ حضرت زینب بن خزیمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے پہلے عبیدہ بن حارث اور جہم بن حارث کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل میں امت کے لئے اُسوہ و نمونہ رکھا گیا کہ سماج میں جو عورتیں مطلّقہ اور بیوہ ہوں ان سے نکاح کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے، اور نہ ان کو منحوس اور نامبارک تصور کرنا چاہیے، افسوس کہ ہندو سماج سے متاثر ہونے کی وجہ سے بیوہ اور مطلّقہ عورتوں کے ساتھ نارَوا سلوک رَوا رکھا جاتا ہے اور ہر مطلّقہ عورت کے بارے میں یہ بات فرض کر لی جاتی ہے کہ اس کی غلطی اور بدخلقی کی وجہ سے طلاق کی نوبت آئی ہوگی، حالانکہ اکثر واقعات میں میاں بیوی کی علاحدگی میں نامناسب رویہ ان مردوں کا ہوتا ہے جو اپنی بیوی کے حقوق سے غافل اور بے پروا ہوتے ہیں، بیوہ اور مطلّقہ عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز اور

نامنصفانہ برتاؤ ظلم و جور بھی ہے اور بہت سی سماجی برائیوں کی جڑ ہے، لیکن حیرت ہے کہ ہندوستان کی اَن پڑھ اور توہمات کی اسیر عوام پر ہی نہیں بلکہ مغرب کے ''ترقی یافتہ ترقی پسند معاشرہ'' پر بھی ہے کہ ان کے یہاں گناہ تو کوئی عیب نہیں، لیکن انسان کی ایک فطری ضرورت آج بھی عیب شمار کی جاتی ہے!

۶ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ ۱۸ر مارچ ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

سماجی بگاڑ اور ہماری ذمہ داریاں

انسان کو اللہ تعالیٰ نے صرف کھانے پینے اور دوسری جسمانی ضروریات کو پوری کرنے والا جاندار نہیں بنایا ہے، بلکہ ایک اشرف اور باعزت مخلوق ہونے کے اعتبار سے اس کی فطرت میں کچھ اخلاقی قدریں بھی رکھی ہیں، یہ اخلاقی قدریں ہی اس کی پہچان اور شناخت ہیں، ان کی اخلاقی اوصاف میں ایک عفت وعصمت اور پاکدامنی ہے، جنسی جذبات بھی جسمانی تقاضوں میں سے ہیں، دوسرے جانداروں میں یہ جذبات کسی قانون کے پابند نہیں، وہ صنفِ مخالف سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، لیکن ماں، بیٹی اور بہن کا کوئی امتیاز نہیں، انسان کے اندر جو صنفی جذبات ہیں، ان کو بھی قانونِ فطرت کا پابند رکھا گیا ہے، یہی فطرت اسے نکاح کا پابند کرتی ہے، اسی لئے شروع ہی سے انسانی سماج میں نکاح کا تصور رہا ہے، اور نکاح کے بغیر مرد وعورت کے باہمی تعلقات کو ہر شریف معاشرہ میں ایک ناپاک تعلق سمجھا گیا ہے۔

نکاح کے ذریعہ بھی ہر رشتہ میاں بیوی کے رشتہ میں تبدیل نہیں ہوسکتا، بلکہ کچھ ایسے پاکیزہ رشتے بھی ہیں، جن سے نکاح نہیں کیا جاسکتا، جیسے ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی اور دادی، نانی وغیرہ، قرآن مجید نے ان رشتوں کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، یہ نہ صرف مذاہب کی متفقہ اخلاقی قدریں ہیں، بلکہ خود انسانی فطرت کا حصہ ہیں، مشہور بزرگ ابوادریس خولانی نے نقل کیا ہے کہ جب انسانیت کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سب سے پہلی جو ہدایات فرمائی وہ یہی تھی کہ اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کریں اور صرف حلال طریقہ پر ہی اپنی صنفی ضرورت کو پوری کریں۔ (جامع العلوم والحکم: ۱۶۲)

یہی وجہ ہے کہ جہالت، اخلاقی خوبیوں سے محرومی اور بہت سی دوسری کمزوریوں کے باوجود بھی انسانی سماج میں ان رشتوں کا پاس ولحاظ رہا ہے، یہاں تک جو لوگ خدا اور مذہب کے منکر تھے، ان میں بھی دوایک منحرف اور گمراہ ترین افراد کے علاوہ کسی نے ان رشتوں

کی تقدیس کو پامال کرنے کی بات نہیں کی ، اور نہ اس کا ارتکاب کیا ، انسانی فطرت اور طبعی شرافت کے لئے اس کا تصور بھی گراں بار ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں ، بیٹی ، بہو وغیرہ کے ساتھ جنسی خواہش کو پوری کرے ، ایران میں ایک منحرف فلسفی مزدک گذرا ہے ، جو اس بدترین عمل کو جائز ٹھہراتا تھا ، اور ایران کے آتش پرست گروہ میں اس کے اثرات بہت دنوں تک باقی رہے ، جس کا اندازہ فقہاء کی بعض تصریحات سے ہوتا ہے ، ورنہ دہریہ اور ملحدین نے بھی ایسی خلافِ فطرت بات کی وکالت نہیں کی ، اور اسے روا نہیں ٹھہرایا ۔

موجودہ مغربی معاشرہ جس نے عیش کوشی اور لذت چشی کو مقصدِ زندگی بنالیا ہے ، رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے ، حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے قریب جنسی بے راہ روی اس قدر بڑھ جائے گی اور لذت پرستی کا اتنا غلبہ ہو جائے گا کہ قانونِ فطرت کا طاقتور چوکیدار ، جو ہر انسان کے ساتھ بیٹھا دیا گیا ہے ، وہ بھی ان کی بغاوت کے سامنے عاجز و درماندہ رہ جائے گا ، قانونِ فطرت کے تحت انسان کے صنفی روابط مرد اور عورت کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں ، مرد میں اس بات کی صلاحیت نہیں رکھی گئی ہے کہ وہ دوسرے مرد کی ضرورت کو پوری کر سکے ، اور نہ عورت کو اس بات کا محل بنایا گیا کہ دوسری عورت کے صنفی تقاضوں کو پوری کرے ، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : قیامت کے قریب ہوگا یہی کہ ہم جنسی بھی زندگی گذارنے کا ایک طریقہ بن جائے گی ، مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ زندگی گذاریں گے ، آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

> إن مـن أعلام الساعة و أشراطها أن يكتفي الرجال بالرجال و النساء بالنساء . (مجمع الزوائد : ۷/۳۲۷)
>
> قیامت کی علامتوں اور نشانیوں میں سے یہ ہے کہ مرد پر مرد اور عورت پر عورت اکتفاء کرے گا ۔

یہی مضمون طبرانی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے ، (حوالۂ سابق : ۷/۳۲۱) ، انسانی فطرت یہ ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات لوگوں کی نگاہ سے چھپ کر پورے کئے جائیں ، لیکن حدیثوں سے ثابت ہے کہ قریبِ قیامت میں جانوروں کی طرح برسرِ عام مرد عورت

سے ہم آغوش ہوگا، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں :

والذي نفسي بيده لا تفنى هذه الأمة حتى يقوم الرجل إلى المرأة فيفترشها في الطريق فيكون خيارهم يومئذ من يقول لو و أريتها وراء هذا الحائط . (مجمع الزوائد بحوالہ مسند ابویعلی: ۷/۳۳۱)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، یہ امت ختم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ مرد عورت کی طرف کھڑا ہوگا اور سرِ راہ ہی اس سے ہم بستر ہوگا، اس وقت ان میں سب سے بہتر لوگ وہ ہوں گے، جو اسے کہیں گے: کاش تم اس عورت کو اس دیوار کے پس پردہ ہی لے گئے ہوتے !۔

اس مضمون کی ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے سے بھی مروی ہے۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد: ۷/۳۲۵)

آج فطرت سے بغاوت کی یہ صورتِ حال واقعہ بنتی جارہی ہے، بہت سے مغربی ممالک میں، ہم جنسی کی شادیوں کو جواز عطا کردیا گیا ہے، خود ہندوستان میں ایک منحرف اور آوارہ گروہ اس کے قانونی جواز کا مطالبہ کررہا ہے، اور ملک کی عدالتِ عالیہ میں اس سلسلہ میں مقدمہ زیر دوراں ہے، اسی طرح مغرب سے کھلے عام صنفی تعلقات کی اطلاعات آتی رہتی ہیں، اور ہندوستان جس تیزی سے مغربی تہذیب کے سامنے سپر انداز ہورہا ہے عجب نہیں کہ اس مشرقی اور مذہبی اقدار کے حامل ملک میں بھی اس طرح کے واقعات خدانخواستہ آئندہ پیش آنے لگیں۔

فطرت سے بغاوت ہی کا ایک حصہ محرم رشتہ داروں سے صنفی تعلق بھی ہے، میڈیکل سائنس کی تحقیق کے مطابق قریب ترین اعزہ (جن میں محرماتِ نکاح شامل ہیں) سے جنسی ارتباط نقصان کا باعث ہے، اور اس سے ناقص الخلقت اور ناقص العقل اولاد کی پیدائش کا امکان بہت زیادہ ہے، اس کے علاوہ ان رشتوں کی حرمت کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ بیٹی، بہن، بہو کے ساتھ ایک گھر میں رہن سہن ہوتا ہے، لیکن یہ ہم مکانی اور قربت دلوں میں شکوک وشبہات پیدا نہیں کرتی، اور حرمت کی دیوار بے اعتمادی اور شبہ کو پیدا نہیں ہونے دیتی، اگر ان رشتوں کی

حرمت نہ ہوتو بعض لوگ اور خاص کر وہ لوگ جو طبعی طور پر شک وشبہ میں مبتلا رہیں گے، اوران کی ازدواجی زندگی میں بے اعتمادی اور بے اعتباری کا کانٹا چبھتا رہے گا، ان رشتوں کو حرام قرار دے کر شریعت نے بے عفتی اور بے آبروئی کا تصور ہی ختم کر دیا ہے۔

لیکن افسوس کہ مغربی ممالک میں ان رشتوں کی تقدیس کے پامال کئے جانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور شاید مغربی معاشرہ نے اسے قبول بھی کرلیا ہے، مسلمانوں میں اس طرح کی باتیں ناقابل تصور تھیں اور ہیں، لیکن گذشتہ دنوں شہر حیدرآباد میں یکے بعد دیگرے چار پانچ شرم ناک واقعات مقدس اور قریب ترین رشتوں کی پامالی کے پیش آچکے ہیں اور یہ خبریں اخبار میں شائع ہو چکی ہیں، اللہ تعالیٰ کی ستاری کا نظام یہ ہے کہ عام طور پر جب تک ایک گناہ بار بار نہ کیا جائے وہ منظر عام پر نہیں آتا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح بہت سے واقعات در پردہ پیش آتے رہتے ہیں، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف کسی ایک شہر کا یہ معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ سماجی بگاڑ کا نتیجہ ہے، اور پورے ملک میں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہوں گے، یہ اور بات ہے کہ وہ لوگوں کے علم میں نہ آسکیں، بعض انگریزی اخبارات نے ان واقعات کو اسی طرح نمایاں کر کے پیش کیا ہے کہ گویا اس طرح کے واقعات مسلم سماج ہی میں پیش آتے ہوں، حالاںکہ یہ غلط ہے، لیکن بہرحال ہمیں خود اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی برائیاں معاشرہ میں کیوں جنم لیتی ہیں اور کیوں کر پروان چڑھتی ہیں؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اوران کے سدباب کی سعی کرنی چاہیے، اس سلسلہ میں چند نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں :

☆ ذرائع ابلاغ کی فحاشی سے سماج کو بچانا ضروری ہے، اس وقت ٹی وی، بے حیائی اور بے شرمی کا نقیب وترجمان بنا ہوا ہے، خبروں کے درمیان بھی ایسے حیاباختہ اشتہارات آجاتے ہیں، جنھیں کوئی شریف انسان دیکھنا گوارہ نہیں کرسکتا، ہمیں چاہئے کہ مسلم معاشرہ کو اس فتنہ سے بچائیں۔

☆ اگر ٹی وی امّ الفواحش ہے، تو شراب امّ الخبائث ہے، منشیات کا استعمال بڑھتا

جارہا ہے، اور مختلف طبقہ کے لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نشہ آور اشیاء کا استعمال کررہے ہیں، یہ نشہ برائیوں کی جڑ ہے، اور سب سے زیادہ اس کا اثر اخلاقی کیفیت پر پڑتا ہے، اسی لئے سماج کو اس برائی سے بچانے کے لئے مہم چلانی چاہیے۔

☆ اسلام میں تقسیم کار اس طرح ہے کہ مرد باہر کا کام کرے، اور عورت گھر کے نظام کو سنبھالے، گھر کے نظام میں صرف کھانا پکانا ہی شامل نہیں ہے، بلکہ گھر کی نگرانی بھی شامل ہے، جب ماں گھر پر موجود ہوتی ہے تو بیٹی بہو کی عزت وآبرو کی محافظ بھی ہوتی ہے اور بیمار طبیعتوں کو حد سے تجاوز کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا، اگر عورتیں خود کام کرنے کے لئے باہر نکل جائیں تو خراب طبیعت لوگ اپنے مجرمانہ ذہن کے لئے رکاوٹ نہیں پاتے۔

☆ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کو بڑھایا جائے، مقررین اور مساجد کے ائمہ اور خطباء اپنے خطاب میں اس موضوع پر پوری توجہ دیں، قلم کار حضرات ان مسائل پر قلم اٹھائیں، مشائخ خانقاہوں میں ہونے والے اجتماعات میں سماجی اصلاح کی تلقین کریں، جماعتیں اور تنظیمیں ایک مہم بنا کر گھر گھر سماجی اصلاح کا پیغام پہنچائیں اور جس محلّہ اور آبادی میں اس طرح کا واقعہ پیش آئے، وہاں کے لوگ مظلوم کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور زیادتی کرنے والوں کو اس بات کا احساس دلائیں کہ وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے سماج میں نہایت ہی حقارت اور تذلیل کی نظر سے دیکھے جارہے ہیں، تاکہ پھر انھیں ایسی حیاء سوز حرکت کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان سماج میں ایسی باتوں کا پیش آجانا انتہائی افسوسناک اور تمام مسلمانوں کے لئے لائق شرم ہے، ضرررت ہے کہ ہم خود معروف کی دعوت اور برائی سے روکنے سے متعلق اپنے فریضہ کے بارے میں اپنا احتساب کریں، اور اپنے کردار وعمل کا جائزہ لیں۔

۱۸ر ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ ۲۷ر مئی ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی

قدرت کا نظام یہ ہے کہ جو چیزیں لطیف اور نازک ہوتی ہیں اور لوگوں کے لئے مرکزِ توجہ بنتی ہیں، انھیں مستور و محفوظ حالت میں رکھا جاتا ہے، مٹی اور پتھر کا انبار سطحِ زمین پر موجود رہتا ہے، لیکن سونا اور چاندی اور لوہا اور تانبا سطحِ زمین پر نہیں ملتا ہے، بلکہ سخت جان پتھروں کی تہہ میں ذرّات کی شکل میں چھپا رہتا ہے اور کتنے ہی جتن کے بعد اسے نکالا جاتا ہے، دریا میں سیپ اور گھونگے جہاں تہاں پڑے رہتے ہیں، لیکن موتی سیپ کے غلاف میں مستور رہتا ہے، خود انسان کے جسم کو دیکھئے، ہاتھ پاؤں کھلی ہوئی حالت میں ہیں، لیکن زبان کو ۳۲ دانتوں کے درمیان ڈھانک کر رکھا گیا ہے، دماغ اور قلب کا معاملہ اس سے بھی سوا ہے، کیوں کہ یہ جسم کے بادشاہ اور فرمانروا ہیں، پسلیوں کے لچکدار حصار میں ان کو بٹھایا گیا ہے اور دماغ کے لئے سخت قسم کی ہڈیوں کی کھوپڑی کا محفوظ قلعہ بنایا گیا ہے، یہی قدرت کا نظام ہے۔

دنیا میں بے جان چیزوں کے مقابلہ جاندار چیزیں سب سے زیادہ حفاظت کی محتاج ہوتی ہیں، اور جاندار چیزوں میں بھی انسان کو زیادہ تحفظ مطلوب ہوتا ہے، اسی لئے دوسرے جانوروں کو دیکھئے نہ ان کے ساتھ خاندان کا وجود ہے اور نہ وہ انسانوں کی طرح بلند و بالا محفوظ وقلعہ بند اور خوبصورت بلڈنگیں بنا سکتے ہیں، انسان کے لئے ظاہری تحفظ کا یہ انتظام کیا گیا کہ وہ مضبوط و محفوظ مکانات میں رہائش پذیر ہوتا ہے، اور اسے خاندانی پشت پناہی کی صورت میں معنوی تحفظ کا بھی سروسامان بخشا گیا، جو اس کے جان و مال، عزت وآبرو اور شخصیت کا محافظ ہے۔

بنی نوعِ انسان میں بھی عورتوں کے لئے حفاظت وصیانت کی زیادہ ضرورت ہے، اسی لئے وہ ہمیشہ مردوں کی حفاظت میں ہوتی ہیں، بیٹی ہو تو باپ کی حفاظت میں، بیوی ہو تو شوہر کی حفاظت میں، ماں ہو تو اولاد کی حفاظت میں، بہن ہو تو بھائیوں کی حفاظت میں، اور بحیثیتِ

مجموعی پورے خاندان اور سماج کا تحفظ اسے حاصل ہوتا ہے، اگر کسی کی لڑکی صبح کو گھر سے نکلی، اسے چار بجے تک گھر واپس آنا تھا، اور وہ آٹھ بجے شب تک واپس نہیں آئی، تو ماں باپ کا دل ڈولنے لگتا ہے، پورا گھر بے قرار ہو جاتا ہے، اور اس کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، لیکن لڑکوں کے آنے میں دو تین گھنٹے بھی تاخیر ہو جائے تو اس سے کوئی بے چینی نہیں ہوتی، شکوک وشبہات اور خطرات کے بادل نہیں امنڈتے، یہ فطرت کی پکار ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کی بمقابلہ مرد کے زیادہ حفاظت مطلوب ہے۔

عورت کا زیادہ محتاجِ تحفظ ہونا اس کا کوئی عیب نہیں، بلکہ حقیقت میں اس کا ہنر ہے، اب دیکھئے کہ لوہا، ریتی کا انبار تو آپ اپنے گھر کے سامنے ڈال دیتے ہیں اور سونا اور چاندی کو ہزار پردوں میں چھپا کر گھر، گھر کی الماری اور الماری کے لاکر میں رکھا جاتا ہے، کیا اس سے سونے کی اہمیت کم ہو جاتی ہے؟ ہاتھی اتنا طاقتور ہے، کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے کسی کی مدد کا محتاج نہیں، لیکن انسان تحفظ ونگہداشت کا محتاج ہوتا ہے تو کیا ہاتھی کی اہمیت بڑھ گئی اور انسان کی اہمیت کم ہو گئی؟

اسی بنیاد پر مشرقی ممالک میں عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار میں فرق کیا گیا ہے اور مذاہبِ عالم میں اس فرق کو تسلیم کیا گیا ہے، اسلام نے بھی مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے بجائے عدل کا معاملہ اختیار کیا ہے، مساوات کے معنی ہیں ہر شخص کے ساتھ برابری کا سلوک اور عدل کے معنی ہیں ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری سونپنا اور ذمہ داریوں کی نسبت سے اس کے حقوق متعین کرنا، اسی لئے عورتوں کی بنیادی ذمہ داری امورِ خانہ کی نگہداشت کو قرار دیا گیا، وہ گھر کی خادمہ نہیں بلکہ مالکہ ہیں، رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میں ''راعیة علی بیت زوجها ''لیکن مالکہ گھر کی ہے نہ کہ گھر کی باہر کی، اس لئے اسے بنیادی طور پر اپنے گھر کے انتظام وانصرام کو دیکھنا چاہئے۔

لیکن بعض مواقع ایسے آتے ہیں اور ایسی ضرورت پیش ہوتی ہے، کہ عورتوں کو گھر سے باہر بھی نکلنا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی بعض خواتین محدود پیمانہ پر تجارت

کیا کرتی تھیں، بعض دفعہ غیر معمولی حالات میں فوجیوں کی تیمارداری کا فریضہ بھی عورتوں نے انجام دیا ہے، عہدِ نبوی ﷺ میں تعلیمی اور تربیتی ضرورت کے تحت خواتین مسجد بھی جایا کرتی تھیں، چنانچہ ان مواقع پر احتیاط کی صورتیں اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، انھیں تلقین کی گئی کہ ان کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، پھر صفوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی کہ آگے مرد کھڑے ہوں، درمیان میں بچے اور پیچھے خواتین، انھیں تاکید کی گئی کہ مسجد میں آتے ہوئے اور باہر نکلتے ہوئے تیز خوشبو استعمال نہ کریں، کپڑوں میں بھی خوب ستر کا حکم دیا گیا، اور باہر نکلتے وقت سادہ کپڑے استعمال کرنے کی تلقین کی گئی، خود رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد تھوڑی دیر ٹھہر جاتے، تاکہ مردوں کے نکلنے سے پہلے عورتیں نکل جائیں، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۰۴۰) عورتوں کو اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ ایک شب کا سفر کسی محرم کے بغیر کریں۔ (ابو داؤد ، باب في المرأة الحج بغير محرم)

ان سب کا مقصود عورت کی حفاظت اور اس کی رعایت ہے، چوں کہ یہ بات فطرت کے عین مطابق اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک مسلّمہ حقیقت ہے، اس لئے تمام ہی طبقات میں اس کی رعایت کی جاتی رہی ہے، ہندوستان میں انیسویں صدی میں 'جو برطانوی حکومت کا عہد تھا' لیبر لاء بنا، اس میں خواتین کے لئے رات کی شفٹ میں ملازمت کو ممنوع قرار دیا گیا، اور کچھ عرصہ پہلے تک یہی قانون مروّج تھا، لیکن ماہ دو ماہ پہلے ہماری حکومت نے اس قانون کو تبدیل کر تے ہوئے خواتین کو رات کی شفٹ میں ملازمت کی اجازت دے دی ہے، اسے خواتین کے ساتھ ہمدردی کا نام دیا گیا ہے، لیکن اہلِ حقیقت جانتے ہیں کہ درحقیقت یہ عورتوں کے ساتھ زیادتی ہے اور ان کو رات میں بھی کام کرنے پر مجبور کرنا ہے۔

خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی کئی جہتوں سے نامناسب ہے، سب سے اہم تو اخلاقی پہلو ہے، رات کی ڈیوٹی میں اجنبی مردوں کے ساتھ تنہائی نوبت آتی ہے، آتے اور جاتے ہوئے راستہ کا سناٹا بھی اس کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، اور بیمار ذہن واخلاق کے لوگ رات ہی کے وقت مجبور عورتوں کو اپنا شکار بناتے ہیں، اس لئے یہ ڈیوٹی اس کی عفت وآبرو کے

لئے آزمائش بن جاتی ہے، پھر سماجی اور عمرانی پہلو سے دیکھئے کہ مرد ڈیوٹی کر کے رات کو گھر واپس ہوتے ہیں، بچے اسکولوں میں پڑھ کر سرِ شام واپس ہوتے ہیں عورت کے وجود سے گھر کی رونق اوراس کی زینت ہوتی ہے، وہ شوہر کے لئے سکون کا سامان بنتی ہے، بچوں کو پیار بانٹتی ہیں اوران کی ضروریات کی نگہداشت کرتی ہے، گھر میں بوڑھے لوگ ہوں تو رات کے وقت ان کی دیکھ ریکھ کی ضرورت بڑھ جاتی ہے، اگر عورت ہی گھر میں موجود نہ ہو تو گھر ایسے جسم کی طرح ہے جو قلب سے خالی ہو، وہ ایک ہوٹل یا اہل خاندان کا ''ہاسٹل'' تو کہلا سکتا ہے، گھر کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا، اس سے خاندانی نظام بکھرتا ہے، باہمی محبت میں جو گرم جوشی اور جذباتیت ہونی چاہئے، وہ مفقود ہو جاتی ہے۔

اس ڈیوٹی کا اثر ازدواجی زندگی پر بھی پڑتا ہے، بیوی کی ایک ایسے وقت میں عدمِ موجودگی جب شوہر تھک تھکا کر اپنے گھر آتا ہے، آہستہ آہستہ محبت کی آگ کو سرد کر دے گی، پھر یہ رات کی غیر حاضری شکوک وشبہات کو بھی ابھار سکتی ہے، اوراعتماد کا آبگینہ بھی اس سے چور چور ہو سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ازدواجی زندگی میں جو استحکام اور گرم جوشی مطلوب ہے، وہ کم ہوتی چلی جائے گی، اسی طرح یہ رات کی ڈیوٹی بچوں کو ماں کی ممتا اور شوہر کو بیوی کے پیار سے محروم کر کے رکھ دے گی۔

پھر خود اس عورت کے حالات کو دیکھئے، اوّل تو ماں بننے کے بعد عورت کے جسمانی قویٰ میں تیزی سے انحطاط پیدا ہو جاتا ہے، اور طرح طرح کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں، پھر رات کا وقت سکون کا اور بھر پور نیند کا ہے، یہ نیند جسم کی تازگی اور توانائی کا بھر پور ذریعہ ہے، جو جسم کے تکان کو اتار کر انسان کو نیا حوصلہ دیتی ہے، غریب عورت کو رات کی یہ نیند بھی میسر نہیں آئی تو اس کی صحت کا کیا حال ہوگا؟ ایک تو اس پر کسبِ معاش کا بوجھ ہی کیا کم امتحان تھا، اب رات کا سکون بھی گیا۔

ویسے تو یہ شبانہ ڈیوٹی ایک اختیاری عمل محسوس ہوتا ہے، لیکن بہت سے حالات میں یہ اختیاری عمل ہونے کے بجائے عورت کے لئے ایک مجبوری ہو جائے گی، بعض مرد افسر جو غلط

اخلاق و کردار کے حامل ہوں، عورت کو رات کی ڈیوٹی پر مجبور کر سکتے ہیں، اور عورت اپنی معاشی مجبوری کے تحت اس حکم کو ماننے پر مجبور ہوگی، اسی طرح بعض حریص شوہر بھی اپنی بیوی کو دوہری ڈیوٹی پر مجبور کر سکتے ہیں؛ تاکہ وہ اس سکہ ڈھالنے والی مشین سے زیادہ پیسے وصول کر سکے، اور اپنی حرص وہوس کے عفریت کو آسودہ کرے۔

غرض کہ خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی کرنا اس کے لئے رحمت نہیں زحمت ہے، راحت نہیں کلفت ہے، اور اس کے مسائل کو حل کرنا نہیں؛ بلکہ اس کی مشکلات کو بڑھانا ہے، اس سے اس کی صحت پر منفی اثر پڑے گا، اس کی عفت وآبرو خطرہ میں رہے گی، ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کی نظر میں شک کے دائرہ میں رہے، ازدواجی زندگی کا سکون واستحکام پامال ہو سکتا ہے، بچے ماں کی محبت سے محروم ہو سکتے ہیں، اور مختلف پہلوؤں سے عورت کا استحصال ہو سکتا ہے، اس لئے اس ترمیم شدہ قانون کو بدلنے اور عورتوں کے حق میں رات کی ڈیوٹی پر پابندی برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، اور سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں قانون بناتے ہوئے اخلاقی پہلو کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور عورت سے اس کا عورت پن نہ چھینا جائے۔

۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ ۳/ جون ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

اتحاد کس طرح؟

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے کہ مسلمانوں کے لئے اتحاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، عالمی اور ملکی سطح پر ان کی محرومیوں اور نامرادیوں کا اصل سبب باہمی افتراق اور انتشار ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اتحاد کس طرح پیدا ہو؟ —— ایسا اتحاد کہ تمام لوگوں کی سوچ ایک ہو جائے، فکر ونظر کا کوئی اختلاف باقی نہیں رہے ممکن نہیں ہے، کیوں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے چہرے مہرے اور رنگ و روپ میں اختلاف رکھا ہے، اسی طرح ان میں مزاج ومذاق کا اختلاف بھی رکھا گیا ہے، اور یہ اختلاف ذوق قدم قدم پر عیاں ہے، ایک لباس ہی کو دیکھئے، کتنی وضع کے لباس بنائے جاتے ہیں، اور ہر وضع کسی نہ کسی کی نگاہ انتخاب کے لئے منظورنظر بن جاتی ہے، پھر کپڑوں کا رنگ، اور بناوٹ کے اعتبار سے ہر ایک کا ذوق جداگانہ ہے، یہی حال مکان کی تعمیر کا، سواریوں کی پسند کا اور انسان کے استعمال میں آنے والی تقریباً تمام ہی چیزوں کا ہے۔

جیسے اشیاء کے انتخاب میں، ذوق ونظر کی بوقلمونی کارفرما ہے، اسی طرح افکار خیالات اور اخذ واستنباط میں بھی انسانی مزاج ومذاق کی نیرنگی جلوہ فرما ہوئی ہے، اس لئے ملی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل میں فکر ونظر کا اختلاف واقع ہونا بالکل فطری ہے، یہ اختلاف کبھی معمولی درجہ کا ہوتا ہے اور کبھی شدید بھی ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر اتحاد کا مطلب یہ ہو کہ تمام لوگ ایک ہی فکر کے حامل ہو جائیں اور ہر مسئلہ میں ایک ہی طریقہ پر سوچنے لگے تو یہ ایسی ہی غیر فطری خواہش ہوگی جیسے کوئی اس بات کا آرزومند ہو کہ دنیا کے تمام لوگ ایک ہی رنگ اور ایک ہی روپ کے بن جائیں اصل میں اتحاد کا راستہ یہی ہے کہ اختلاف کے باوجود اتحاد کو قائم رکھا جائے۔

''اختلاف کے باوجود اتحاد'' کے لئے چند باتیں ضروری ہیں :

دو گروہوں کے درمیان خواہ کتنا بھی اختلاف ہو، لیکن بہت سے اُمور میں اشتراک بھی

پایا جاتا ہے، اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ اختلافی اُمور کے بجائے ان اُمور پر نظر رکھی جائے جو قدرِ مشترک ہیں، مسلمانوں کے درمیان اتنی زیادہ باتیں مشترک ہیں کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں اس کا پچاس فیصد بھی شاید ہی مل سکے، مثلاً ہندو بھائیوں کے یہاں آریہ سماجی اور سناتن فرقوں کے درمیان، عیسائیوں میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس کے درمیان خدا کے تصور کے بارے میں بھی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا ہے سکھ مذہب کے ماننے والوں میں عام سکھ اور اورنرن کاری مشن کے اختلاف کو دیکھئے، لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ خدا کی توحید، اللہ تعالیٰ کی صفات، نبوت و رسالت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت، آخرت، بنیادی فرائض، واجبات اور محرمات وممنوعات کے بابت کوئی اختلاف نہیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے اتحاد و اتفاق کا راستہ بہت آسان ہے، اور وہ اختلافی چیزوں کے بجائے مشترکہ اقدار کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ سکتے ہیں۔

غالباً ہندوستان میں مجلس مشاورت نے مسلمانوں میں پہلی بار یہ سوچ پیدا کی اور بعد کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام نے اس تصور کو اور تقویت پہنچائی، پھر بعض اور تنظیموں کے قیام نے مسلمانوں میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے، کہ وہ مشترک مسائل کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھیں، اس ہم آہنگی اور اشتراک کو مختلف میدانوں میں بڑھانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ جب آدمی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتا ہے، مشترک مسائل پر گفتگو کرتا اور سوچتا ہے، تو فاصلے سمٹتے ہیں، مفاہمت پیدا ہوتی ہے، اور ایک دوسرے کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

غور کیجئے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے، قرآن مجید نے یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت دی کہ ہم قدر مشترک پر ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو جائیں اور وہ یہ ہے کہ ہم سب اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائیں، **تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم أن لا نعبد الا اياه ولا نشرك به شيئا**، (آل عمران:۶۴) جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قدر مشترک کی بنیاد پر اتحاد کی تشکیل ہو سکتی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ خود اُمت مسلمہ اس اُصول پر آپس

میں متحد نہ ہوسکے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ شخصیتوں کے بارے میں لوگوں کی پسند الگ الگ ہوتی ہے، انبیاء پر ایمان لانے کا تو ہر شخص مکلّف ہے، لیکن فقہاء و محدثین اولیاء و صالحین اور مشائخ و سلاطین کے بارے میں ہوسکتا ہے کہ مختلف لوگوں کا ذوق اور ان کا رجحان الگ الگ ہو، ایک شخص کچھ بزرگوں سے عقیدت رکھتا ہے، دوسرے شخص کو کچھ دوسرے بزرگوں سے عقیدت ہو، ایسی صورت میں کم سے کم یہ بات ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنے بزرگوں کے بارے میں کلمۂ خیر کہتے ہوئے دوسروں کی خدمات کا بھی معترف ہو، یا کم از کم ان کے بارے میں بدگوئی اور بدکلامی سے گریز کرے، تاکہ ان کے متبعین کی دل آزاری نہ ہو، بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ جب ابولہب کی بیٹی درہ ایمان لائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خواہ مخواہ ابولہب کو برا بھلا نہ کہا جائے، کہ مناسب نہیں ہے کہ کافر باپ کی وجہ سے مومن بیٹی کو تکلیف پہنچائی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کا بھی اس درجہ پاس ولحاظ رکھا ہے، کیا ہم مسلمانوں کے آباء و اجداد، ان کے مشائخ و بزرگوں اور دین حق کے خدمت گاروں کے بارے میں بھی اس درجہ تہذیب و شائستگی اختیار نہیں کرسکتے؟ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آپ دوسروں کے بزرگوں کو برا بھلا کہیں گے، تو وہ آپ کے بزرگوں کی شان میں منقبت نہیں پڑھیں گے، اس لئے صحیح طریقہ وہی ہے، کہ خود اپنی زبان کی حفاظت کی جائے، قرآن مجید نے اس لئے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے کہ جب تم انھیں برا کہو گے تو تم جس خدا کے پرستار ہو، وہ ان کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے، **ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم**، (الأنعام:۱۰۸) جو اُصول قرآن مجید نے غیر مسلموں کے معبودان باطل کے بارے میں دیا ہے کم سے کم ہم ان لوگوں کے بارے میں جو مسلمانوں کے لئے عقیدت واحترام کا مرکز ہیں، یہی رویہ اختیار کریں، تو بہت سارے اختلافات سے ہم بچ سکتے ہیں۔

تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اختلاف کا سلیقہ سیکھیں اگر کسی نظریہ پر آپ خوش سلیقگی اور خوش کلامی کے ساتھ تنقید کریں، تو فریق مخالف آپ کی بات کو قابل غور بھی سمجھے گا، اور کم سے کم یہ ضرور ہوگا کہ نفرت کا آتش فشاں سلگنے نہ پائے گا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

ادفع بالتی ھی أحسن فإذا الذی بینک و بینه عداوة کأنه ولی حمیم . (حٰمٓ السجدہ:۳۵)

بہتر طریقہ پر رد کرو تو ممکن ہے کہ جس شخص سے تمہاری عداوت ہے،
وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

افسوس کہ ’’دفاع احسن‘‘، جس کو قرآن مجید نے دوسری جگہ ’’ **جدال احسن** ‘‘(النحل:۱۲۵) سے تعبیر کیا ہے، اب اس کی صلاحیت مسلمانوں میں باقی نہیں رہی ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کو دعوت حق دینے کے لئے بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ نرم لب ولہجہ اختیار کریں، ’’ **قولا له قولا لینا** ‘‘ ،(طٰہٰ:۴۴) مقام فکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں، اور فرعون کھلا ہوا کافر بلکہ کافروں کا سرخیل ہے، اس کے باوجود ان پیغمبروں کو نرم خوئی اور نرم گفتاری کا حکم دیا جاتا ہے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اُمت کے باہمی اختلاف میں بھی اس اُصول پر عمل کرنے کو آمادہ نہیں ہیں۔

اختلاف مذہبی ہو یا سیاسی اور تنظیمی و جماعتی ہو یا مسلکی ومشربی ہر جگہ ہماری زبان عدل اور اعتدال کے حدود کو پھاند جاتی ہے، اور جن باتوں کو نرم لب ولہجہ اور سنجیدہ پیرایہ میں کہا جاسکتا ہے، ان کو بھی ہم ایسی تلخی اور تندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس سے نفرت کی دیواریں اور اونچی ہوجاتی ہیں، شاعر حقیقت شناس کلیم عاجز نے خوب کہا ہے :

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

—— یہ سلیقہ بہت ضروری ہے، اور مسلمان جتنی جلد اسے سیکھ لیں گے، اتنا ہی جلد اپنے آپ کو انتشار اور بکھراؤ سے بچا سکیں گے۔

انسان کے سامنے جب کوئی اہم کام نہیں ہوتا تو وہ غیر اہم کام میں اُلجھ جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے جب کوئی مثبت اور تعمیری میدان مہیا نہیں ہوتا تو وہ منفی اور تخریبی کاموں میں لگ جاتا ہے، مسلمانوں سے ایک بہت بڑا فریضہ دعوت دین کا متعلق ہے، کہ وہ برادران وطن تک اللہ کے دین کو پہنچائیں، اور ادیان باطلہ کی ایسی خوبصورتی کے ساتھ تردید کریں جس سے اختلاف ونفرت پیدا ہونے کے بجائے لوگوں میں قبولیت کا جذبہ بیدار ہو، یہ بات ممکن بھی ہے اور جو لوگ تھوڑا بہت اس کام کو کر رہے ہیں، اس کے نتائج بڑے ہی بہتر اور امید افزاء سامنے آرہے ہیں۔

اگر مسلمان اپنے باہمی مسلکی اختلاف میں پہلوتہی سے کام لیں اور اختلاف بڑھانے والی باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے دعوت دین کی طرف متوجہ ہوں، تو ان کو اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کے استعمال کے لئے ایک بہتر میدان مل جائے گا، ان کی قوتیں صحیح سمت میں خرچ ہوں گی، اور اس سے انشاء اللہ اس ملک کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب کروٹ لے سکتا ہے۔

مشکلات اور دشواریاں بھیڑیا اور بکری اور سانپ اور نیولے کو اکٹھا کر دیتے ہیں، مقام افسوس ہے کہ جس اُمت کو اس کے پیغمبر نے آخر آخر تک اتحاد واتفاق کی تلقین کی ہے، اور جس کے درمیان اتفاق واشتراک کے نکات کے مقابلہ اختلافی نکات شاید دو فیصد بھی نہ ہوں، وہ اُمت نقش دیوار کو پڑھنا چھوڑ دے اور بلا امتیاز اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کی ارزانی بھی اسے متحد نہ کر سکے، وہ اپنے دشمنوں کی منصوبہ بندی کی طرف سے غافل ہو جائے اور اپنی صفوں کو متحدہ چٹان کے بجائے بکھرے ہوئے ذرات بنالے، کیا اس سے زیادہ کم نصیب بھی کوئی گروہ ہو سکتا ہے؟

۱ر جولائی ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

نکاح کے نام پر......

بعض عربوں کی شادی اور'' خانہ بربادی'' نے ایک بار پھر امت کو شرمسار کیا، اور انتہائی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ایک عیش کوش اور لذت پرست'' شیخ'' نے ایک ہی دن میں دو نکاح کیا اور دو دلہنوں کے ساتھ بیک شب و بیک وقت شبِ زفاف منائی، یہ اس خدا ناترس ہوس پرست بوڑھے کے لئے تو لذت کوشی کے چند لمحات گذارنے کا سامان ہے، لیکن پوری امت کے لئے ندامت و شرمندگی کا باعث ہے، جب اس طرح کی خبریں ذرائع ابلاغ میں آتی ہیں، تو لوگ اسے ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ اسے پورے سماج کی اصل تصویر سمجھتے ہیں، اور پھر دبے لفظوں میں اسے شرعی قانون کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے، گویا ایک شخص کی خدا ناترسی پوری امت کی رسوائی اور شریعتِ اسلامی کی بدنامی کا سبب بن جاتی ہے، یقیناً یہ نکاح کے نام پر نکاح کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے؛ کیوں کہ نکاح ایک پائیدار اور دائمی رشتہ ہے، نہ کہ رات اور دو رات کا تعلق، رشتۂ نکاح کو قرآن مجید نے ''لباس'' سے تعبیر کیا ہے اور لباس میں میچنگ اور مناسبتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے اور یہ مناسبت سن وسال میں بھی ہوتی ہے، اس کو نظر انداز کردینا نکاح کے مقصد کو مجروح کرنا ہے۔

—— ایسے واقعات یوں ہی پیش نہیں آتے بلکہ اس کے پیچھے مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ان پر غور کرنے اور ان کا تدارک کرنے کی ضرورت ہے!

یہ حقیقت محتاجِ اظہار نہیں کہ اکثر ماں باپ کو یہ بات دل سے گوارا نہیں ہوتی کہ وہ اپنی کلی اور پھول جیسی لڑکی کو اس کے دادا، نانا کی عمر کے شیوخ کے حوالہ کردیں، اور وطن سے دور دراز ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ کردیں، جس کا انجام بھی انھیں معلوم نہ ہو، لیکن ہمارے سماج میں لڑکیوں کی شادی جس قدر دشوار اور گراں بار ہوگئی ہے، اس نے ان کو ایسا کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور کردیا ہے، لین دین کا مطالبہ، گھوڑے جوڑے کی رقم اور جہیز کی ہوس ہی دراصل ان

ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

اسلام میں نکاح دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کا نام ہے، اگر اس کے ساتھ کوئی خرچ طلب چیز ہے تو وہ صرف دو ہے، ایک مہر جو عورت کا شوہر پر واجب ہوتا ہے، دوسرے ولیمہ جو لڑکی کے رخصت ہونے کے بعد اظہار مسرت کے طور پر کیا جاتا ہے، ولیمہ کی دعوت بھی مرد ہی کے ذمہ رکھی گئی، نکاح میں یوں بھی اخراجات کم سے کم رکھے گئے اور لڑکی والوں پر تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں رکھا گیا، اس طرح شریعت نے نکاح کو آسان بنایا، رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ جس نکاح میں جتنے کم اخراجات ہوں وہ نکاح اسی قدر بابرکت ہوگا، اور آج بھی مسلم ممالک میں نکاح کی تقریب نہایت سادہ طریقہ پر انجام دی جاتی ہے، عرب ملکوں میں گو بے جا تکلفات سے کام لیا جاتا ہے، لیکن یہ تکلفات لڑکے کے ذمہ ہوتے ہیں نہ کہ لڑکی والوں کے۔

لڑکی والوں پر نکاح کے اخراجات کا بوجھ برصغیر کی روایت ہے، اور برصغیر میں یہ روایت ہندو سماج کے اثر سے آئی ہے، ہندو مذہب میں چوں کہ عورتوں کے لئے میراث کا تصور نہیں تھا، اس لئے ماں باپ انھیں رخصت کرتے ہوئے ڈھیر سارے اسباب دے دیا کرتے تھے، پھر انھیں میراث میں حصہ نہیں ملتا تھا، شریعتِ اسلامی میں نکاح کے بعد بھی عورت کا تعلق اپنے خاندان سے باقی رہتا ہے، اسی لئے اس کا والدین کے ترکہ میں بھی حق ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ بیوہ ہو جائے، یا مطلّقہ ہو جائے تو اس کی دوسری ذمہ داریاں بھی خاندان سے متعلق ہوتی ہیں، مگر افسوس کہ مسلمانوں نے بھی ہندو بھائیوں کی اس سماجی رسم کو قبول کر لیا، چنانچہ گھوڑے جوڑے کے نام پر رقموں کا مطالبہ ہوتا ہے اور بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں، جہیز کے نام پر تمام چھوٹی بڑی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں، اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے، گاڑیاں بھی طلب کی جاتی ہیں، اور میراث جو لڑکیوں کا شرعی حق ہے، اس سے ان کو محروم کر دیا جاتا ہے، رسم ورواج کی اس آگ میں پورا سماج تپ رہا ہے، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہمیں اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس سلسلہ میں قانون سے مدد لینی چاہئے اور

ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس کے خلاف مہم چلانی چاہئے۔

معمر غیر ملکی شہریوں سے شادی کا مسئلہ بہ آسانی روشنی میں آجاتا ہے، اس لئے مرکزِ توجہ بن جاتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال اس وقت سامنے آئے گی جب قحبہ خانوں کا سروے کیا جائے کہ نوجوان اور کم سن لڑکیاں جسم فروشی کے ناپاک پیشہ میں چلی گئی ہیں ، ان میں بہت سی وہ ہیں جن کو جہیز اور لین دین کی لعنت اور اس کے ساتھ غربت نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے، ان کے پاس سوائے اپنے جسم کے اور کوئی چیز نہیں تھی، اس لئے پیٹ بھرنے کے لئے انھوں نے اپنی اسی ''متاعِ گراں قیمت'' کو بیچنا شروع کردیا، یہ صورتِ حال معمر غیر ملکی شہریوں سے شادی کرنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور شرمناک ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی کوششوں اور مختلف دینی جماعتوں وتحریکوں سے تعلق کی وجہ سے ایک رجحان شریعت کے مطابق نکاح کرنے کا بھی پنپ رہا ہے، اس لئے ایسے ادارے بھی ہونے چاہئیں، جو رضا کارانہ طور پر رشتوں کے جوڑنے کا کام کریں، اور جو لوگ مسنون اور شرعی طریقے پر نکاح کرنے کے خواہشمند ہوں، وہ ان اداروں میں اپنا رجسٹریشن کراسکیں اور انھیں مناسبِ حال رشتے مل سکیں۔

ایسے واقعات کا ایک سبب بعض والدین کی حرص وطمع بھی ہے، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ چند ہی ایام میں ایک ہی لڑکی کا نکاح دو دو شیخوں سے کردیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ لالچ اور طمع کا نتیجہ ہے، ایسے والدین، نکاح کرانے والے دلال اور جانتے بوجھتے زیادہ پیسہ لے کر نکاح کرنے والے قاضی قرارِ واقعی سزا کے مستحق ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا زیادہ تر غربت کی وجہ سے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو غریب محلوں میں ایسے تربیتی سنٹرس قائم کرنے چاہئیں جن میں لڑکیاں سلائی، کشیدہ کاری اور اس طرح کے دوسرے ایسے کورس کرسکیں جن کے ذریعہ وہ خود اپنا روزگار حاصل کرسکیں، اسی طرح جو لڑکیاں کچھ تعلیم یافتہ بھی ہوں، ان کے لئے ان کے مناسبِ حال کورس رکھے جائیں، لڑکیاں اگر روزگار کے اعتبار سے خود مکتفی ہوں، تو ان کا اس طرح

استحصال نہیں کیا جاسکتا، یہ بات اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی ترغیب دی کہ عورتیں دھاگے بننے کے شغل کو اختیار کریں، بعض صحابیات خنجر بنایا کرتی تھیں، بعض عطر فروخت کیا کرتی تھی، اور گھر کے معاشی مسائل کے حل میں معاون بنتی تھیں۔

جو لڑکیاں فحاشی کے پیشہ میں چلی جاتی ہیں، ان کے بارے میں بھی اخبارات و جرائد کی رپورٹ ظاہر کرتی ہیں، کہ ان کی غالب ترین اکثریت غربت اور مجبوری کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرتی ہیں، کیوں کہ ان کے پاس ایسا کوئی ہنر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فقر و محتاجی انسان کو بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ ہمارے سماج میں لڑکوں کے لئے روزگار کے وسائل کے بارے میں تو سوچا جاتا ہے، کیوں کہ ان پر پورے خاندان کی ذمہ داری ہوتی ہیں، لڑکیوں کے بارے میں روزگار اور کسبِ معاش کی نسبت سے نہیں سوچا جاتا، لیکن ان حالات کا تقاضا ہے کہ خاص طور پر غریب آبادیوں میں لڑکیوں اور عورتوں کے روزگار کے مواقع پیدا کئے جائیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں مسلم ممالک اور خاص کر عرب ملکوں کو بھی متوجہ کرنا چاہئے، قوموں کو دولت اور عیش و عشرت باقی نہیں رکھتی، بلکہ قومیں تعلیم اور جد جہد کے ذریعہ زندہ رہتی ہیں، عرب اس سبق کو مسلسل بھلائے بیٹھے ہیں، علم و تحقیق میں ان کی پسپائی کی وجہ سے دنیا میں ان کو کوئی مقام نہیں، ان کے پاس پٹرول کی عظیم الشان دولت ہے، لیکن ان کی مثال اس بچہ کی سی ہے جس کے ہاتھ میں کوئی چیز کھیلنے کو دے دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے ملک اسرائیل سے بارہ عرب ممالک مل کر بھی آنکھیں نہیں لڑا سکتے۔

کسی قوم میں جب دولت آجاتی ہے اور جد جہد کا جذبہ موقوف ہو جاتا ہے تو عیش کوشی بڑھ جاتی ہے اور یہی اس کے زوال اور رسوائی کا سامان ہوتی ہے، یہودی اور عیسائی طاقتیں چاہتی ہیں کہ عرب جو اسلام کا مرکز ہیں، جفاکش قوم بننے کے بجائے زیادہ سے زیاد عیش پرست بن جائیں، وہ شہوانیت اور نفسانیت کے ایسے پرستار بنا دیئے جائیں کہ اس راستہ سے ان سے ہر کام لیا جاسکے، چنانچہ جو دولت مند لوگ ہوتے ہیں، وہ مغربی ملکوں کا رخ کرتے ہیں

اور جوان میں سے غریب ہوتے ہیں، وہ ہندوستان، بنگلہ دیش اور فلپائن وغیرہ جیسے علاقوں کا، اورافسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے وہ تو بدنام ہوتے ہی ہیں، اسلام کی رسوائی کا بھی سبب بنتے ہیں، ۶۰، ۷۰ سال کی عمر کے لوگوں کا ۱۵، ۱۶ سال کی لڑکیوں سے نکاح کرنا اور وہ بھی بہ یک وقت دو دو دوشیزاؤں کے ساتھ شب گذارنا عیاشی کے سوا اور کیا ہے؟

عرب ممالک کو چاہئے کہ وہ ایسے قوانین بنائیں جن کی وجہ سے ان ممالک کے باشندے دوسرے ملکوں میں آکر غریب مسلمان لڑکیوں کا استحصال نہیں کریں، نیز خود ان ملکوں میں نکاح کو آسان بنایا جائے اور وہاں لڑکوں پر جو ناقابل برداشت بوجھ ڈالا جاتا ہے، اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے، اس میں ان ملکوں کی بھی بھلائی ہے، سعودی عرب میں پہلے سے ایسے قوانین موجود ہیں، اسی لئے سعودی شہریوں کی جانب سے ایسے واقعات پیش نہیں آتے، اسی طرح جن لوگوں کو نکاح پڑھانے کی سرٹیفکٹ دی جاتی ہے، ان کے لئے بھی قواعد وضوابط ہونے چاہئیں، اور جو لوگ اس طرح کے افعال کے مرتکب ہوں انھیں نہ صرف عہدہ سے معزول کیا جانا چاہئے، بلکہ ان کے خلاف قانونی کاروائی بھی ہونی چاہئے، پولیس کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۱ء میں ایک قاضی صاحب نے چودہ سال کی ایک لڑکی کا نکاح ۳ ماہ میں بغیر طلاق وخلع کے تین شیخوں سے کرادیا، یہ کیسی شرمناک بات ہے، ایسے لوگ اگر نکاح پڑھانے جیسی اہم ذمہ داری پر مامور ہوں، تو ایسے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے۔

مسلمان مذہبی اور سیاسی تنظیموں اور شخصیتوں کو مل جل کر اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور ایسی راہ نکالنی چاہئے کہ سماج میں ان واقعات کا اعادہ نہ ہو، اور اس کے لئے پوری امت کو شرمسار نہ ہونا پڑے!

۱۳/ رجب المرجب ۱۴۲۶ھ ۱۹/ اگست ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

سادگی اپنوں کی اور غیروں کی عیاری بھی دیکھ!

مسلمانوں میں وحدت واشتراک کی بنیادیں اتنی زیادہ ہیں کہ کسی اور قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی، عقیدۂ توحید، رسالت، اور نبوتِ محمدی ﷺ پر ایمان، قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے کا یقین بنیادی فرائض وواجبات اور اوامر و مستحبات، نیز محرمات وممنوعات، یہ سارے امور وہ ہیں جن میں پوری امت متحد ہے، اسلام میں ذات پات، نسب ورنگ اور علاقہ وزبان کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہے؛ اسی لئے دوسری قومیں مسلمانوں کو ایک متحد گروہ خیال کرتی ہیں، ہندوستان میں تو مستقل طور پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں میں بھی ذات پات کے جھگڑے کو ابھارا جائے اور ان کی صفوں میں بکھراؤ اور انتشار پیدا کیا جائے، عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کے اختلاف سے فائدے اٹھانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے، چنانچہ مغربی طاقتوں نے افغانستان میں نسلی اور عراق میں مسلکی اختلاف کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور بکھراؤ پیدا کیا اور اس طرح یہ ممالک اس وقت بالواسطہ طریقہ پر مغربی استعماریت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

دنیا کی دوسری قوموں میں نسلی، مذہبی اور لسانی اختلاف مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں اور رہا کئے ہیں، دنیا کی دو عظیم جنگیں ایسے ملکوں کے درمیان ہوئی ہیں، جو مذہباً عیسائی تھے، محض علاقائی تعصب نے انھیں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار اور آمادۂ جنگ کیا، جس نے لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کی جانیں لے لیں، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے درمیان لسانی بنیادوں پر تعصّبات اور تحفظات کی گہری خلیجیں آج بھی موجود ہیں، برادرانِ وطن میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق وامتیاز ان کے عقیدہ اور ضمیر کا حصہ بنا ہوا ہے، نصف صدی کی کوششوں کے باوجود اس صورتِ حال میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا، لیکن ایسے اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خوف اور ان کی مخالفت نے انھیں متحد کر رکھا ہے، کاش! ہم ان کے اتحاد و

اشتراک سے سبق لے کرامت میں مشترک بنیادوں کو تلاش کرتے اور انھیں اصل بنا کر ایک ’’بنیان مرصوص‘‘ تعمیر کرتے۔

ہماری تفرقہ انگیزیاں اور فرقہ بندیاں صرف ایک علاقہ تک محدود نہیں ہیں ، بلکہ ہم عالمی سطح پر بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس وقت دنیا میں ۲۲۸ ممالک ہیں، جن میں آزاد مسلم ممالک کی تعداد ۵۸ ہے، ایشیا اور افریقہ میں تو بہت سے مسلم ممالک ہیں ہی، اب البانیا اور بوسنیا کی صورت میں یورپ میں بھی ہمارے وجود کو محسوس کیا جارہا ہے، اوراس وقت تقریباً تمام ہی ترقی یافتہ ممالک میں اسلام ہی دوسرا بڑا مذہب ہے، لیکن اس کے باوجود عالمی سطح پر ہماری کیا حیثیت ہے؟ ہماری حیثیت ریت کے ایک ڈھیر کی ہے، جسے ہوائیں اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں، اور جنھیں پانی کی ایک حقیر مقدار بھی روند کر گذر جاتی ہے!

عالمی سطح پر مسلم ممالک کی ایک تنظیم ’’او، آئی، سی‘‘ کے نام سے قائم ہے، اس تنظیم کے قیام کو ۳۶ سال کا عرصہ ہوا ہے، یہ ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جو خلافت کا بدل بن سکتا تھا، اور جو پوری اسلامی دنیا کو باہم مربوط کرنے کا فریضہ انجام دے سکتا تھا، ان کی آواز میں ایک طاقت ہوتی، لیکن باہمی آویزشوں اور دل شکستگی کے ساتھ باہمی ملاقاتوں نے ان کو بے وزن کر کے رکھ دیا ہے، افسوس کی بات ہے کہ مورخہ ۷، ۸ دسمبر کو منعقد ہونے والے حالیہ اجلاس میں اس تنظیم نے پوری طرح امریکہ اور یورپ کی زبان میں گفتگو کی ہے، تقریروں اور تجویزوں کا ما حصل یہی ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہتھیار کے طور پر خودکش حملوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اسلام کی روح اور اسلامی شریعت کے مزاج کے مطابق نہیں ہے، اس سے اسلام کا وقار مجروح ہورہا ہے، اسلام کے معاندین کو پروپیگنڈہ اور مغالطہ انگیزی کے لئے ہتھیار فراہم ہورہا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی ناپاک مہم کو تقویت پہنچ رہی ہے، اس لئے مسلمانوں کو صبر، حکمت اور خوش تدبیری کے ساتھ مسئلہ کو حل کرنا چاہئے اور دلائل کے ساتھ ذرائع ابلاغ تک رسائی حاصل کرنی چاہئے ؛ کیوں کہ اس

وقت اصل جنگ ذرائع ابلاغ ہی کی ہے، لیکن مغربی ممالک جب یہ بات کہتے ہیں کہ دہشت گردوں نے اسلام کا اغوا کرلیا ہے تو اس کی گہرائی میں بڑا زہر چھپا ہوا ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک قرآن مجید سے آیاتِ جہاد نکال دینی چاہئیں، جن آیات میں یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین کی نفسیات، اسلام کے خلاف ان کا کید و فریب اور مسلمانوں کے تئیں ان کا رویہ اور ان کی سازشوں کا ذکر ہے، انھیں ہٹا دینا چاہئے، قرآن کے بعد حدیث کی باری آئے گی، کیوں کہ حدیث میں تو جہاد کے فضائل و احکام کا باب بہت وسیع ہے، انھیں حذف کر دیا جائے، حضور ﷺ اور صحابہ ؓ کے جہاد کے واقعات ہٹا دیئے جائیں، کفر کی شناعت اور توحید کی فضیلت و اہمیت اور نجات کے لئے اس کی ضرورت کی بابت جو کچھ فرمایا گیا ہے، کہا جائے کہ اس سے شدت پسندی پیدا ہوتی ہے، پھر فقہ کی باری آئے گی، کیوں کہ ہماری کتبِ فقہ میں اس موضوع پر بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، محاربین اور اہل ذمہ سے متعلق احکام کو فضول قرار دیا جائے گا، پھر بات عقیدہ و کلام تک پہنچے گی کہ اللہ کو ایک ماننے اور محمد ﷺ کی رسالت پر یقین کرنے ہی کو مدارِ نجات قرار دینے میں دوسری قوموں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

پھر یہ بات صرف جہاد اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات ہی تک محدود نہیں ہوگی، بلکہ مغرب کی حیاباختہ اور اخلاق بریدہ تہذیب کا جہاں جہاں شریعت اسلامی سے ٹکراؤ ہوگا، ہر جگہ مغرب کی طرف سے مسلمانوں کو نصیحت کی جائے گی کہ آپ اپنی شریعت کو ہماری تہذیب سے ہم آہنگ کیجئے، یہ حدود و قصاص کے احکام! ان سے تو (نعوذ باللہ) وحشت اور انسانیت سوزی کی بو آتی ہے، عورتوں پر عفت و پاکدامنی اور پردۂ و حجاب کا لزوم صنفِ نازک کے ساتھ زیادتی ہے، ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت آزادیٔ نسواں کے خلاف ہے، غیر قانونی تعلق بھلے ہی آپ دسیوں عورتوں سے رکھیں، اس میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ یہ روشن خیالی کا ایک حصہ ہے، لیکن قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح باعثِ ننگ و عار ہے، سود سے منع کرنا قدامت پرستی اور رجعت پسندی ہے اور شراب مہذب معاشرہ کے لوازم

میں سے ہے، وغیرہ، وغیرہ، غرض خواہشات کے لئے حکم الٰہی کو پیمانہ بنانے کے بجائے اللہ کے احکام کو انسانی خواہشات وشہوات کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔

گویا جب تک آپ اسلام سے محرومی کو قبول نہ کرلیں اور اتباعِ محمدی ﷺ کا دامن چھوڑنے کو تیار نہ ہوجائیں، اس وقت تک مغربی طاقتیں آپ کو اپنی خوشنودی کا پروانہ نہیں دے سکتیں، قرآن نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہود ونصاریٰ کے مزاج کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ آج بھی بعینہٖ اسی طرح موجود ہے، آپ جو بھی کرلیں؛ لیکن جب تک آپ ان کی ملت کی پیروی نہ کرنے لگیں وہ راضی نہیں ہوسکتے، ''لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَ لَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ''۔

بعض مسلم ممالک میں نصابِ تعلیم سے وہ آیات نکال دی گئی ہیں، جن پر مغربی دنیا کو اعتراض ہے، خارجی دباؤ کے تحت نظامِ تعلیم میں تبدیلیاں لائی جارہی ہیں، سیاسی نظام کو بدلا جارہا ہے، یہ دراصل ملتِ یہود اور ملتِ نصاریٰ کی اتباع کی طرف بڑھتے ہوئے قدم ہیں، آہ اور صد آہ کہ اب مسلم ممالک نے تبدیلی لانے اور مغربی مزاج کے سانچے میں ڈھالنے کی غرض سے فقہ وافتاء کے میدان میں دخیل ہونے کا اعلان کیا ہے، یہ باتیں خوش کن الفاظ کے غلاف میں لپیٹ کر بڑے سلیقہ سے کہی گئی ہیں، لیکن اس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے وہ نہایت ہی خطرناک اور مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہے!

کس نصابِ تعلیم اور کن کتابوں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف ابھارا گیا ہے، یہ محض دینی تعلیم کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے مغربی سازش ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اسلام کی حفاظت اور قرآن مجید کے لفظی ومعنوی تحفظ کے لئے خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی علوم سیاسی اثرات سے آزاد رہے، یہاں تک کہ اگر کوئی محدّث شاہی دربار میں آمد و رفت رکھتا تو لوگ اس کی روایت قبول کرنے سے احتراز کرتے، فقہاء اور اربابِ افتاء نے اپنے فتاویٰ میں حکومت کی کوئی رعایت نہیں کی، بلکہ بہت سی دفعہ حکومتیں ان کے فتاویٰ کی زد میں آتی تھیں، یقیناً بعض حکمرانوں نے مفتی مقرر کئے ہیں، لیکن اوّلاً تو بہت سے اہل عزیمت

اس کے باوجود حکومت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ہندوستان میں تغلقوں کے عہد میں ایک مفتی نے بادشاہ کے روبرو ایک شرعی مسئلہ کے سلسلہ میں ان کی مخالفت کی، لوگوں نے ہزار کہا کہ وہ معافی مانگ لیں، لیکن انھوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی یہاں تک کہ ان کی زبان تالو سے کھینچ لی گئی اور انھیں چھت سے نیچے گرا دیا گیا، لیکن انھوں نے جامِ شہادت کو نوش کرنا تو گوارا کیا، مگر مداہنت پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء ہمیشہ حکومتِ وقت کے معتوب رہے، یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں جو قید میں ہیں، ہر دن سر پر کوڑے برسائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ زہر کا پیالہ پلا کر شہید کیا جاتا ہے، یہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں، جن کی بے لباس پشت پر کوڑوں کی بارش ہوتی ہے اور پورا جسم زخموں کے پھول سے آراستہ ہو جاتا ہے، یہ امام بخاریؒ ہیں، جن پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ کر دی گئی ہے، اور انھیں مسلسل ایک شہر سے دوسرے شہر کی خاک چھاننی پڑتی ہے، یہاں تک کہ اسی حال میں وفات ہوتی ہے، یہ علامہ ابن تیمیہؒ ہیں، جو قید خانہ کو اپنی جنت قرار دیتے ہیں اور یہ علامہ سرخسیؒ ہیں، جو ایک اندھیرے کنویں میں قید ہیں اور وہ ہیں اپنی مایہ ناز کتاب ''المبسوط'' کی تالیف کا فریضہ انجام دیتے ہیں، یہ ساری قربانیاں اسی لئے ہیں کہ دین کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رکھا جائے، اب مغربی ممالک کی شہ پر مسلم ممالک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت کا مفتی ہی فتویٰ دے اور فتویٰ پوری طرح حکومتوں اور بالواسطہ مغربی طاقتوں کے منشاء کو پورا کرتا ہو، تو یہ بھی دراصل بالواسطہ اسلام پر حملہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ عالم اسلام کے قائدین کی ایمانی فراست اور دینی حمیت کہاں گئی؟ تقریر و تحریر میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ معصوم بچوں اور کمزور و نازک تن عورتوں کو بارود کی بھٹی بنا دے اور انھیں جان دینے اور جان دے کر جان لینے پر آمادہ کر دے، بلکہ جو چیز اس پر آمادہ کرتی ہے، وہ ظلم و جور ہے، اس ماں کا تصور کیجئے جس کے سامنے اس کے جوان بیٹے کی لاش تڑپ رہی ہو، اس بوڑھے باپ کا خیال کیجئے جس کے کاندھوں نے اس کے جوان اور بے قصور بیٹے کے جنازہ کا بوجھ اٹھایا ہو، ان یتیم بچوں کو ذہن میں لایئے جن سے باپ کا سایہ

شفقت اور ماں کی ممتا کا آنچل چھین لیا گیا ہو،، ان بے کسوں اور خانماں برباودں کو سوچئے جن کی نگاہوں کے سامنے ان کے گھروں کے ملبہ کا ڈھیر رکھا ہوا ہو، ان مظلوموں کو خاطر میں لائیے جنھیں بے قصور ان کے وطن سے بے وطن کر دیا گیا ہو، ظلم وجور کا یہ برہنہ رقص ہے، جو لہو کو گرماتا ہے، جو خون کو جوش دیتا ہے، جو حوصلہ و ہمت کو جوان کرتا ہے اور جو امنگوں کو مہمیز کرتا ہے، جو کبوتر کے قالب میں باز کا دل رکھ دیتا ہے اور جو نحیف الجثہ بکریوں کو ایسی طاقت دیتا ہے کہ شیر بھی اس کے سامنے شرمسار ہوتا ہے، یہی ظلم و جور دہشت گردی کے پودے کو جنم دیتا ہے اور اسے آبیار کرتا ہے، کیا ہم دنیا سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ دنیا دہشت گردی کے بنیادی اسباب کو ختم کرے؟

قرآن کی تعلیم کبھی بھی حدِ تہذیب سے باہر نہیں جاتی، لیکن تورات میں غیر اسرائیلیوں کے لئے نہایت ہی سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ بچوں اور بوڑھوں کے بھی قتل عام کا حکم دیا گیا ہے، انجیل میں غیر اسرائیلیوں کو کتا قرار دیا گیا ہے، حضرت مسیح کا قول مشہور ہے کہ بیٹوں کی روٹیاں کتوں کو نہیں دے سکتا، ہندو مذہبی کتابوں میں غیر ہندوؤں کو ملیچھ (ناپاک) کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انسانیت میں ایسی طبقاتی تقسیم رَوا رکھی گئی ہے اور اس تقسیم کو آج تک برتا جا رہا ہے جو یقیناً انسانیت اور تہذیب کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے، اسرائیل نے صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتل عام کیا ہے، سرب عیسائیوں نے بوسنیا میں جو مظالم ڈھائے ہیں ان کے سننے سے بھی کلیجہ منہ کو آجاتا ہے، کیا یہ واقعات دہشت گردی کے نہیں ہیں؟ اور کیا ہم مغربی ممالک کو ان حقائق کی طرف متوجہ نہیں کر سکتے؟

لیکن افسوس کہ مغرب ہم پر اپنا ایجنڈا مسلط کرتا ہے، کبھی قدامت پسندی، کبھی رجعت پسندی، کبھی بنیاد پرستی اور کبھی دہشت گردی کا رشتہ مسلمانوں کے ساتھ جوڑتا دیا جاتا ہے اور مسلمان اقدام کرنے کے بجائے ایک مجرم کی طرح اپنی مدافعت میں لگ جاتے ہیں، ہونا تو یہ چاہئے کہ مسلم ممالک اپنی وحدت کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں، اپنی مشترکہ منڈی بنائیں، وسائل اور ٹکنالوجی میں ایک دوسرے کو شریک کریں، غیر سودی بینکنگ کے نظام کو تقویت

پہنچائیں، اپنی خبر رساں ایجنسی تشکیل دیں، ذرائع ابلاغ میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں، اور اپنا معاشی اور دفاعی بلاک بنائیں، لیکن افسوس کہ ہم اپنی سادہ لوحی اور عاقبت نااندیشی سے اس راہ پر آگے بڑھتے جارہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق، صلاحیت کا حصول اور اسلام کی دعوت واشاعت کی مربوط اور عالم گیر کوشش ہی ہمارے لئے سفینۂ نجات ہے، ایک خدا کو راضی کرنا آسان ہے اور ڈھیر سارے انسانوں کو راضی کرنا دشوار، اس لئے ہمیں انسانوں کو راضی کرنے کے بجائے خدا کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اپنی ایمانی فراست کے ذریعہ حقیقی طور پر نفع ونقصان کو سمجھنا اور کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہئے۔

۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ ۱۶/ دسمبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

سایۂ رحمت نہ کہ باعثِ زحمت

مئی کا مہینہ ختم ہونے کے قریب ہے ، اس ماہ کے دوسرے اتوار کو مغرب میں Mother Day (یومِ مادر) کی حیثیت سے منایا جاتا ہے،اس سلسلہ کا آغاز تو امریکہ سے ہوا، لیکن اب یہ تمام ہی مغربی ممالک میں ایک روایت کا درجہ حاصل کر چکا ہے،اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ ماں اپنے خون اور لہو سے بچے کی پرورش کرتی ہے،اس کا پورا وجود ماں کے وجود کا حصہ ہوتا ہے،اس کی محبت اور ممتا آغازِ وجود سے لے کر بچہ کے جوان ہونے تک اس پر سایہ فگن رہتی ہے،اولاد کی عمر جو بھی ہو جائے اور چاہے اس کے سر کے ایک بال سفید ہو جائیں ، لیکن سن و سال اور خد و خال کی تبدیلی کے باوجود ماں کی محبت وشفقت میں کوئی فرق نہیں آتا ، ایسی پیکر محبت و وفا ماں کے لئے کوئی انسان اپنے ہر نفس کو قربان کر دے اور ہر لمحہ اس کی ممتا کے قدموں میں بچھا دے تب بھی اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا،لیکن غریب ماں کے لئے سال بھر میں صرف ایک دن رکھا گیا ہے،تاکہ بچے رسم محبت ادا کرلیں۔

مغربی دنیا میں خاندان کی عمارت زمین بوس ہو چکی ہے اور اس کی ایک ایک اینٹ ایک دوسرے سے بے تعلق ہے، نہ ماں باپ کو بال بچوں کی فکر ہے، نہ خوش عیش زندگی میں والدین کو بال بچوں کی مداخلت پسند ہے، بھائی بھائی کے لئے اجنبی ہے اور بھائی بہن کی مثالی محبت قصہ ٔ پارینہ بن چکی ہے،میاں بیوی بھی بندگانِ غرض ہیں،جس دن ایک دوسرے سے اکتا گئے اسی دن رفاقت کو خیر باد کہا اور زندگی کی طویل مسافت طے کرنے کے لئے نئے رفیق کی تلاش کر لی ، گویا زندگی کا سفر ٹرین اور بس کے سفر کی طرح ہے،جس میں لوگ اترتے چڑھتے رہتے ہیں اور رفقائے سفر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ خاندان کے جلو میں اپنی

زندگی گزارے، خاندانی نظام کے بکھر جانے کا نقصان ہر طبقہ کو پہنچتا ہے، مگر خاص طور پر بوڑھے ماں باپ اور سن رسیدہ خواتین کے لئے یہ سب سے بڑی آزمائش ہوجاتی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی ممالک میں سن رسیدہ حضرات کے لئے خصوصی ہاسٹل بنایا گیا ہے، تاکہ بوڑھے اور بے سہارا لوگ اس میں مقیم ہوجائیں اور ان کی رہائش اور غذا کا انتظام ہوجائے، گویا یہ ایک انسانی اصطبل ہے، جس میں چارہ پانی کا نظم کر دیا جاتا ہے اور بوڑھے لوگ عزیزوں کو دیکھنے کے لئے ترستے رہتے ہیں، ان حالات میں ان کی دلداری اور رشتہ کے احساس کو باقی رکھنے کے لئے مغرب نے پیرنٹس ڈے ''یوم سر پرستان'' (Parents Day) اور مدر ڈے کا سلسلہ شروع کیا، جس دن بچے اپنے ماں باپ سے ملاقات کرتے ہیں، گلدستۂ محبت پیش کرتے ہیں اور تحائف ان کی نذر کرتے ہیں، ابھی ان پھولوں کی خوشبوں ختم بھی نہیں ہوتی کہ بچے اپنی منزلوں کو واپس آجاتے ہیں اور ماں باپ کا آبگینہ دل چور چور ہوکر رہ جاتا ہے، مگر کوئی ان کی صدائے عاجزانہ سننے والا نہیں رہتا۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان خاندان کا حصہ ہے، وہ دادھیال، نانیہال اور سسرال کی مختلف شاخوں سے بندھا ہوا ہے، خاندان میں کچھ بزرگ اور بڑے ہیں، کچھ اس کے عزیز اور قریب ہیں، کچھ اس کے ہمدرد لوگ ہیں، یہ خاندانی نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی رحمت ہے، اسی لئے قرآن مجید نے اس کا بطور احسان کے ذکر کیا ہے۔

ان رشتوں کی نسبت سے انسان کے کچھ حقوق ہیں اور کچھ فرائض، ان حقوق وفرائض میں تجارت کا تصور نہیں ہے، یعنی جیسے خریدار اور تاجر اور مزدور اور آجر کے درمیان اُجرت کا تصور ہوتا ہے اور اس سے مادی فوائد وابستہ ہوتے ہیں کہ آدمی کچھ حاصل کرتا ہے اور کچھ کھوتا ہے، اہل قرابت سے تعلق اس نوعیت کا نہیں ہے، یہ بے غرض تعلق ہے، جب ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں، تو باپ کی محبت اور ماں کی ممتا بچوں سے خدمت کراتی ہے، نہ کہ آئندہ نفع کی اُمید، اسی طرح ماں باپ کی خدمت، بھائیوں بہنوں کے ساتھ حسن سلوک، اہل قرابت کی مدد، رشتہ داروں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ اک بے غرض عمل ہے، اس میں مادی نفع کی

نیت نہ ہونی چاہئے ، بلکہ اسے آخرت کے حساب میں محفوظ رکرنا چاہئے ، مادیت پرستی اور نفع طلبی کے جذبہ نے اس بے غرضی کو مجروح اور سچی محبت کو شرمسار کر دیا ہے اور یہی چیز ہے جو انسان کے دل میں بوڑھے ماں باپ کی وقعت اور جذبۂ خدمت کو کم کر کے رکھ دیتی ہے ، کیوں کہ آئندہ ان سے کسی مادی نفع کی اُمید نہیں ہوتی ۔

اسلام بے غرض اور پاکیزہ محبت کا سبق دیتا ہے، اسی لئے جس سے جتنی نفع کی اُمید کم ہوتی ہے اور جو جتنا زیادہ محتاج اور حاجت مند ہوجاتا ہے اسی قدر اس کی خدمت کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، اس پس منظر میں شریعت نے سب سے زیادہ ماں باپ کی اور والدین میں بھی خاص کر ماں کی خدمت پر زور دیا ہے۔

انسان کے وجود میں آنے اور اس کی پرورش و پرداخت میں ماں کیسی کیسی مشقتوں سے گزرتی ہے اور تکلیف کے کیسے کیسے بوجھ خود اُٹھا کر بچوں کو راحت پہنچاتی اور سبک بار رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''ہم نے انسان کو اس لئے والدین کے بارے میں بھلائی کی تاکید کی ہے کہ اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اسے اپنے پیٹ میں رکھا ہے، مشقت کے ساتھ اسے جنا ہے اور پھر اسے دودھ پلانے کی زحمت بھی اُٹھائی ہے'' **حملته امه کرها وضعته کرها وحمله وفصاله ثلاثون شهراً** (احقاف:۱۵)، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ماں کی مشقتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے حقوق کی طرف توجہ دلایا ہے کہ ''یہ ماں ہی ہے جس نے کمزوری پر کمزوری اور تکلیف پر تکلیف برداشت کر کے اپنے پیٹ میں اس کا بوجھ اٹھایا ہے''، ''**حملته امه وهنا علی وهن**'' ۔ (لقمان:۱۴)

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے'' (الجامع الصغیر:۶۳۴۲) ایک صاحب خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا: اللہ کے رسول ﷺ ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں، اس نے دوبارہ پوچھا: پھر؟ ارشاد ہوا: تمہاری ماں، اس نے عرض کیا: اس کے بعد کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں، چوتھی بار سوال کرنے پر آپ

ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا باپ (بخاری، کتاب الادب: ۵۸۷۱)، قرآن نے جہاں اللہ تعالیٰ کی توحیداوراس کی عبادت کا ذکر کیا، وہیں اس کے ساتھ ساتھ والدین سے حسن سلوک کا بھی ذکر فرمایا،'' لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا ''(البقرۃ:۸۳)اوررسول اللہ ﷺ نے گناہوں میں جہاں شرک کا ذکر فرمایا وہیں والدین کی نافرمانی کا بھی ذکر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد سب سے اہم ماں باپ کے حقوق ہیں۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت اور ان کی رضا وخوشنودی آڑے وقت پر انسانوں کے کام آتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں پچھلی قوموں کی ایک بڑی مؤثر حکایت نقل فرمائی ہے، تین راہ رو اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے کہ اچانک تیز آندھی اور موسلا دھار بارش نے انھیں آ پکڑا، انھیں پہاڑ کا ایک غار نظر آیا، تینوں نے اس غار کی پناہ لی، اتنے میں چٹان کھسکی اور غار کا منہ بند ہوگیا، اب بے کسی اور بے بسی کا عالم ہے، موت کا مہیب چہرہ سامنے ہے، خدا کے سوائی کوئی نہیں جس کے ساتھ پھیلایا جاسکے، تینوں نے طے کیا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے کیا ہوگا، اس کے حوالہ دے کر اللہ التجا کریں کہ وہ اس مصیبت سے کو ان سے دور کردے، چنانچہ سب سے پہلے ایک شخص نے ہاتھ اٹھایا اور بارگاہِ خداوندی میں عرض گزار ہوا: بارِالٰہا! آپ واقف ہیں کہ میرے ماں باپ بوڑھے اور ضعیف تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں، میں بکریاں چرایا کرتا تھا، اس سے گھر کی گزر اوقات ہوتی تھی، میں جب بکریاں لے کر آتا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کو پلاتا، پھر بچوں کو ایک دن میں تاخیر سے پہنچا، والدین کی آنکھ لگ گئی تھی، میں نے دودھ دوہا اور پیالہ میں لے کر والدین کے سرہانے کھڑا ہوگیا، میں نے انھیں اٹھایا نہیں کہ نیند میں خلل ہوگا، یہاں تک کہ رات گزر گئی اور نہ میں نے خود پیا اور نہ روتے ہو بلکتے ہوئے بچوں کو پلایا کہ والدین سے پہلے بچوں کو پلانا مجھے گوارا نہ تھا، اگر میں نے یہ کام آپ کی کی خوشنودی کے لئے کیا تھا تو اس مصیبت کے وقت میں ہماری مدد فرمایئے اور چٹان کو ہٹادیجئے، یہ کہنا تھا کہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی، اسی طرح اور دو اشخاص نے بھی اپنے بعض

نیکیوں کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی، یہاں تک کہ غار کا منہ کھل گیا اور اس مصیبت سے انھیں نجات ملی (بخاری: ۵۹۷۴)، اس سے معلوم کہ ماں باپ کی خدمت، ان کے حقوق کی ادائیگی برے وقتوں میں کام آتی ہے اور دشواریوں کے وقت سہارا دیتی ہے۔

آپ ﷺ نے اس شخص کو محروم قرار دیا جس نے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہیں ہوسکا (مسلم: ۶۵۱۰)، کیوں کہ ماں باپ کو راضی رکھنا، ان کی بے پناہ شفقت و محبت کی وجہ سے آسان ہے اور یہی خوشنودی انسان کے جنت میں داخل ہونے کا سامان ہے۔

مغربی تہذیب جس مادیت پرستی اور خود غرضی کا پیغام مشرق کو پہنچا رہی ہے، اس نے سارے سماج میں ماں باپ کی قدر و قیمت کو کم کر دیا ہے، نوجوان اپنے والدین اور بزرگوں کے مشوروں کو اذکار رفتہ چیز سمجھتے ہیں، بچے چاہتے ہیں کہ والدین اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد و املاک سے دست بردار ہو جائیں اور بچوں کے حوالے کر دیں، اگر والدین بوڑھے اور مریض ہوں تو ہونا تو یہ چاہئے کہ اولاد میں سے ہر ایک چاہے کہ اسے والدین کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور وہ اس سعادت سے بہرور ہو، لیکن صورتِ حال اس کے برعکس ہے، بچوں میں اس بات پر اختلاف رونما ہو جاتا ہے کہ والدین کی اسے زیادہ خدمت کرنی پڑ رہی ہے، باپ کا ایک رعب ہوتا ہے، اس کے دوستوں اور متعلقین کا ایک حلقہ ہوتا ہے، اس لئے بچے ایک حد تک دباؤ محسوس کرتے ہیں، لیکن اگر والد گزر چکے ہوں تو ماں کی زندگی خدا ناترس اولاد کے درمیان بہت ہی قابل رحم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ شاید گھر کی نوکرانی بھی اسے گوارا نہیں کرسکتی ہو، گھر کا اقتدار بہو کے اختیار میں آجاتا ہے اور بہو اپنی معذور، بوڑھی اور بے کس ساس کے ساتھ وہ رویہ اختیار کرتی ہے جو ایک سفاک حکمراں مجبور و مقہور رعایا کے ساتھ کرتا ہے اور لڑکے خاموش تماشائی بن کر اس زیادتی کو دیکھتے ہیں اور اگر خود اس میں شریک نہیں ہوتے تو جرأت کے ساتھ اس پر روک لگانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

جس ماں نے گوشت کے اسی لوتھڑے کو نو ماہ سے زیادہ عرصہ اپنے پیٹ میں پالا ہے اور اس کی راحت و سلامتی کے لئے کروٹ کروٹ مشقت اٹھائی ہے، جس نے ناقابل برداشت تکلیف اٹھا کر اور جان کو خطرہ میں ڈال کر اس کو جنم دیا ہے، جس نے خون کی بوندوں کو اپنے سینے میں جمع کر کے صاف وشفاف دودھ کے گھونٹ پلائے ہیں، بچے کی ایک چیخ جس کی کروٹوں کو بے سکون کر دیتی ہے، بچے کی نامعقول ضد کے سامنے سرخمیدہ ہو جایا کرتی تھی، جس کو اولاد کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف خود اپنی تکلیف سے زیادہ تڑپاتی ہے اور بے قرار کر دیتی تھی اور بچوں کی معمولی سی آہ بھی جس کے قرار کو چھیننے کے لئے کافی تھی، اس ماں کو اس کے بڑھاپے میں ایک بوجھ سمجھ لیا جائے اور اسے گھر کی ملکہ سمجھنے کے بجائے مملوکہ اور حاکم کے بجائے محکوم بنا دیا جائے، یہ کتنا بڑا ظلم ہے؟ کاش! نوجوان اس حقیقت کو سمجھیں، ماں محبت کا پیکر ہے، وہ دُعاء کی قبولیت کا ذریعہ ہے، وہ شفقت و ممتا کی تصویر ہے اور اس کا وجود انسان کے لئے سایۂ رحمت ہے نہ کہ باعثِ زحمت!!

۲۶؍ مئی ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ظالم کی مخالفت

اگر قرآن و حدیث کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی روح کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے بعد عدل و انصاف سے زیادہ کوئی چیز اسلام کی نظر میں محبوب نہیں ، اور کفر کے بعد ظلم سے زیادہ کوئی عمل اس کی نگاہ میں مذموم اور ناپسندیدہ نہیں، چوں کہ دنیا دارالامتحان ہے،اس لئے اس دنیا کی حد تک کفر و شرک کو تو گوارا کیا جاسکتا ہے اور کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن ظلم ناقابل برداشت عمل ہے اور یہ کسی طور روا نہیں ، نہ مسلمانوں پر اور نہ غیر مسلموں پر ، نہ فرمانبرداروں پر اور نہ نافرمانوں پر؛ چنانچہ قرآن مجید میں ۱۸۵ مواقع پر ظلم کی براہ راست یا بالواسطہ طور پر مذمت کی گئی ہے اور بار بار فرمایا گیا ہے کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ، ظالموں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے وعدۂ انعام کو نہیں پاسکتے ،**لا ینال عھدی الظالمین** ،(بقرہ:۱۲۴) جو لوگ ظلم پر کمر بستہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کی ہدایت سے محروم رہتے ہیں،**واللہ لایھدی القوم الظالمین**،(بقرہ:۲۵۸) ظالموں کے لئے مآل کارنا کامی ہی مقدر ہے،**إنه لا یفلح الظالمون** ،(انعام:۲۱) ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی رہتی ہے،**لعنة اللہ علی الظالمین**۔(اعراف:۴۴)

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہے، ان پر نزول عذاب کا باعث صرف کفر و شرک اور ایمان سے انکار نہیں تھا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ظلم و جور کا حد سے بڑھ جانا ان پر عذاب خداوندی کا باعث بنتا تھا، قوم نوح کا حال یہ تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے رفقاء پر پتھر برسایا کرتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود اور اس کی رعایا نے زندہ نذرِ آتش کرنے کی کوشش کی، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم خلاف فطرت فسق و فجور میں مبتلا تھی جو انسانی سماج کے لئے ایک بہت بڑا ظلم ہے، یہاں تک کہ وہ

اس سے نو وارد مہمانوں تک کو نہیں بخشتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پیمانہ میں ظلم کا ارتکاب کرتی تھی اور اس نے لین دین کے لئے الگ الگ پیمانے مقرر کئے ہوئے تھے، فرعون نے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار ہی نہیں کیا؛ بلکہ اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ بدترین قسم کا ظلم روا رکھا، یہاں تک کہ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا، پس قوموں کی ظالمانہ روش اور جفا انگیز حرکتوں کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آیا کیا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں پر عذاب کے پس منظر میں ان کی ظالمانہ روش کا ذکر فرمایا ہے۔ (دیکھئے، بقرہ: ۵۹، نساء: ۱۵۳، انعام: ۹۳، ہود: ۳۷، ۴۴، ۸۳ وغیرہ)

اسلام نے مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی مزاحمت کا حکم دیا ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سے ایک مظلوموں کی مدد کرنا ہے، (بخاری: ۲۴۴۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی اُمت کے لئے عرفات میں مغفرت کی دُعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ان کی مغفرت کی سوائے ظالم کے (ابن ماجہ: ۳۰۱۳) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب اس کی پکڑ ہوتی ہے تو پھر اسے نجات نہیں ملتی، (بخاری: ۴۶۸۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد امراء ہوں گے، جو ان کے پاس آمد و رفت رکھے، ان کے جھوٹ کی بھی تصدیق کرے اور ان کے ظلم میں مددگار ہو، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور وہ حوض کوثر پر میری عنایت حاصل نہیں کر سکے گا اور جو ان کے پاس آنا جانا نہیں کرے، ان کے ظلم میں معاون نہ ہو، وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور حوض کوثر پر میری اس سے ملاقات ہوگی، (ترمذی: ۲۲۵۹) حضرت اوس بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کے ساتھ اس کو تقویت پہنچانے کے لئے چلے حالاں کہ اس کو اس کا ظالم ہونا معلوم ہو، وہ دائرۂ اسلام سے باہر نکل گیا۔ (مشکوٰۃ شریف: ۴۳۶، باب الأمر بالمعروف)

اس پر حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے

جوشخص کسی برائی کو دیکھے اسے چاہئے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور عزم رکھے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ قدرت دیں گے وہ اس برائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے، وذلک أضعف الایمان ، (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۷)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بزور قوت ظلم کو روکنے سے عاجز ہو تو کم از کم یہ بات ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس کی مذمت کرے اور اس پر اپنی ناراضگی و ناخوشی کا اظہار کرے، آپ ﷺ نے اس کو سب سے افضل جہاد قرار دیا ہے کہ ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی بات کہی جائے ، أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر ۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۴۴)

ظلم کے خلاف مقاومت اور اس کو روکنے کی کوشش کو رسول اللہ ﷺ نے ایک موقعہ پر بڑے خوبصورت طریقہ پر بیان فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم'' ایک صاحب نے عرض کیا: اللہ کے رسول! مظلوم کی تو ہم مدد کریں گے؛ لیکن ظالم کی مدد کس طور کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ظالم کی مدد یہ ہے کہ ظلم کرنے سے اس کا ہاتھ تھام لو'' تأخذ فوق يديه ، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۴۴) ایک اور موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب لوگ کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ تھامیں تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب انھیں اپنی لپیٹ میں لے لے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۰۵۷) پس جیسے ظلم کا ارتکاب ایک بڑا گناہ ہے اسی طرح ظالم کی مدد کرنا، اس کی تقویت کا باعث بننا اور ظلم پر خاموشی اختیار کرنا بھی کچھ کم بڑا جرم نہیں۔

یوں تو اسلام اور کفر کی آویزش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؛ لیکن اس وقت امریکہ کے صدر جارج بش یہودیوں کے زیر اثر ظلم و جور کا جو برہنہ رقص کر رہے ہیں اور جس بے شرمی کے ساتھ آزادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر انسانی حقوق کو روند رہے ہیں، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اس نے ہٹلر اور مسولینی کے ظلم و جور اور انسانیت سوزی کو بھی شرمندہ کر دیا ہے اور مسلم ممالک اس کا خاص نشانہ ہیں، افغانستان کی ایک جائز اور مستحکم حکومت کو بلا دلیل ختم

کردیا گیا، عراق پر محض جھوٹ اور دھوکہ کے ذریعہ تسلط قائم کیا گیا، فلسطین کے مظلوم اور بے کس مسلمانوں کو آئے دن جور وستم کا نشانہ بنایا جارہا ہے، اسرائیل کے نیوکلیر پروگرام پر آنکھیں بند رکھی گئی ہیں اور ایران کو پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے حصول سے روکنے کی کوشش کی جارہی ہے، سوڈان اور انڈونیشیا میں عیسائی اقلیت کی مدد کے نام پر مداخلت کا سلسلہ جاری ہے اور عالم اسلام کے علاوہ اقتصادی اعتبار سے تمام ہی مشرقی اور ایشیائی ممالک کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کی سعی کی جارہی ہے، اور خود سعودی عرب اس وقت اس کے مذموم عزائم کے نشانہ پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کی مثال ایک جسم کے اعضاء کی ہے جیسے تلوے میں کوئی کانٹا چبھتا ہے اور آنکھیں اس کے لئے بے سکون ہوجاتی ہیں، اسی طرح دنیا میں کہیں کوئی مسلمان تکلیف میں مبتلا ہو تو دوسرے مسلمان کو اپنے سینہ میں اس کا درد محسوس کرنا چاہئے، اسلامی اُخوت، دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے خلاف یہ بات ہے کہ دنیا کے دوسرے خطوں میں مسلمانوں پر ظلم وجور کے پہاڑ توڑے جارہے ہوں اور ہم راحت وسکون کی سانس لیتے رہیں کہ یہ سیلاب بلا ابھی ہمارے گھر نہیں پہنچی ہے!

اس پس منظر میں ہمارا مذہبی فریضہ ہے ہم اپنے ملک میں بش کے حالیہ دورہ کی مخالفت کریں، یہ صحیح ہے کہ ہماری یہ مخالفت شاید اس ظالم کے دورہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہو؛ لیکن اس طرح ہم اپنا ایک مذہبی فریضہ ادا کرسکیں گے، حب الوطنی کے تقاضہ کی تکمیل ہوگی اور اس طرح کم سے کم ہمارا شمار ظالموں کے ناصرین ومعاونین میں تو نہیں ہوگا۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری اظہار ناراضگی شریعت کی حدود میں ہو، پراُمن طریقہ پر ہو، برداران وطن کو ہم اپنے ساتھ لے کر چلیں، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے سے بچیں کہ یہ پوری قوم کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے، ہم یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیں کہ حکومت کے عمل کے لئے پوری عوام کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اس لئے کہ حکومتیں بہت سارے کام عوام کی منشا کے خلاف بھی کرتی ہیں، خود جنگ عراق کے مسئلہ میں امریکی عوام کی غالب اکثریت صدر بش

کے رویہ کے مخالف ہے؛ اس لئے غیر متعلق لوگوں کو ہمارے احتجاج سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے، ہماری لڑائی امریکی حکومت اور اس کی ظالمانہ پالیسی سے ہے اور ہمارا اختلاف حکومت ہند کے اس رویہ سے ہے کہ اس نے ایسے ظالم و جابر شخص کو ہندوستان جیسے ملک میں مدعو کیا ہے، جس ملک کی روایت عدل و انصاف، مظلوموں کی مدد اور سامراجی قوتوں سے مزاحمت کی رہی ہے۔

ہم خطوط، ای میل، ٹیلی گرام اور اظہار رنج کے علامتی طریقوں کے ذریعہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر سکتے ہیں اور دنیا کے سامنے اس ظالم کی بے توقیری کا مظاہرہ کر کے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتے ہیں؛ اس کے لئے ہمیں معتدل رویہ اختیار کرنا چاہئے، نہ یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے جور و ظلم کو دیکھتے رہیں اور ہماری زبانیں گنگ رہیں اور نہ یہ درست ہے کہ ہم احتجاج اور اظہار مذمت میں عدل و انصاف کے حدود سے بھی تجاوز کر جائیں !!

۳ / مارچ ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ایڈس — سدِ باب کی حقیقی تدبیریں

چند ہی دنوں پہلے یکم دسمبر کی تاریخ گذری ہے، اس تاریخ کو پوری دنیا میں یوم ایڈس کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، تاکہ لوگوں میں اس مہلک بیماری کے خلاف رائے عامہ بیدار کی جائے اور احتیاطی شعور کے بارے میں انھیں بتایا جائے، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی بڑے اہتمام سے یہ دن منایا گیا، اخبارات میں حکومت کی طرف سے بڑے بڑے اشتہارات شائع کئے گئے اور مختلف تقریبات منعقد ہوئیں، یہ سلسلہ کئی سالوں سے جاری ہے، لیکن عملاً بیماری کے پھیلاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی، خود حکومت کے اشتہار میں تسلیم کیا گیا ہے کہ "۲۰۰۶ء میں زبردست قومی ردِعمل کے باوجود ایک فیصد سے بھی کم ہی مرض کے زور کو روکا جاسکا" ہندوستان ان ملکوں میں ہے جہاں یہ ہلاکت خیز بیماری ایک سیل بلا خیز کی طرح پھیلتی جارہی ہے، بحیثیتِ مجموعی ہندوستان میں پانچ ہزار ملین سے زائد افراد مختلف مرحلوں میں ایچ، آئی، وی انفکشن سے متاثر ہیں اور اس پانچ ملین سے زیادہ افراد وہ ہیں جو باضابطہ ایڈس میں مبتلا ہوچکے ہیں اور تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہے ہیں، نیز اعداد وشمار کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اس بیماری کے پھیلنے کا جو رجحان موجود ہے، اگر اس کو روکا نہیں جاسکا تو چند سال میں ہمارا ملک جنوبی افریقہ کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ اس موذی بیماری میں مبتلا افراد کا ملک بن جائے گا، اس وقت ہندوستان کی چار ریاستیں مہاراشٹرا، آندھرا پردیش، تمل ناڈو اور کرناٹک اس بیماری کی آماجگاہ بن چکی ہیں اور ملک کے بڑے شہروں میں یہ وبا زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے قدم مضبوط کررہی ہے۔

اس بیماری کی ہلاکت خیزی سے کوئی شخص ناواقف نہیں اور ہر ذی شعور آدمی کو اس

خطرہ کا احساس ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے سد باب اور تحفظ کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے؟ مغرب سے مشرق تک ایک ہی نعرہ لگایا جارہا ہے کہ ''محفوظ سیکس'' کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی غیر قانونی رشتوں کو ختم کرنے کی بجائے محفوظ طریقہ پر انھیں برتا جائے، اس کے لئے کھلے عام کنڈوم کے استعمال کرنے کی ترغیب اور تعلیم گاہوں میں ابتدائی جماعت ہی سے جنسی تعلیم کی دعوت دی جارہی ہے، تا کہ بچے برائی کے ''محفوظ طریقے'' سے واقف ہوجائیں، ایشیائی ممالک بھی کنڈوم کلچر کی گرفت میں آجائیں گے، شرم وحیا اور عفت وعصمت کا تصور ایک فرسودہ خیال قرار پائے گا اور ان ملکوں میں بھی ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جس کے سامنے زندگی کا مقصد ہوس کی بندگی اور لذت پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

دنیا اس بات کی معترف ہے کہ اس مہلک بیماری کی پیدائش اور پھیلاؤ کا بنیادی سبب قانون فطرت سے بغاوت ہے، جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اسی نے اس کے اندر صنفی جذبات بھی رکھے ہیں اور مرد وعورت کو ایک دوسرے کی صنفی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، پھر خدا ہی نے فطرت کا یہ قانون بھی مقرر کیا ہے کہ مرد اپنی اس ضرورت کو عورت کے ذریعہ پوری کرے اور جو عورت کسی مرد کے نکاح میں آئے وہ اسی ایک شخص کی وفادار بن کر زندگی گذارے، مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے شادی ایسی خلافِ فطرت بات ہے کہ علم وشعور سے محروم چوپائے بھی یہ راستہ اختیار نہیں کرتے، لیکن افسوس! کہ آج بعض ترقی یافتہ ملکوں میں اس غیر فطری عمل کو بھی قانونی طور پر جواز عطا کردیا گیا ہے اور ہزاروں لوگ علانیہ ایسی شادیاں کررہے ہیں، حد یہ ہے کہ چرچوں نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، اسی طرح زنا اور بدکاری کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں اور اگر برائی طرفین کی رضامندی سے ہو تو قانون کی نگاہ میں اسے زنا شمار نہیں کیا جاتا، یہ جنسی انحراف کی وہ صورتیں ہیں جن کی حرمت وممانعت پر تمام مذاہب متفق ہیں اور جن کو فلسفۂ اخلاق کے اساتذہ اور

میڈیکل سائنس کے ماہرین بیک زبان ناپسندیدہ اور نقصاندہ قرار دیتے آئے ہیں۔

مذہبی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ جب بھی کسی گروہ نے قانونِ فطرت سے بغاوت کی ہے، وہ قدرت کے انتقام سے بچ نہیں پائی ہے، تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں اور روم وایران میں اخلاقی انارکی کا دور اس کے نتیجہ میں اس تمدن کی بربادی اور اس کے نام ونشان کا مٹ جانا ایسے واقعات ہیں جنھیں پوری تفصیل کے ساتھ خود مغربی مصنفین نے لکھا ہے، مگر جب انسان ہوس کا غلام بن جاتا ہے تو موعظت وعبرت کے سارے دفتر اس کے سامنے بے اثر ہوجاتے ہیں، وہ کان رکھتا ہے، لیکن ایسے کان جو دعوتِ حق کو سن نہیں سکتے، اس کی آنکھیں ہوتی ہیں، لیکن نقوش عبرت کو دیکھنے سے قاصر، ان کی زبان ہوتی ہے، لیکن نفس کے عفریت کے آگے گنگ، خدا کے دیئے ہوئے دل کے لوتھڑے اور دماغ کے مغز سے وہ محروم نہیں ہوتا، لیکن نوائے فطرت کو سمجھنے اور سچائی کو قبول کرنے سے عاجز ہوتا ہے ''**لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم أعين لا يبصرون بها ، ولهم آذان لا يسمعون بها ، اولئک كالانعام بل هم اضل ، أولٰئک هم الغافلون**''۔ (الاعراف:۱۷۹)

اگر انسانیت کو اس مہلک و جان لیوا بیماری سے بچانا ہو تو اسکا راستہ وہی ہے جو خود خالق کائنات نے انسان کے لئے بتایا ہے اور جس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے کہ انسان کو مخصوص طریقہ پر برائی کی ترغیب دینے کے بجائے برائی سے بچنے اور اپنی صنفی ضرورت کو شرعی اور فطری طریقوں تک محدود کرنے کی تعلیم دی جائے، انھیں بتایا جائے کہ عفت و پاکدامنی ہی وہ جوہر ہے جو انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتا ہے، انھیں یہ بات سمجھائی جائے کہ خدا کے حکم پر قائم رہنا صرف آخرت ہی کے لئے مفید نہیں ہے، بلکہ دنیا کی فلاح ونجات بھی اسی سے متعلق ہے، انھیں سمجھایا جائے کہ خدا نے انسان کو ایک باشعور اور نسبتاً بااختیار مخلوق بنایا ہے، تاکہ وہ نفس کا غلام محض نہ ہوجائے، بلکہ وہ خود اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

سماج کو برائی سے بچانے اور ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں:

اول یہ کہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ان کی شادی وقت پر کی جائے، برائی اور بے عفتی کی طرف دعوت دینے والے ماحول کے ساتھ ساتھ جب شادی میں تاخیر ہوجاتی ہے تو یہ چیز نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو غلط راستے کی طرف لے جاتی ہے، ایڈس سے متعلق اعداد وشمار میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ چالیس فیصد سے زیادہ مریض پندرہ سال سے پچپن سال کی عمر کے پائے جاتے ہیں اور یہ بالعموم جنسی بے راہ روی کی وجہ سے اس کا شکار ہوتے ہیں، اس عددی تجزیہ سے ظاہر ہے کہ شادی میں بے جا تاخیر اس مرض کے پھیلاؤ کا ایک اہم سبب ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو جلد شادی کرنے کی ترغیب دی اور باپ پر بچوں کا یہ حق ٹھہرایا کہ جوان ہونے کے بعد مناسب رشتہ تلاش کر کے شادی کردیں، افسوس کہ مسلم معاشرہ میں بھی یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ جب تک لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرلیں اور پھر لڑکے برسر روزگار نہ ہوجائیں، اس وقت تک شادی نہیں کی جائے، یہاں تک کہ بعض دفعہ تو پینتیس چالیس سال کی عمر ہوجاتی ہے، حالاں کہ اٹھارہ بیس سال میں لڑکیوں کی اور زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال میں لڑکوں کی شادی ہوجانی چاہئے، اپنی صاحبزادیوں کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، جب اتنے عرصہ تک آپ نے اپنے بچوں کو ناز ونعمت سے پالا ہے تو کیا چند سال اور لڑکے کے ساتھ بہو اور اس کے بچوں کی پرورش نہیں کرسکتے؟ اگر معاشرہ کو پاک باز اور آبرومند رکھنا ہے تو ہمیں اس سوچ کو بدلنا ہوگا۔

دوسری ضروری بات مخلوط تعلیم کے بجائے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جداگانہ تعلیم کے نظام کو رواج دینا ہے، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا دن کے بڑے حصے میں ایک ہی کلاس روم میں بیٹھنا، ایک دوسرے کو دیکھنا اور باہم گفتگو کرنا عمر کے تقاضوں کے لحاظ سے آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے اور پھر لڑکیوں کے لئے جو یونیفارم متعین کیا جاتا ہے، اس کا فتنہ الگ

ہے، یہ مخلوط ماحول اخلاقی قدروں کے لئے یقیناً سم قاتل ہے اور اسی لئے آئے دن اخبارات میں اغوا، فرار اور بعض حالات میں خودکشی وغیرہ کی خبریں آتی رہتی ہیں، اختلاط کا یہ ماحول تعلیم پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے، اس لئے ہندوستان جیسے مشرقی اقدار کے حامل ملک میں حکومت کو کوشش کرنی چاہئے کہ کم از کم مڈل تعلیم سے اوپر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کا ایک علاحدہ نظم ہو اور مسلمانوں کو تو خاص طور پر اس سمت میں توجہ دینی چاہئے۔

تیسرے حکومت کو مزدوروں سے متعلق حقوق میں اس بات کو شامل کرنا چاہئے کہ آجرین کے لئے قابل رہائش فیملی کوارٹرس یا کرایہ الاؤنس کا نظم کریں، تاکہ بڑے شہروں میں رہنے والا مزدور طبقہ بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر سکے، چنانچہ کم آمدنی والے ان مزدوروں کے یہاں ایڈس کے مریض زیادہ پائے جارہے ہیں، جو طویل عرصہ تک اپنی بیوی سے دور رہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے سرحد پر رہنے والے فوجیوں کو ہر چار ماہ بعد طویل رخصت کا حکم جاری فرمادیا تھا، حالاں کہ وہ ایسا دور تھا جسے ورع وتقویٰ کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے اور جس میں آج کی طرح برائی کے محرکات نہیں پائے جاتے تھے۔

چوتھے شراب بندی کا مسئلہ ہے، شراب برائیوں کی جڑ ہے اور یہ انسان کو اپنے نفع و نقصان کے سلسلے میں بے شعور بنا کر رکھ دیتی ہے، ایڈس کے اعداد وشمار کے رو سے شراب بھی اس بیماری کے پھیلنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور صحتِ انسانی کے لئے شراب کی جو دوسری مضرتیں ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں، اس لئے شراب کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے، ہمارے ملک کے دستور میں ایک اہم حصہ رہنما اُصولوں کا ہے، اس میں شراب بندی کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن حکومت شراب کو روکنا تو درکنار اس کو بڑھاوا دے رہی ہے، کیوں کہ یہ کاروبار اس کی آمدنی میں اضافہ کا نہایت اہم ذریعہ ہے!

اگر برائی کو روکنے کی حقیقی تدبیریں نہ کی جائیں تو صرف تقریروں، سیمیناروں،

سمپوزیموں اور اخباری اشتہارات سے اس مصیبت پر قابو نہیں پایا جاسکتا، اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بے گناہ بھی اس مرض کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس لئے وہ انسانی ہمدردی کے مستحق ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اصل میں یہ خدا کے حکم سے سرتابی اور فطرت سے بغاوت کی سزا ہے، جو انسان کو آخرت سے پہلے زندگی ہی میں ملنا شروع ہوجاتی ہے کہ :

عدل و انصاف فقط حشر پہ موقوف نہیں
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

۸؍دسمبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑